زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

لاہور

منٹو نمبر

۴۹، ۵۰

مرتب

محمد طفیل

فی پرچہ
۴/۸

سالانہ قیمت
۱۸ روپے

ادارہ فروغ اُردو - لاہور
(۱۱- ڈی مال)

ترتیب

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

۱ — بائی بائی، ۷
۲ — مائی جنتے، ۱۰
۳ — جان محمد، ۱۵
۴ — بارش، ۱۹
۵ — اِفشائے راز، ۲۳
۶ — آمنہ، ۲۸
۷ — تصویر، ۳۳
۸ — ملاوٹ، ۳۷
۹ — بس اسٹینڈ، ۴۱
۱۰ — نعیمہ، ۴۵
۱۱ — بدتمیزی، ۵۱
۱۲ — قادرا قصائی، ۵۶
۱۳ — خودکشی، ۶۱
۱۴ — پشاور سے لاہور تک، ۶۶
۱۵ — بجلی پہلوان، ۷۱
۱۶ — ایک زاہدہ ایک فاحشہ، ۷۴
۱۷ — شیدا، ۷۹
۱۸ — بڑھا کھوسٹ، ۸۴
۱۹ — انارکلی، ۸۹
۲۰ — کمیشن، ۹۳

منٹو کی منتخب تخلیقات

۱ — ہتک، ۱۱۶
۲ — موذیل، ۱۳۰
۳ — ممی، ۱۵۳
۴ — بابو گوپی ناتھ، ۱۵۳
۵ — کالی شلوار، ۱۶۳
۶ — ٹوبہ ٹیک سنگھ، ۱۷۲
۷ — اس منجدھار میں، ۱۷۷

۸ — نیا قانون، ۲۰۲
۹ — شہید ساز، ۲۰۹
۱۰ — سیاہ حاشیے، ۱۰۰

منٹو کا فن

۱ —	منٹو کی فنی تکمیل	ممتاز شیریں، ۲۱۷
۲ —	منٹو کا فن	وقار عظیم، ۲۲۲
۳ —	منٹو کا مقام	محمد حسن عسکری، ۲۴۹
۴ —	گنجا فرشتہ	عابد علی عابد، ۲۵۲
۵ —	منٹو	ابواللیث صدیقی، ۲۶۱
۶ —	منٹو کی حقیقت نگاری	عبادت بریلوی، ۲۶۷
۷ —	سعادت حسن منٹو کی یاد میں	ممتاز حسین، ۲۸۹

منٹو کی شخصیت

۱ —	میرا دوست، میرا دشمن	عصمت چغتائی، ۲۹۶
۲ —	منٹو، میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک، ۳۱۱
۳ —	منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط	احمد ندیم قاسمی، ۳۵۹
۴ —	جو کہہ نہ سکا	ہاجرہ مسرور، ۳۳۴
۵ —	وحدل دہشت پسند	ابو سعید قریشی، ۳۳۹
۶ —	منٹو ماموں کی موت	حامد جلال، ۳۴۹
۷ —	منٹو کی موت	غلام عباس، ۳۵۳
۸ —	منٹو کا ایک خط	محمد طفیل، ۳۵۵

شخصیات نمبر کے بارے میں

مولوی عبدالحق	نیاز فتحپوری	عبدالمجید سالک
عرشی رامپوری	رشید احمد صدیقی	مالک رام
احتشام حسین	مسعود حسن رضوی	کرشن چندر
ڈاکٹر سید اعجاز حسین	ایس اے رحمن	خواجہ احمد فاروقی
غلام عباس	آغا اشرف	شاد عارفی
حجاب امتیاز علی	فکر تونسوی	ابن انشا
فارغ بخاری	جیلانی بانو	مختار صدیقی

طلوع

"یار منٹو نمبر نکالو۔"

"جی!"

"میں کہتا ہوں۔ نقوش کا منٹو نمبر نکالو۔"

"آج یہ آپ کیسی باتیں ــــ"

"تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں۔"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا۔"

"میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا۔ کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے۔"

"مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی ــــ"

"اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔"

"اچھا یہ بتائیے اس نمبر میں کیا کیا ہو گا؟"

"اب تک جتنی گالیاں ملی ہیں۔ وہ سب سے پہلے چھپیں گی۔ اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے۔ وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہرحال تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر تمہیں میں مرتب کر دوں گا۔"

"اگر آپ مرتب کر دیں گے۔ تو میں کیا کروں گا؟"

"تم جھک مارنا۔"

"اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کریں۔ اور اسے کتابی صورت میں چھاپ دیں۔"

"میں چاہتا ہوں۔ نقوش کا منٹو نمبر نکلے۔"

"تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے۔"

"قابلیت کو چھوڑئیے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے۔"

"ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے۔"

"اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے۔"

"اچھا تو تم پھر جیسی میری درگت بنانی چاہتے ہو۔ میری زندگی ہی میں بنا ڈالو۔"

اگرچہ یہ واقعہ ایک برس پہلے کا ہے، لیکن میں آج بھی یہ نمبر منٹو کی زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں، اس لئے کہ منٹو کسی اور کے خیال میں مرا ہو تو مرا ہو، میرے نزدیک نہیں مرا۔

محمد طفیل









[illegible] Colonel K L Sharma SC, [illegible]
PARACHUTE REGIMENT

(1)

19 Dec 94

منٹو کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں

(جو ایک دن کے وقفہ سے لکھی گئیں)

بائی بائی

(۱۱ مئی ۵۴ء)

نام اُس کا فاطمہ تھا پر سب اُسے پھاتو کہتے تھے۔ بانہال کے درے کے اس طرف اُس کے باپ کی پن چکی تھی جو بڑا سادہ لوح معمر آدمی تھا۔ دن بھر وہ اس پن چکی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پن چکی لگائی گئی تھی۔ پھاتو کے باپ کو دو تین روپے روزانہ مل جاتے، جو اُس کے لئے کافی تھے۔ پھاتو البتہ اِن کو ناکافی سمجھتی تھی، اِس لئے کہ اُس کو بناؤ سنگھار کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کاج کچھ نہیں کرتی تھی۔ بس کبھی کبھی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اُس کو آٹے سے نفرت تھی، اس لئے کہ وہ اُڑ اُڑ کر اُس کی ناک میں گھس جاتا تھا۔ وہ بہت جھنجھلاتی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں گھومنا شروع کر دیتی، یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوتی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتی۔

اُس کو چناب سے پیار تھا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ دریا عشق کا دریا ہے، جہاں سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا کا عشق مشہور ہُوا۔
بہت خوبصورت تھی۔ اور بڑی مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک پن چکی والے کی بیٹی شاندار لباس تو پہن نہیں سکتی۔ میلی شلوار۔ اوپر پھرن نما کُرتہ — دوپٹہ ندارد۔

نذیر بحیثیت گڑمہ سے لے کر بانہال تک اور بھدرواہ سے کشتواڑ تک خوب گھوما پھرا تھا۔ اُس نے جب پہلی بار پھاتو کو دیکھا تو اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی جب اُس نے دیکھا کہ پھاتو کے کُرتے کے نچلے تین بٹن نہیں ہیں، اور اُس کی جوان چھاتیاں باہر جھانک رہی ہیں۔
نذیر نے اس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی قمیصیں یا کُرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے بٹن غائب ہوتے ہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا یہ دانستہ ہٹا دیئے جاتے ہیں، یا وہاں کے دھوبی ہی ایسے ہیں جو اِن کو اُتار لیتے ہیں۔

نذیر نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے پھاتو کو اپنی تین کم بٹنوں والی قمیص میں دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ حسین تھی۔ ناک نقشہ بہت اچھا تھا۔ جلد میلی ہونے کے باوجود چمکتی تھی۔ اس کا لباس بہت گندہ تھا، مگر نذیر کو ایسا محسوس ہوا کہ یہی اس کی خوبصورتی کو نکھار رہا ہے۔

نذیر وہاں ایک آوارہ گرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے اور ان کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب تین مہینے سے ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔

اس نے کشتواڑ دیکھا، بھدرواہ دیکھا، کد اور بٹوت میں کئی مہینے گزارے، مگر اسے پھاتو ایسا حسن کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

بانہال میں پن چکی کے باہر جب اس نے پھاتو کو تین بٹنوں سے بے نیاز کرتے میں دیکھا تو اس کے جی میں آئی کہ اپنی قمیص کے سارے بٹن علیحدہ کر دے اور اس کی قمیص اور پھاتو کا کرتہ آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔ کچھ اس طرح کہ دونوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔

اس سے ملنا نذیر کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کا باپ دن بھر گندم، مکی اور جوار پیسنے میں مشغول رہتا تھا۔ اور وہ تھی ہنس مکھ۔ ہر آدمی سے کھل کر بات کرنے والی بہت جلد گھل مل جاتی تھی۔ چنانچہ نذیر کو اس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ چند دنوں ہی میں اس نے اس سے راہ و رسم پیدا کر لی۔

یہ راہ و رسم تھوڑی دیر میں محبت میں تبدیل ہو گئی۔ پاس ہی چناب، جسے عشق کا دریا کہتے ہیں۔ اور جس کے پانی سے پھاتو کے باپ کی پن چکی چلتی تھی۔ اس دریا کے کنارے بیٹھ کر نذیر اس کو اپنا دل نکال کر دکھاتا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھاتو سنتی —— اس لئے کہ وہ اس کے جذبات کا مذاق اڑانا چاہتی تھی —— اصل میں وہ تھی ہی ہنسوڑ۔ ساری زندگی وہ کبھی روئی نہ تھی۔ اس کے ماں باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچپن میں کبھی نہیں روئی۔

نذیر اور پھاتو میں محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ نذیر پھاتو کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس نے اپنی روح کا عکس آئینے میں دیکھ لیا ہے۔ اور پھاتو تو اس کی گرویدہ تھی، اس لئے کہ وہ اس کی بڑی خاطر داری کرتا تھا۔ اس کو یہ چیز —— جسے محبت کہتے ہیں، پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ بہت خوش تھی۔

بانہال میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا، اس لئے نذیر کو بٹوت جانا پڑتا تھا۔ وہاں وہ دیر تک ڈاک خانے کے اندر بیٹھا رہتا۔ ڈاک آتی تو اخبار پڑھ کے پن چکی پر چلا آتا۔ قریب قریب چھ میل کا فاصلہ تھا، مگر نذیر اس کا کوئی خیال نہ کرتا۔ یہ سمجھتا کہ چلو ورزش ہی ہو گئی ہے۔

جب وہ پن چکی کے پاس پہنچتا تو پھاتو کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آتی اور دونوں چناب کے پاس پہنچ جاتے اور پتھروں پر بیٹھ جاتے۔

پھاتو اس سے کہتی "نذیر —— آج کی خبریں سناؤ۔"

اس کو خبریں سننے کا خبط تھا۔ نذیر اخبار کھولتا اور اس کو خبریں سنانا شروع کر دیتا۔ ان دنوں فرقہ وارانہ فسادات تھے —— امرتسر سے یہ قصہ شروع ہوا تھا۔ جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کے راکھ کر دیئے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اس کو سناتا۔ وہ سکھوں کو اپنی گنوار زبان میں برا بھلا کہتی۔ نذیر خاموش رہتا۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ نذیر کو تمام واقعات کا علم تھا، مگر جب اس نے پڑھا کہ

...ل اور ماما والوں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا۔ مگر اس نے اپنی اس پریشانی کو پھاتو پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

نذیر کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا۔ اس کا علم پھاتو کے باپ کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک معزز ... میں جائے گی، مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی سیالکوٹ نہ جائے، جہاں کا نذیر رہنے والا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ نذیر اسی کے پاس رہے۔

دولت مند کا بیٹا ہے ۔۔۔ پن چکی کے پاس کافی زمین پڑی ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا مکان بنا لے اور دونوں میاں بیوی آرام سے رہیں ... چاہا۔ ایک جھٹکے سری نگر بھی گئے۔ وہاں ایک دو مہینے رہے، پھر واپس آ گئے۔ کبھی کبھار سیالکوٹ بھی چلے گئے کہ وہ بھی اتنی دور نہیں۔

پھاتو کے باپ سے نذیر نے مفصل گفتگو کی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نذیر اور پھاتو بہت خوش ہوئے۔ اس روز پہلی مرتبہ نذیر نے اس کے ہونٹوں کو چوما اور خود اپنے ہاتھ سے اس کے کرتے میں بٹن لگائے۔

دوسرے دن نذیر نے اپنے والدین کو لکھ دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی ہے جس سے اس کو محبت ہو گئی۔ ایک ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ آدمی روشن خیال تھے، اس لئے وہ مان گئے، حالانکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔

اس کے والد نے جو آخری خط لکھا اس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ نذیر، فاطمہ کا فوٹو بھیجے، تا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو دکھا سکیں۔ اس لئے کہ وہ اس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

لیکن بانہال جیسے دور افتادہ علاقے میں وہ پھاتو کی تصویر کیسے حاصل کرتا۔ اس کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ نہ وہاں کوئی فوٹوگرافر۔ بٹوت اور کد میں بھی [illegible] نہیں تھا۔

اتفاق سے ایک دن سری نگر سے موٹر آئی۔ نذیر سڑک پر کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا دوست رنبیر سنگھ ڈرائیو کر رہا ہے۔ اس نے بلند آواز میں کہا "رنبیر یار ۔۔۔ ٹھہرو۔"

موٹر ٹھہر گئی۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملے۔ نذیر نے دیکھا کہ اس کی موٹر میں کیمرہ پڑا ہے۔ رولی فلیکس۔ نذیر نے اس سے کچھ دیر باتیں کیں، پھر پوچھا "تمہارے کیمرے میں فلم ہے؟"

رنبیر نے ہنس کر کہا "خالی کیمرہ اور خالی بندوق کس کام کی ہوتی ہے ۔۔۔ میرے کیمرے میں سولہ ایکسپوژر موجود ہیں۔"

نذیر نے فوراً پھاتو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست رنبیر سے کہا "یار، اس کے تین چار اچھے پوز لے لو۔ اور تم، میرا خیال ہے، سیالکوٹ جا رہے ہو، وہاں سے ڈیویلپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو دو کاپیاں بٹوت کے ڈاک خانے کی معرفت بھجوا دینا۔"

رنبیر نے بڑے غور اور بڑی دلچسپی سے پھاتو کو دیکھا۔ اس کی موٹر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے۔ تھری ناٹ تھری بندوقیں لئے۔
رنبیر تو تمام فوٹو لینے کے لئے پسند کرتا، یہ مسلح فوجی اس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ نذیر ان کے ہمراہ ہونا چاہتا تھا مگر یہ ڈوگرے اسے روک دیتے۔
کشمیر میں ہلڑ ہو رہا تھا۔ اس کے متعلق نذیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان اس پر قابض ہونا چاہتا ہے، مگر پاکستانی اس کی مدافعت کر رہے ہیں۔
ہوا یہ کہ جب نذیر کا دوست رنبیر اپنی موٹر کے پاس آیا تو اس نے نذیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ پھاتو ڈوگرے سپاہیوں کی گرفت میں تھی۔ انھوں نے اسے موٹر کے اندر ڈالا۔ وہ چیخی چلائی۔ نذیر کو اپنی مدد کے لئے پکارا ۔۔۔ مگر وہ عاجز تھا ۔۔۔ ڈوگرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔

جب موٹر اسٹارٹ ہوئی تو نذیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا "یار، رنبیر یہ کیا ہو رہا ہے؟"

رنبیر سنگھ نے جو کہ موٹر چلا رہا تھا، نذیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر صرف اتنا کہا۔
"ٹا ٹا"

مائی جنتے

(۱۲ مئی ۵۴ء)

مائی جنتے سلیپر گھسیٹتی ہوئی کچھ اس انداز میں اپنے بیٹے چک میں داخل ہوئی تھی کہ سب گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آ پہنچی ہے۔ وہ رہتی اسی گھر میں تھی جو خواجہ کریم بخش مرحوم کا تھا، اپنے پیچھے کافی جائداد۔ ایک بیوہ اور دو جوان بچیاں چھوڑ گیا تھا۔ آدمی پرانی وضع کا تھا۔ جونہی یہ لڑکیاں نو دس برس کی ہوئیں، ان کو گھر کی چار دیواری میں بٹھا دیا اور پہرہ بھی ایسا کہ وہ کھڑکی تک کے پاس کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ مگر جب وہ اللہ کو پیارا ہوا تو ان کو آہستہ آہستہ تھوڑی سی آزادی ہو گئی۔ اب وہ ٹکے چھپ کے ناول بھی پڑھتی تھیں۔ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے پوڈر اور لپ اسٹک بھی لگاتی تھیں۔ ان کے پاس ولایت کی بنی ہوئی انگیا بھی تھیں — معلوم نہیں یہ سب چیزیں کہاں سے مل گئی تھیں۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ ان کی ماں کو جو ابھی تک اپنے خاوند کے صدمے کو بھول نہ سکی تھی ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر قرآن مجید کی تلاوت اور پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی میں مصروف رہتی اور اپنے مرحوم شوہر کی روح کو ثواب پہنچاتی رہتی۔

گھر میں کوئی مرد نوکر نہیں تھا، مرحوم کے باپ کی زندگی میں، نہ مرحوم کے زمانے میں۔ نہ اُن کی پُرانی وضعداری کا ثبوت ہے۔ عام طور پر ایک یا دو ملازمائیں ہوتی تھیں جو باہر سے سودا سلف بھی لائیں اور گھر کا کام بھی کریں۔

دسویں جماعت خود مرحوم نے اپنی بچیوں کو پڑھا کر پاس کرائی تھی۔ کالج کی تعلیم کے وہ یکسر خلاف تھے۔ وہ اُن کی فوراً شادی کر دینا چاہتے تھے، مگر یہ تمنا اُن کے دل ہی میں رہی۔ ایک دن اچانک فالج گرا۔ اس موذی مرض نے اُن کے دل پر اثر کیا اور وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔

باپ کی وفات سے لڑکیاں بہت اُداس رہنے لگیں۔ اُنھوں نے ایک دن ماں سے التجا کی کہ وہ اُن کو کسی کالج میں داخل کر دیں۔ پر جب زیادہ اصرار ہوا اور اُنھوں نے کئی دن کھانا نہ کھایا تو اُس نے مجبوراً اُن کو ایک زنانہ کالج میں داخل کرا دیا۔

مائی جنتے نے وعدہ کیا وہ ہر روز اُن کو صبح کالج چھوڑ آئے گی۔ سارا وقت وہیں رہے گی اور جب کالج بند ہوگا تو اُنہیں اپنے ساتھ لے آیا کرے گی۔

اُس نے اچھی مالکن سے یہ وعدہ کچھ ایسے پُرخلوص انداز میں کیا کہ وحیدہ بانو مرحوم خواجہ کریم بخش کی بیوہ کو یہ بیٹیاں نہیں خود اُس کی جنی ہیں۔

اُس نے بیوہ بیگم کو پردے ہی رکھنے کی حمایت میں اپنے انداز میں مولویوں کی طرح ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کی، لیکن پھر یہ کہا تعلیم بھی ضروری ہے مگر اسلام اِس سے منع نہیں کرتا۔ پر دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ جوان جہان ہیں۔ اِن پر بڑی کڑی نگرانی ہونی چاہیئے ——— میں تو اُن کے پاس کوئی مکھی بھی نہ پھٹکنے دوں۔ کوئی ایسی ویسی شرارت کریں گی تو وہ کان اینٹھوں کہ بلبلا اُٹھیں گی، اور یاد کریں گی کس بڑھیا سے پالا پڑا ہے ——— لیکن یہ کیسی کہنے لگیں۔ شریف خاندان کی ہیں۔ روزے نماز کی پابند ہیں ——— اور بے کہے بھی نہیں۔ نیک و بد اچھی طرح سمجھتی ہیں۔

دونوں لڑکیوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک برس کے فرق کے بعد ہی چھوٹی جس کا نام نسرین تھا پیدا ہوئی تھی۔ بڑی کا نام پروین تھا۔

دونوں خوبصورت تھیں۔ چہرے مہرے سے خاصی ہیں۔ قد موزوں، شکل آپس میں کافی ملتی تھی۔ دونوں ہر وقت اکٹھی کھیلتیں۔ مگر گڑیوں کا زمانہ عرصہ ہوا لد چکا تھا، اب جوانی کی شرارتوں کے دن تھے۔ کالج میں جاتے ہی اُنھوں نے پر پُرزے نکالے اور اِدھر اُدھر اُن تتلیوں کی طرح جن کو کسی پھول کی تلاش ہو، اِدھر اُدھر پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔

مائی جنتے ساتھ ہوتی تھی ——— وہ کالج کی بوڑھی چپڑاسن کے ساتھ اس وقت حُقّہ پیتی رہتی جو پاس ہی کوارٹر میں رہتی تھی۔ دونوں ہم عمری کے باعث بہت جلد گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ جب دونوں ایک ساتھ بیٹھتیں تو اُس زمانے کی باتیں چھڑ جاتیں جب کہ وہ بھی جوان تھیں۔ چپڑاسن کو کسی لڑکی سے رغبت یا محبت نہیں تھی۔

وہ مائی جنتے کو بڑی پرانی کہانیاں سناتی۔ فلاں سن میں ایک بیرسٹر کی لڑکی کو حمل ہو گیا تھا جو بڑی مشکل سے گرایا گیا۔ پرنسپل صاحب کو دس ہزار روپے رشوت کے ملے کہ اُس کا منہ بند رہے ——— پرسال ایک لڑکی جو بڑے اونچے گھرانے کی تھی، اُس سے دینیات کے مولوی صاحب کو عشق ہو گیا، چنانچہ موقعہ پا کر اس لونڈیا کو دبوچ لیا۔ پکڑے گئے اور کالج سے داڑھی اور رفعہ دونوں پولس کے ہاتھوں ہیں۔ داڑھی تو پانچ سال کی قید بھگت رہی ہے۔ معلوم نہیں اُس ریشمی برقع کا کیا ہوا ——— مُوا میں تو ایسی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتی۔ ——— مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ اِن کُتّھوں کے کارناموں پر اپنا وقت ضائع کروں۔"

مائی جنتے نے حُقے کی نے منہ سے الگ کر دی۔ "نہ بُوا ایسی باتیں نہیں کیا کرتے ... ۔ وہ کیا کہاوت ہے کہ وہ کون سا شہسوار ہے جو نہیں گرا ——— اور وہ کون سا پتّا ہے جو نہیں ہلا ——— خدا تمھارا بھلا کرے ——— ہم لوگوں کو خاموش ہی رہنا چاہیئے اور اللہ میاں سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ کسی کی بہو بیٹی کو بُرے کاموں کی طرف نہ جانے دے۔ اُن کی عزت آبرو اپنے کرم سے سنبھالے رکھے۔"

چپڑاسن اُس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی کہ کتنی نیک عورت ہے ——— اُس کو دل ہی دل میں بڑی ندامت ہوئی کہ اُس نے اتنی لڑکیوں کے بھید کھولے اور اُن کے راز افشا کئے۔ اُس نے چنانچہ فوراً مائی جنتے سے معافی مانگی اور کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں سے دور رہے گی۔ کسی لڑکی کے بارے میں اُسے کچھ پتہ بھی چل گیا تو وہ اپنی زبان بند رکھے گی۔

مائی جنتے نے اُسے بڑی شاباشیاں دیں۔ اتنے میں کالج چھوٹ گیا۔ اس نے پروین اور نسرین کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر جا کر اُس نے اُن

سے کہا۔ "آج تمھیں شام کو یہاں نہیں آنا پڑے گا؟"

پروین نے جواب دیا "ہمیں تو کسی نے نہیں کہا"

"اصل میں تم دونوں بہت بے وقوف ہو ——— وہاں سے ہر بات سنا کرو ——— میں تمھیں کسی سے پوچھ کر بتا دوں گی" مگر پہنچ کر مائی بخشنے نے اُن کے لئے چائے تیار کی اور بڑی پھرتی سے میز پر لگا دی۔ پھر وہ اُن کی ماں کے پاس اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی اور چپڑاسن سے جو باتیں اُس کی ہوئی تھیں من و عن سنا دیں۔ اُس نے آخر میں اُس کو مشورہ دیا کہ "پیدل آنا جانا ٹھیک نہیں ——— میرا خیال ہے آپ کسی ٹانگے کا بندوبست کر دیں تو ٹھیک رہے ——— پیدل چلو، تو کوئی خندہ کنندہ ہی رگڑ دے بیٹیوں کے ساتھ۔"

مائی بخشنے کا یہ مشورہ بڑا معقول تھا چنانچہ ٹانگے کا بندوبست دوسرے ہی روز ہو گیا ——— مائی بخشنے نے ایک ٹانگے والے سے مہینے بھر کا کرایہ طے کر لیا۔

دوسرے تیسرے روز اپنی مالکن وحیدہ بانو کو یہ خبر سنائی کہ پڑوس میں دیوار کے ساتھ جو جگہ خالی ہوئی تھی، اُس میں نئے کرایہ دار آن بسے ہیں۔

وحیدہ بانو نے پوچھا "کون لوگ ہیں؟"

"جانے ہماری ——— ہوں گے کوئی ایرے غیرے، نتھو خیرے ——— میں نے تو کسی سے پوچھا نہیں۔"

ایک دن دوسری طرف سے کوٹھے پر سے کسی شخص نے ایسے ہی جھانک کر اُن کے صحن میں دیکھا ——— ایک ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

مائی بخشنے کہیں باہر گئی تھی۔ وحیدہ بیگم نے فوراً کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر محلے کے ایک چھوٹے سے لڑکے کو بلایا اور کہا "اگر پڑوس والے مکان میں جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، اُن میں کوئی عورت ہو تو اُن سے کہو، آپ کی ہمسائی بیگم صاحبہ آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ دو گھڑی کے لئے تشریف لے آئیے ——— بڑی مہربانی ہوگی۔"

لڑکا پیغام لے کر چلا گیا ——— کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ پروین اور نسرین اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں، اس لئے اُس نے خود دروازہ کھولا ——— دہلیز پر ایک سفید برقعہ پوش خاتون کھڑی تھی۔ اُس نے بڑے ملائم لہجے میں وحیدہ بیگم سے پوچھا "کیا آپ ہی نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

وحیدہ بیگم نے جواب دیا "جی ہاں ——— تشریف لے آئیے۔"

وہ اندر چلی آئی۔ دونوں باہر بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئیں۔ وحیدہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے ——— دونوں چند لمحات ایک دوسرے کی شکل صورت اور کپڑے لتّوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ آخر ہمسائی ہی نے مہرِ خاموشی توڑی اور پوچھا "فرمایئے، آپ نے مجھے دولت خانے میں کیسے بلایا؟"

اِس پر وحیدہ بیگم کو اپنی شکایت کے اظہار کا موقع مل گیا اور اُس نے بڑی بردباری اور تحمل سے صحیح معاملہ بیان کر دیا اور پوچھا "وہ کون صاحبزادے ہیں جو اس طرح پرائے گھر میں تاک جھانک کرتے ہیں؟"

"میرا لڑکا ہے بہن ——— وہ تو ایسا نہیں ——— بڑا نیک بھلا ہے ——— چونکہ ہم نئے نئے اُٹھ کر یہاں آئے ہیں اسی لئے اُس نے کوٹھے پر

چولھے کے دیکھا ہوگا کہ آس پاس کیا ہوگا ـــــ ویسے میں اُس کو منع کر دوں گی کہ خبردار تم نے اِدھر کیا، کسی بھی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا ـــــ بڑا چھچھورا لڑکا ہے ـــــ ضرور میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔ میں نے اگر اُس کے باپ سے آپ کی شکایت کی تو وہ تو اُس کی مار مار کے کھال اُدھیڑ دیں گے ـــــ بڑے سخت گیر ہیں وہ اِس معاملے میں ـــــ ویسے مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں، میں نے صرف آپ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی تھی کہ بدمزگی نہ ہو ـــــ یہ کہہ کر وحیدہ بیگم اُٹھی اور پکاری" پروین ـــــ نسرین، ادھر آؤ ذرا!"

دونوں لپک کر باہر نکلیں، لیکن ایک نادیدہ عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ دوپٹے کے بغیر۔ فوراً اندر بھاگیں اور دوپٹے اوڑھ کر باہر آئیں۔ نو وارد عورت کو جھک کے سلام کیا اور اپنی ماں سے پوچھا "کیوں امی جان؟"

وحیدہ بیگم نے اپنی ہمسائی سے اپنی بیٹیوں کو متعارف کرایا ـــــ اُس نے اُن کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور اُن کی خوبصورتی کی بڑی تعریف کی کہ ماشاءاللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ پھر اُس نے کہا "میرا سلیم بالکل انہی کی طرح شریف اور شرمیلا ہے۔"

چند دنوں ہی میں وحیدہ اور ہمسائی جس کا نام نازلی بیگم تھا، بڑے گہرے مراسم ہو گئے۔ وحیدہ بیگم اُن کے یہاں نہیں جاتی تھی۔ اُس نے نازلی بیگم سے کہا "میں سر آنکھوں پر آتی۔ سو سو دفعہ آتی، پر جب سے خواجہ صاحب کا انتقال ہوا ہے کہ میں نے دل میں قسم کھائی تھی، اس گھر سے باہر ایک قدم نہ رکھوں گی ـــــ بہن دیکھو خدا کے لئے مجبور نہ کرنا۔"

اس اثنا میں کالج میں شام کی فنکشن ہوئے۔ کبھی کوئی مباحثہ ہے۔ کبھی لینڈن شو ہے۔ کبھی مشاعرہ ـــــ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ پروین اور نسرین دونوں ان پروگراموں میں شامل ہوتی تھیں، مگر مائی جنتے ساتھ ہوتی اور اُن کو لے کر بحفاظت واپس گھر آتی۔ خواہ جلدی خواہ دیر سے۔

عید سے چار روز پہلے سلیم واپس آیا۔ ساتھ اُس کے اُس کا بغلی دوست قادر تھا۔ وحیدہ بیگم نے اُس کو مندرجہ بالا واقعہ کے بعد جب اُس نے اتفاقاً وحیدہ بیگم کے صحن کو ایک نظر دیکھ لیا، گوجرانوالہ بھیج دیا تھا جہاں اُس کے والد کی آبائی اجداد و املاک تھیں ـــــ اُس نے اب اُسے خط لکھ کر بلایا تھا کہ عید سے پہلے پہلے یہاں لاہور چلے آؤ۔ وہ آ گیا اور ساتھ اپنے جگری دوست کو بھی لے آیا۔ گھر میں اُسے سب جانتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اکٹھے اسکول اور کالج میں پڑھے۔ یہاں لاہور میں اُٹھ آنے کی صرف ایک وجہ تھی کہ سلیم کے والد اُس کے لئے اپنے اثر و رسوخ سے کوئی اچھی ملازمت تلاش کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے روز شام کو قادر نے سلیم سے کہا "چلو یار، آج عیاشی کریں ـــــ گوجرانوالہ میں کیا پڑا ہے۔"

سلیم نے پوچھا "عیاشی کیسی؟"

قادر مسکرایا "تم تو نرے کھرے چند ـــــ چلو آؤ باہر، تمہیں بتاتا ہوں ـــــ دیکھیں گے، قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

دونوں دوست چلے گئے۔ اتنے میں وحیدہ بیگم کے پاس اُس کی ہمسائی آئی ـــــ اُس نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا مدعا بیان کر دیا کہ وہ اپنے سلیم کے لئے نسرین کا رشتہ مانگنے آئی ہے۔

زیادہ قیل و حجت کرنی بھی نہ ہوئی۔ وحیدہ اُن لوگوں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی۔ چند ہی باتیں ہوئیں، اس کے بعد دونوں رضامند ہو گئیں

کہ اُن کا نکاح عید کی تقریب سعید پر ہو جائے اور رخصتی ایک ماہ کے بعد۔

رات کو سلیم دیر سے آیا، مگر اُس کی ماں نے کوئی باز پرس نہ کی کیونکہ وہ بہت خوش تھی کہ اتنی جلدی اُس کے بیٹے کی شادی کا معاملہ نسرین ایسی حسین و جمیل اور باحیا لڑکی سے طے پا گیا۔ اُس نے چنانچہ سلیم کو یہ خوش خبری سُنا دی۔ وہ بھی بہت خوش ہُوا —— تجرد کی زندگی اور بیکاری سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ اُس نے سوچا، روپیہ پیسہ باپ کے پاس کافی ہے، کیا پروا ہے، ملازمت کی فکر ہوتی رہے گی۔

اُس کا دوست واپس گوجرانوالہ چلا گیا، اس لئے کہ اُس نے سمجھا اپنے گھر جانا تھا۔ سلیم نے اپنی ماں سے کہا: "دیکھئے امّی جان، میں نے آپ کی بات کتنی جلدی مان لی —— اب آپ میری مانیے۔"

اُس کی ماں نے پوچھا "کیا بیٹا؟"

"مجھے نسرین کی ایک جھلک دکھا دیجئے —— خواہ وہ دُور ہی سے کیوں نہ ہو" —— اُس کے لہجے میں التجا تھی "میرا خیال ہے کہ وہ انکار کریں تو اُس کا کوئی فوٹو ہی دکھا دیجئے —— آخر وہ کل یا پرسوں میری ہونے والی ہے۔"

اُس کی ماں کو سلیم کی یہ درخواست ناپسند نہ ہوئی "میں پوری کوشش کروں گی بیٹا۔"

عید آ گئی، مگر تصویر نہ آئی —— لیکن سلیم نے کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ نکاح کی رسم بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ جب وہ باہر نکلا تھا تو اُس کی ماں نے کواڑ ذرا سا کھولا اور اُس کو آواز دی۔ وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ باہر نکال کر اُس نے سلیم سے کہا "یہ لفافہ لو —— دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

سلیم سمجھ گیا —— آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس میں تابِ انتظار کیسے ہوتا۔ اُس نے لفافہ وہیں کھڑے کھڑے کھولا —— دھڑکتے ہوئے دل سے تصویر باہر نکالی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور تصویر پر پہلی نگاہ ڈالی۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ تصویر اُس کے کانپتے ہاتھوں سے گر پڑی —— اتنے میں سامنے والا دروازہ جس میں سے اُس کی ماں نے ہاتھ نکالا تھا کھلا اور بڑھیا نکلی —— سلیم نے اُس کو حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا "مائی، تم یہاں کیسے پہنچ گئیں —— ؟ تو اُس رات تم ہی ——"

اُس نے اِس سے اور زیادہ کچھ نہ کہا اور تصویر زمین ہی پر چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے اپنے ایک دوست ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا اور ساری بات بتلا دی۔ جمیل نے اُس کو ہسپتال میں داخل کرا دیا جہاں اُس کے جھوٹ موٹ کے مرض کا علاج ہوتا رہا —— آخر ڈاکٹر جمیل نے سلیم کے والد کو بلا کر تخلیے میں کہا کہ یہ شادی نہ ہو۔ آپ کا لڑکا عورت کے قابل نہیں ہے۔

———

جان محمد

(۱۲/ مئی ۵۴ء)

میرے دوست جان محمد نے جب میں بیمار تھا میری بڑی خدمت کی۔ میں تین ہفتے ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں وہ باقاعدہ شام کو آتا رہا۔ بعض اوقات جب میرے ذکر علیل ہوتے تو وہ رات کو بھی وہیں ٹھہرتا تاکہ میری خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

جان محمد بہت مخلص دوست ہے۔ میں قریب قریب بیس روز تک بے ہوش رہا تھا۔ اس دوران میں وہ آتا ـــــ لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان تھا۔ روتا بھی تھا، اس لئے کہ میری حالت بہت نازک تھی۔

جب میں اس قابل ہو گیا کہ بات چیت کر سکوں، تو اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کو تھکاوٹ تو محسوس نہیں ہوتی؟"

میرے اعضا بالکل مفلوج ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی مجھے بستر پر پڑے ہوئے۔ میں نے اس سے کہا "جان محمد ـــــ میرا انگ انگ دکھتا ہے۔"

اس نے فوراً میری بیوی سے کہا "کل زیتون کا تیل منگا دیجئے ـــــ میں صبح آ کے مالش کر دیا کروں گا۔"

زیتون کا تیل آ گیا۔ اور جان محمد بھی۔ اس نے میرے سارے بدن پر مالش کی۔ قریب قریب آدھ گھنٹہ اس کا اس مشقت میں صرف ہوا۔ مجھے بڑی راحت محسوس ہوئی۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز دفتر جانے سے پہلے ہسپتال میں آتا اور میرے بدن پر مالش کرتا ـــــ مجھے راحت ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ اس زور سے اپنے ہاتھ چلاتا کہ میری ہڈیاں تک دکھنے لگتیں، چنانچہ میں اس سے اکثر بڑے درشت لہجے میں کہتا "جان محمد، تم تو میری جان لے لو گے!"

یہ سن کر وہ مسکرا دیتا "منٹو صاحب، آپ تو بڑے سخت جان ہیں ـــــ اس مٹھی چاپی سے گھبرا گئے؟"

میں خاموش ہو جاتا، اس لئے کہ اس کی مٹھی چاپی میں کوئی جارحانہ چیز نہیں تھی، بلکہ سراپا خلوص تھا۔

تین مہینے ہسپتال میں کاٹنے کے بعد میں گھر آ گیا ——— جان محمد دستور بہر روز آتا رہا۔

میری اُس کی دوستی اتفاقاً ہو گئی تھی۔ ایک روز میں گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک ناٹے قد کے چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے جوان سوال مرو نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جب اُس کو اندر کمرے میں داخل کیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ میرا مداح ہے "منٹو صاحب ——— میں نے آپ کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ ——— میں نے قریب قریب آپ کی سب تصانیف پڑھی ہیں"

میں نے اُس کا مناسب و موزوں الفاظ میں رسمی طور پر شکریہ ادا کیا تو اُس کو بڑی حیرت ہوئی "منٹو صاحب ——— آپ تو رسوم و قیود کے قائل ہی نہیں۔ پھر یہ تکلف کیوں؟"

میں نے کہا۔ "نو واردوں سے بعض اوقات یہ تکلف برتنا ہی پڑتا ہے۔"

جان محمد کی چھوٹی مونچھوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "مجھ سے آپ یہ تکلف نہ برتیئے۔"

چنانچہ یہ تکلف فوراً دُور ہو گیا۔

اس کے بعد جان محمد نے ہر روز میرے گھر آنا شروع کر دیا۔ شام کو وہ جب دفتر سے فارغ ہوتا تو سیدھا میرے یہاں چلا آتا۔

میری عادت ہے کہ میں کسی دوست کا حسب نسب دریافت نہیں کرتا۔ اِس لئے کہ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا ——— میں تو کسی طور اس سے اُس کا نام بھی نہیں پوچھتا۔

یہ تمہید کافی لمبی ہو گئی، حالانکہ میں اختصار پسند ہوں ——— جان محمد دیر تک میرے یہاں آتا رہا۔ اُس کی معلومات خاصی اچھی تھیں۔ ادب سے بھی اُسے خاصا شغف ہے۔ مگر میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ زندگی سے کسی قدر بیزار ہے۔

مجھے زندگی سے پیار ہے، لیکن اُس کو اِس سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ہم دونوں جب باتیں کرتے تو وہ کہتا "منٹو صاحب، آپ میرے لباس کو دیکھئے جو میلا اور تمیض جو میلشیا کی ہے، آپ یقیناً نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے ——— مگر مجھے اچھے لباس کی کوئی خواہش نہیں ——— مجھے کسی خوبصورت چیز کی خواہش نہیں۔"

میں نے اُس سے پوچھا "کیوں؟"

"بس ——— میرے اندر یہ حس ہی نہیں رہی ——— میں ننگے فرش پر سوتا ہوں ——— نہایت واہیات ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں ——— یہ دیکھئے ——— میرے ناخن اتنے بڑھے ہوئے ہیں ——— اِن میں کتنا میل بھرا ہے ——— میرے پاؤں ملاحظہ فرمایئے ——— ایسا نہیں لگتا کہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہیں ——— مگر مجھے اِن غلاظتوں کی کچھ پروا نہیں۔"

میں نے اُس کی غلاظتوں کے متعلق اُس سے کچھ نہ کہا۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت میلا کچیلا رہتا تھا۔ اُس کو صفائی کے متعلق کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دن حسب معمول جب وہ شام کو میرے پاس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کی طبیعت مضمحل ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا "کہو جان محمد کیا بات ہے آج ——— تم کچھ تھکے سے معلوم ہوتے ہو۔"

اُس نے اپنی جیب سے بیڑی کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ سُلگا کر جواب دیا "تھکاوٹ ہو ہی جاتی ہے ——— کوئی خاص بات نہیں ہے؟"

اس کے بعد ہم دیر تک غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے رہے۔ اُس کو یہ فارسی کا شعر بہت پسند آیا۔ ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

ہم غالب کی شاعری پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک ہمسائے کی لڑکی میری بیوی سے ملنے چلی آئی۔ چونکہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی، اس لئے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔ جان محمد نے آنکھیں جھکا لیں اور خاموش ہو گیا۔

اس لڑکی کا نام شمیم تھا۔ دیر تک وہ بیٹھی میری بیوی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن اس دوران میں جان محمد اُسی طرح آنکھیں جھکائے خاموش رہا۔ کچھ اس طرح کہ اُسے کوئی پہچان نہ لے۔

اِس کے بعد دوسرے دن رات کے دس بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر اُوپر سو رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جان محمد ہے۔ نہایت خستہ حالت میں۔ میں بہت پریشان ہُوا اور اُس سے پُوچھا "کیوں جان محمد ——— خیریت تو ہے"

اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، جس سے میں بالکل نا آشنا تھا "خیریت ہے ——— مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ——— اس لئے میں آپ کے پاس چلا آیا۔"

مجھے سخت نیند آ رہی تھی، مگر جان محمد ایسے مخلص دوست کے لئے میں اِسے قربان کرنے کے لئے تیار تھا، مگر جب اُس نے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کیں تو مجھے وحشت ہونے لگی ——— اُس کا دماغ غیر متوازن تھا۔ کبھی وہ آسمان کی بات کرتا، کبھی زمین کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اُسے کیا ہو گیا۔

ایک دن پہلے جب وہ مجھ سے ملا تو اچھا بھلا تھا۔ ایک دم اُس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟

ساری رات اُس نے مجھے جگائے رکھا۔ آخر صبح میں نے اُس کو غسل کرنے کے لئے کہا۔ اپنے کپڑے اُسے پہننے کے لئے دیئے کہ اُس کے میلے کچیلے تھے۔ پھر اُس کو لاریوں کے اڈے پر لے گیا کہ وہ سیالکوٹ اپنے والدین کے پاس چلا جائے۔

غلطی میں نے یہ کی کہ اُس کو لاری میں نہ بٹھایا۔ کرایہ وغیرہ میں نے اُسے دے دیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا، مگر اُسی دن رات کے تین بجے دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ میں باہر صحن میں سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اُٹھا، سوچا کہ شاید کوئی تار آیا ہو۔ دروازہ کھولا تو سامنے جان محمد ——— میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں نے اُس سے پُوچھا کہ وہ سیالکوٹ کیوں نہیں گیا۔ اُس نے اِس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دیا۔ اُس کا دماغ پہلے سے زیادہ غیر متوازن تھا۔ فرش پر لیٹ کر اپنی کنپٹیوں پر زور زور سے گھونسے مارنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں۔ وہ یقیناً جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوچا، پیار محبت سے کام لینا چاہیئے، چنانچہ بہت دیر تک میں اُس کو سہلاتا رہا۔ اس کے بعد اُس سے پُوچھا "جان محمد تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور فرش پر بیٹھ کر بچیوں کے جو ماربل پڑے ہوئے تھے، اُن سے کھیلنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے ہر ماربل کو سجدہ کیا اور رونے لگا۔

میں نے پھر اُس سے بڑی محبت سے پوچھا، "جان محمد، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اُس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں جیسے کئی دنوں سے شراب کے نشے میں دُھت ہے۔ اُس نے مجھے اِن آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا، "تم اتنے بڑے نفسیات شناس بنتے ہو — کیا یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"میں اپنی کم مائگی تسلیم کرتا ہوں — اب تم خود بتا دو۔"

جان محمد مسکرایا۔ "مجھے شمیم ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اب بھی مطلب پوچھتے ہیں آپ؟"

میں نے اُس سے کہا، "بھئی شمیم کوئی بیماری تو نہیں۔"

جان محمد ہنسا، "بہت بڑی بیماری ہے منٹو صاحب — یہ کئی لوگوں کو ہو چکی ہے۔ اُن میں سے میں بھی ایک ہوں — پہلے ڈلہوزی میں ہوتی تھی — اب یہاں لاہور چلی آئی ہے۔"

میں سمجھ گیا — جان محمد کئی برس ڈلہوزی میں رہ چکا تھا اور شمیم بھی۔ لیکن میں نے اُس سے کہا، "میں ابھی تک نہیں سمجھا — تم اب سو جاؤ — چلو آؤ — اندر صوفے پر لیٹ جاؤ۔ خبردار جو تم نے شور مچایا۔"

وہ اندر چلا آیا اور صوفے پر لیٹ گیا — میں صبح جلدی اُٹھنے کا عادی ہوں۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اُٹھا تو دیکھا کہ جان محمد غائب ہے۔ سات بجے پتہ چلا کہ شمیم بھی اپنے فلیٹ میں نہیں ہے — کہیں غائب ہو گئی ہے۔

بارش

(۱۴ مئی ۱۹۳۶ء)

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا جل تھل دیکھ رہا تھا — باہر بہت بڑا لان تھا۔ جس میں دو درخت تھے۔ ان کے سبز پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ پانی کی اس یورش سے خوش ہو کر ناچ رہے ہیں۔

ادھر ٹیلی فون کا ایک کھمبا گڑا تھا۔ اس کے فلیٹ کے عین سامنے۔ یہ بھی مسرور نظر آتا تھا، حالانکہ اس کی مسرّت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس بے جان شے کو بھلا مسرور کیا ہونا تھا — لیکن تنویر نے جو کہ بہت مغموم تھا یہی محسوس کیا، کہ اس کے آس پاس جو بھی شے ہے، خوشی میں ناچ گا رہی ہے۔

ساون گذر چکا تھا، اور باران رحمت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اکٹھے ہو کر دعائیں مانگیں، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بادل آتے اور چلے جاتے۔ مگر ان کے تھنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔

آخر ایک دن اچانک کالے کالے بادل آسمان پر گھر آئے اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ تنویر کو بادلوں اور بارشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی — اس کی زندگی چٹیل میدان بن چکی تھی، جس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی کسی نے نہ ٹپکایا ہو۔

دو برس پہلے، اس نے ایک لڑکی سے جس کا نام ثریا تھا، محبت کرنا شروع کی۔ مگر یہ یک طرفہ محبت تھی۔ ثریا نے اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا۔ ساون کے دن تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی سے باہر نکلا، جانگیہ پہن کر، کہ نہائے اور بارش کا لطف لے۔ آم بالٹی میں پڑے تھے۔ وہ اکیلا بیٹھا انہیں چوس رہا تھا، کہ اچانک اسے چیخیں اور قہقہے سنائی دیئے۔

اس نے دیکھا کہ ساتھ والی کوٹھی کے لان میں دو لڑکیاں بارش میں نہا رہی ہیں اور خوشی میں شور مچا رہی ہیں۔ اس کی کوٹھی اور ساتھ والی کوٹھی کے درمیان صرف ایک جھاڑیوں کی دیوار حائل تھی۔

تنویر کا تھا ——— آم کا رس چوستے ہوئے وہ باڑ کے پاس گیا اور غور سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا
معمولی ململ کے کرتے پہنے تھیں، جو اُن کے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ شلواریں چونکہ لٹھے کی تھیں، اس لئے تنویر کو اُن کے بدن کے نچلے حصے کے صحیح خد و خال کا پتہ نہ چل سکا۔

اُس نے پہلے کسی عورت کو ایسی نظروں سے کبھی نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اُس روز جب کہ بارش ہو رہی تھی، اُس نے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھا ——— دیر تک وہ اُن کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیگ بھیگ کر خوشی کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔

تنویر نے اُن کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے کہ وہ طبعاً کچھ اس قسم کا لڑکا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو بری نظروں سے دیکھنا گناہ سمجھتا تھا۔ مگر اُس روز اُس نے بڑی للچائی نگاہوں سے اُن کو دیکھا ——— دیکھا ہی نہیں، بلکہ ان کے گیلے بدنوں میں انگارہ بن کر برمے کی طرح چھید کرتا رہا۔

تنویر کی عمر اُس وقت بیس برس کے قریب ہو گی۔ ناتجربہ کار تھا۔ زندگی میں اُس نے پہلی مرتبہ جوان لڑکیوں کے شباب کو گیلی ململ میں لپٹے دیکھا، تو اُس نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔

اُس نے اُن دو لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا ——— دیر تک وہ غور کرتا رہا ——— ایک لڑکی بڑی شریر تھی ——— دوسری اُس سے کم۔ اُس نے سوچا شریر ہی اچھی رہے گی جو اُس کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔

یہ شریر لڑکی خوبصورت تھی، اُس کے بدن کے اعضا بھی بہت متناسب تھے۔ بارش میں نہاتی جل پری معلوم ہوتی تھی ——— تھوڑی دیر کے بعد تنویر شاعر بن گیا۔ اُس نے کبھی اس حد پر نہیں سوچا تھا لیکن اِس لڑکی نے جس کا کرتہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اُس کو ایسے ایسے شعر یاد کرا دیئے، جن کو وہ عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔

اس کے علاوہ ریڈیو پر سنے ہوئے فلمی گانوں کی دھنیں بھی اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اور اُس نے باڑ کے پیچھے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اشوک کمار ہے ——— دلیپ کمار ہے ——— پھر اُسے کامنی کوشل اور نلنی جیونت کا خیال آیا ——— مگر اُس نے جب اُس لڑکی کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ اُس میں کامنی کوشل اور نلنی جیونت کے خد و خال نظر آ جائیں، تو اُس نے اِن دونوں ایکٹرسوں پر لعنت بھیجی ——— وہ اُن سے کہیں زیادہ حسین تھی ——— اس کے ململ کے کرتے میں جو شباب تھا، اُس کا مقابلہ، اُس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تنویر نے آم چوسنے بند کر دیئے، اور اُس لڑکی سے جس کا نام پروین تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں اُسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لئے کہ اُس لڑکی تک رسائی تنویر کو آسان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اُسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اُس سے ملتفت ہو گی یا نہیں؟

بہت دیر تک وہ انہی اُلجھنوں میں گرفتار رہا ——— راتیں جاگتا ——— جھاڑیوں کی پست قد باڑ کے پاس جاتا۔ مگر وہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر جو اُس نے دیکھا تھا، آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں دہراتا رہتا۔

بہت دنوں کے بعد آخر اُس کو ایک روز اُس سے ملاقات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی غرض سے جا رہا تھا کہ پھاٹک سے اُس کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکا تھا کہ سامنے والی کوٹھی میں سے تنویر کے خوابوں کی شہزادی نکلی۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، وہ رُکا تو

روک سکا :

تنویر گھبرا گیا ــــ ہر عاشق ایسے موقعوں پر گھبرا ہی جایا کرتا ہے۔ اُس نے موٹر کچھ ایسے بینڈے انداز میں روکی کہ اُس کو زبردست دھچکا لگا ــــ اُس کا سر زور سے اسٹرینگ وہیل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اُس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ مخمور تھا۔ اُس کی اُس کی محبوبہ نے خود مخاطب کیا تھا۔

پروین کے ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک تھپی ہوئی تھی ــــ اُس نے سُرخ مسکراہٹ سے کہا "معاف فرمائیے گا، میں نے آپ کو تکلیف دی ــــ بارش ہو رہی ہے ــــ تانگہ اِس دفعہ ویرانہ جگہ ملنا محال ہے ــــ اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، آپ میرے ہمسائے ہیں، اس لئے آپ کو یہ زحمت دی"

تنویر نے کہا "زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ــــ میں تو ــــ میں تو ــــ" اُس کی زبان لڑکھڑا گئی "آپ سے میرا تعارف تو نہیں، لیکن آپ کو ایک بار دیکھا تھا"

پروین اپنی سُرخ مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور تنویر سے پوچھا "آپ نے مجھے کب دیکھا تھا"

تنویر نے جواب دیا "آپ کی کوٹھی کے لان میں ــــ جب آپ ــــ جب آپ، اور آپ کے ساتھ دو ... اور لڑکی بارش میں نہا رہی تھی"

پروین نے اپنے گہرے سُرخ لبوں میں سے چیخ نما آواز نکالی ہائے ــــ آپ دیکھ رہے تھے؟

"یہ گستاخی میں نے ضرور کی ــــ اس کے لئے معافی چاہتا ہوں"

پروین نے ایک ادا کے ساتھ اُس سے پوچھا "آپ نے دیکھا کیا تھا؟"

یہ سوال ایسا تھا کہ تنویر اُس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا "جی کچھ نہیں ــــ بس آپ کو ــــ میرا مطلب ہے کہ وہ لڑکیاں تھیں جو بارش میں نہا رہی تھیں اور ــــ اور خوش ہو رہی تھیں ــــ میں اُس وقت آم چوس رہا تھا"

پروین کے گہرے سُرخ لبوں پر شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی "آپ آم چوستے کیوں ہیں ــــ کاٹ کر کیوں نہیں کھاتے؟"

تنویر نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اِس سوال کا جواب کیا دے۔ چنانچہ وہ گول کر گیا "آپ کو میں کہاں ڈراپ کر دوں"

پروین مسکرائی "آپ مجھے کہیں بھی ڈراپ کر دیں، وہی میری منزل ہو گی"

تنویر نے یوں محسوس کیا کہ اُسے اپنی منزل مل گئی ہے۔ لڑکی جو اُس کے پہلو میں بیٹھی ہے، اب اُسی کی ہے۔ لیکن اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اُس کا ہاتھ دبائے یا اُس کی کمر میں ایک دو سیکنڈ کے لئے اپنا بازو حمائل کر دے۔

بارش تھم رہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ اُس نے کافی دیر سوچا۔ موٹر کی رفتار اُس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی۔ آخر اُس نے ایک جگہ اُسے روک لیا، اور جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اُس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے ــــ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی سندھڑی لنگڑا آم چوس رہا ہے۔ پروین نے کوئی مزاحمت نہ کی ــــ لیکن فوراً تنویر کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ اُس نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ہے، اور غالباً پروین کو اُس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی، چنانچہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اُس نے کہا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

پدمنی کے چہرے پر یوں تو خفگی کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن تنویر یوں محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اُس کے خون کی پیاسی ہے۔

پدمنی نے اسے بتا دیا کہ اُسے کہاں جانا ہے ——— جب وہ اُس جگہ پہنچا تو اُسے معلوم ہُوا کہ وہ رنڈیوں کا چکلہ ہے ——— جب اُس نے پدمنی کو موٹر سے اُتارا تو اُس کے ہونٹوں پر گہرے لال رنگ کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ اُس نے کولہے مٹکا کر ٹھیٹ کسبیوں کے انداز میں اُس سے کہا "شام کو میں یہاں ہوتی ہوں ——— آپ کبھی ضرور تشریف لائیے"۔

تنویر سب سمجھ گیا ہو کر اپنی موٹر کی طرف بڑھا، تو اُسے ایسا لگا کہ وہ بھی ایک کسبی عورت ہے، جسے وہ ہر روز چلاتا ہے۔ اُس کی لال تتی لپ اسٹک جیسے بمپروں کے ہونٹوں پر لپی ہوئی تھی۔

وہ واپس اپنی کوٹھی چلا آیا ——— بارش ہو رہی تھی ——— اور تنویر بے حد مغموم تھا ——— اُس کو ایسا محسوس ہُوا کہ اُس کی آنکھوں کے آنسو بارش کے قطرے بن کے ٹپک رہے ہیں۔

افشائے راز

(۱۵ مئی ۵۴ء)

"میری نگوڑی کسے نہ ویکھی دے، نے ٹھنڈی زور جگ جاندا!"

"یہ آپ نے گانا کب سے شروع کر دیا ہے؟"

"میرا دل گاتا اور روتا ہے ——— کونسا گناہ کیا ہے؟"

"کل آپ غسل خانے میں بھی یہی گیت گا رہے تھے۔"

"غسل خانے میں تو ہر شریف آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے ——— اس لئے کہ وہاں کوئی اور سننے والا نہیں ہوتا ——— میرا خیال ہے، تمہیں میری آواز پسند نہیں آئی۔"

"آپ کی آواز تو ماشاءاللہ بڑی اچھی ہے۔"

"مجھے بنا رہی ہو ——— مجھے اس کا علم ہے کہ میں کن سرا ہوں۔ میری آواز میں کوئی کشش نہیں ——— کوئی بھی اسے پھٹے بانس کی آواز کہہ سکتا ہے۔"

"مجھے تو آپ کی آواز بڑی رسیلی معلوم ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے ——— لیکن میں پوچھتی ہوں آپ ہر وقت یہ پنجابی بولی ورد زبان کیوں رہتی ہے؟"

"مجھے اچھی لگتی ہے ——— بیگم تم کو اگر ادب اور شعر سے ذرا سا بھی شغف ہو ———"

"یہ شغف کیا بلا ہے ——— آپ ہمیشہ ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔"

"شغف کا مطلب ——— بس تم یہ سمجھ لو ——— کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے۔"

"مجھے شاعری سے لگاؤ کیوں ہو — ایسی واہیات چیز ہے۔"

"یعنی شاعری بھی اک چیز ہو گئی — یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے — فرصت کے لمحات میں اپنے اندر ذوق پیدا کیا کرو۔"

"چھ بچے پیدا کر چکی ہوں — اب میں اور کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی۔"

"میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا کہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے، پر تم ہی نہیں مانیں — چھ بچے پیدا کر کے تم تھک گئی ہو۔ تمہارے پڑوس میں مسز قیوم رہتی ہیں۔ اُن کے گیارہ بچے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں بھی گیارہ بچے پیدا کروں؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے — میں تو [illegible]"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں — اگر میرے بچے نہ ہوتا تو آپ اسی بہانے سے دوسری شادی کر لیتے۔"

"میں تو ایک ہی شادی سے عاجز آیا ہوا ہوں — تم ہماری زندگی کے لیے کافی ہو — میں دوسری شادی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔"

"اور یہ پنجابی بولی کس لیے گائی جا رہی تھی؟"

"بھئی، میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ پسند ہے — تمہیں ناپسند ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں — میری [illegible] ٹھنڈی فوراً [illegible] ہو جاتا ہے۔"

"اس بولی میں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے؟"

"میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے اب تک کوئی بات وثوق سے نہیں کی۔"

"وثوق نہیں — وثوق — یعنی یقین کے ساتھ۔"

"آپ نے ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں کی جس پر یقین کیا جا سکے۔"

"لو آج یہ نئی بات سنی — میری باتوں پر آپ کو یقین کیوں نہیں؟"

"مردوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہے؟"

"عورتوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا — گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ — آپ ہی بگاڑتی ہیں، آپ ہی رفو کرتی ہیں — سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کی برہمی کس بات پر ہے؟"

"آپ ایسے واہیات گیت گنگناتے رہیں اور میں چپ رہوں — ایسے دور قرآن درمیان، آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے اعتنائی کی — میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو غزلوں اور گیتوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے — ابھی پچھلے دنوں آپ مسلسل یہ شعر گنگناتے رہے۔

ستاتے ہیں مہ جبینوں کو بھی کچھ کچھ
مروت کے قرینے آ رہے ہیں

یہ اس کمبخت اعتراض ہے ـــــ کوئی شریف آدمی ایسے شعر نہیں گاتا ـــــ آپ ـــ

تیری لالٹ ہے اکبری سودا

میری بارکیوں وہیہ اتنی کری

نہیں گاتے؟

" لاحول ولا ـــــ تم بھی کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔"

" یہ باتیں گویا آپ کے نزدیک، اوٹ پٹانگ ہیں؟ ـــــ اس لئے کہ پاکیزہ ہیں؟"

" تمہاری ہر چیز پاکیزہ ہے!"

" آپ بھی؟"

" میں تو ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہوں۔ تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے۔ دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتا ہوں۔ سخت سردی بھی ہو تو غسل کرتا ہوں۔ تم تو تین چار دن چھوڑ کے نہاتی ہو۔ تمہیں پانی سے نفرت ہے!"

" اجی واہ ـــــ میں تو ہر ہفتے باقاعدہ نہاتی ہوں!"

" ہر ہفتے کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے ـــــ قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ، تمہیں نہائے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟"

" میں قرآن کی قسم کھانے کے لئے تیار نہیں ـــــ آپ بتائیے، کب غسل کیا تھا؟"

" آج صبح!"

" جھوٹ ـــــ آپ کا اوّل جھوٹ، آخر جھوٹ ـــــ آج صبح تو نل میں پانی ہی نہیں تھا ـــــ میں نے ساڑھے نو بجے کے قریب دو مشکیں منگوائی تھیں!"

" میں بھول گیا ـــــ واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا!"

" آپ کو بھول جانے کا مرض ہے!"

" بھولنا انسان کی فطرت ہے ـــــ اس پر تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ـــــ چند روز ہوئے تم دس کا نوٹ کہیں رکھ کے بھول گئی تھیں۔ اور مجھ پہ الزام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے ـــــ یہ کتنی بڑی زیادتی تھی!"

" جیسے آپ نے میرے روپے کبھی نہیں چرائے ـــــ پچھلے مہینے میری الماری سے آپ نے سو روپے نکالے اور غائب کر گئے!"

" ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چرائے ہوں ـــــ اگر تمہیں مجھ پر شک تھا تو بتا دیا ہوتا ـــــ یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے وہ سو روپے کا نوٹ کسی محفوظ جگہ رکھا ہو اور بعد میں بھول گئی ہو ـــــ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے ـــــ"

" کب؟"

" پچھلے سال اسی مہینے تم نے پانچ سو روپے کے نوٹ اپنے پلنگ کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے۔ اور تم ان کے متعلق بالکل بھول گئی تھیں

—— مجھ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے چرا لئے ہیں۔ آخر میں نے ہی تلاش کر کے نکالے اور تمہارے حوالے کر دیئے تھے“

”کیا پتہ ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے شور مچانے پر اپنی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیئے ہوں“

”میری سمجھ میں تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔“

”آپ کی سمجھ میں تو کوئی چیز بھی نہیں آتی —— کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ دہی کھانا آپ کے لئے مضر ہے، لیکن آپ نے مجھے ایک لکچر پلا دیا کہ دہی فضول چیز ہے“

”دہی تو میں ہر روز لیتا ہوں“

”کتنا کھاتے ہیں“

”یہی، کوئی آدھ سیر“

”میں ہر روز سیر منگواتی ہوں —— باقی پڑا جھک مارتا رہتا ہے“

”دہی کو جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے —— جو بچ جاتا ہے، اس کی تم کڑھی بنا لیتی ہو“

”میں دہی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی —— کڑھی بناتی ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سلیقہ شعار عورت ہوں —— میں نے آپ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آپ آج کل ایک خاص پنجابی بولی کیوں ہر وقت گاتے رہتے ہیں“

”اس لئے کہ مجھے پسند ہے“

”کیوں پسند ہے؟ —— اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے“

”تمہیں کالا رنگ کیوں پسند ہے —— اس کی وجہ بتاؤ —— تمہیں بھنڈیاں مرغوب ہیں —— کیوں؟ —— تمہیں سینما دیکھنے کا شوق ہے —— اس کا جواز پیش کرو —— تم لٹھے کے بجائے ریشم کی شلواریں پہنتی ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟“

”آپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں —— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں“

”اپنی مرضی کا مالک میں بھی ہوں —— کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ جو شعر مجھے پسند ہو اپنی بھونڈی آواز میں دن رات گاتا رہوں“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں —— لیکن میں سمجھتی ہوں ——“

”رک کیوں گئیں“

”دیکھئے، آپ میری زبان نہ کھلوائیے —— میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ میں سب کچھ جانتی ہوں“

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟“

”سب کچھ“

”کچھ مجھے بھی بتا دو، تاکہ میں اپنے متعلق کچھ جان سکوں —— میں تو سالہا سال کے غور و فکر کے بعد بھی اپنے متعلق کچھ جان نہ سکا“

”آپ کی اس پنجابی بولی میں جو آپ مسلسل گنگناتے رہتے ہیں —— سب کچھ جان سکتے ہیں“

"تم اس قدر پریشاں کیوں ہو؟"

"ہر مرد بے وفا ہوتا ہے۔"

"میں نے بہت کم بے وفائی کی ہے ——— اصل میں عورتیں بے جا اپنے شوہروں پر شک کرتی رہتی ہیں ———"

"ٹھہریے ——— دروازے پر دستک ہوتی ہے ——— میرا خیال ہے، ڈاکیہ ہے۔"

* * * * *

"یہ خط میرا ہے ——— لاؤ ادھر"

"میں کھولتی ہوں ——— پڑھ کے آپ کے حوالے کر دوں گی۔"

"تمہیں میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"

"میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں ——— یہ حق آپ نے کب سے چھین لیا؟"

"اچھا، یہ بتا دو کہ خط کس کا ہے؟"

"آپ ہی کا ہے۔"

"کس نے لکھا ہے؟"

"آپ کی ایک سہیلی نے ——— جس کا نام فرزانہ ہے ——— وہ پنجابی بولی جو آپ گاتے پھرتے ہیں اس کاغذ کی پیشانی پر لکھی ہے ———

میری لگدی کسے نہ ویکھی دے   ٹٹدی نوں جگ جاندا

یہ ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ہے۔"

آمنہ

(۱۶ر مئی ۵۴ء)

دور تک پھیلے ہوئے دھان کے سنہرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ جتّو، نوجوان لڑکا، کٹے ہوئے دھان کے پولے اٹھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گا بھی رہا تھا۔

دھان کے پولے ادھر ادھر کا بدھے
پھر پھر لائے
کھیت سنہرا۔ دھن دولت رسے۔

جتّو کا باپ جمّا، گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اُس کو اپنی بیوی سے بہت پیار ہے۔ اُن دونوں کا عشق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا۔ اُن کے دو بچے تھے۔ ایک جتّو، جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی، دوسرا چندو۔

سب خوش و خرّم تھے کہ ایک روز اچانک جمّے کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ حالت بہت نازک ہو گئی۔ بہت علاج کئے۔ ٹونے ٹوٹکے آزمائے مگر اُس کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ جب مرض مہلک شکل اختیار کر گیا تو اُس نے اپنے شوہر سے نحیف لہجے میں کہا۔ "تم مجھے کبوتری کہا کرتے تھے اور خود کو کبوتر ——— ہم دونوں نے دو بچے پیدا کئے ——— اب یہ تمہاری کبوتری مر رہی ہے ——— کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم کوئی اور کبوتری اپنے گھر لے آؤ"

تھوڑی دیر کے بعد اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ جمّے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اُس کی بیوی بکے چلی جا رہی تھی۔ "تم اور کبوتری لے آؤ گے ——— وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اُس سے محبت نہیں کرو گے ——— چنانچہ وہ اُن کو ذبح کر کے کھا جائے گی۔"

جگّا نے اپنی بیوی سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "سکینہ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا ——— مگر تم اسے دشمن پریا۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی"

سکینہ کے ہونٹوں پر مُردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس کے فوراً بعد اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جگّا بہت رویا۔ جب اُس نے اپنے ہاتھوں سے اُس کو دفن کیا تو اُس کو ایسا محسوس ہُوا کہ اُس نے اپنی زندگی منوں مٹّی کے نیچے گاڑ دی ہے۔

اب وہ ہروقت مغموم رہتا۔ کام کاج میں اُسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایک دن اُس کے ایک وفادار مزارعے نے اُس سے کہا "سرکار بہت دنوں سے میں آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں اور جی ہی جی میں کڑھتا رہا ہوں۔ آج مجھ سے نہیں رہا گیا، تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی زمینوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ——— آپ کو اس کا علم ہی نہیں، کتنا نقصان ہو رہا ہے"۔

جگّا نے بڑی بے توجہی سے کہا "ہونے دو ——— مجھ کو کسی چیز کا ہوش نہیں"۔

"سرکار ——— آپ ہوش میں آئیے ——— چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، ایسا نہ ہو وہ آپ کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ کر لیں۔ آپ سے مقدمہ بازی کیا ہو گی ——— میری تو یہی مخلصانہ رائے ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں ——— اس سے آپ کے غم کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور وہ آپ کے لڑکوں سے پیار و محبت بھی کرے گی"۔

جگّے کو بہت غصہ آیا "بکواس نہ کرو رمضانی۔ تم سمجھتے نہیں کہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچو، میری بیوی کی رُوح کو کتنا بڑا صدمہ پہنچے گا"۔

بہت دنوں کے اصرار کے بعد آخر رمضانی اپنے آقا کو دوسری شادی پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب شادی ہو گئی تو اُس نے اپنے لڑکوں کو ایک علیحدہ مکان میں بھیج دیا ——— ہر روز وہاں کئی کئی گھنٹے رہتا اور بُندو اور چیندو کی دلجوئی کرتا رہتا۔

نئی بیوی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ ایک بات اور بھی تھی کہ جگّا دن کا بیشتر حصّہ اُس کے سوتیلے بیٹوں کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس سے وہ بہت جلتی۔ اس کا تو یہ مطلب تھا کہ گھر بار کے مالک وہی ہیں۔

ایک دن جگّا جب کھیتوں سے واپس آیا تو اُس کی نئی بیوی زار و قطار رونے لگی۔ جگّے نے اس آہ و زاری کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا "تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے ——— اسی لئے بچوں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا۔ میں اُن کی ماں ہوں۔ کوئی دشمن تو نہیں ہوں۔ مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ بیچارے اکیلے رہتے ہیں"۔

جگّا ان باتوں سے بہت متأثر ہُوا اور دوسرے ہی دن بُندو اور چیندو کو لے آیا اور اُن کو سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا، جس نے اُن کو اتنے پیار و محبت سے رکھا کہ آس پاس کے تمام لوگ اُس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔

نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو پوری طرح موہ لیا تو ایک دن ایک مزارعے کو بُلا کر اکیلے میں اُس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں ——— بولو کرو گے"؟

اس مزارعے نے جس کا نام شیرانی تھا، ہاتھ جوڑ کر کہا "سرکار، آپ مائی باپ ہیں ——— جان تک حاضر ہے"۔

نئی بیوی نے کہا "دیکھو، کل دریا کے پاس بہت بڑا میلہ لگ رہا ہے ——— میں اپنے سوتیلے بچوں کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی۔ اُن کو کشتی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی اور دیکھتا نہ ہو انھیں گہرے پانی میں ڈبو دینا۔"

شبراتی کی ذہنیت غلامانہ تھی۔ اس کے علاوہ اُس کو بہت بڑے انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ وہ دوسرے روز بندو اور چندو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انھیں کشتی میں بٹھایا۔ اُس کو خود کھینا شروع کیا۔ دریا میں دُور تک چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا ——— اُس نے چاہا کہ انھیں دھکا دے کر ڈبو دے، مگر ایک دم اُس کا ضمیر جاگ اُٹھا۔ اس نے سوچا، ان بچوں کا کیا قصور ہے ——— سوائے اس کے کہ ان کی اپنی ماں مر چکی ہے اور یہ اب سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں انھیں کسی شخص کے حوالے کر دوں اور سوتیلی ماں سے جا کر کہہ دوں کہ دونوں ڈوب چکے ہیں۔

دریا کے دوسرے کنارے اُتر کر اُس نے بندو اور چندو کو ایک تاجر کے حوالے کر دیا ——— جس نے اُن کو ملازم رکھ لیا۔

بڑا لڑکا بندو کھیل کود کا عادی، محنت مشقت سے بہت گھبراتا تھا ——— تاجر کے ہاں سے بھاگ نکلا، اور پیدل چل کر دوسرے شہر میں پہنچا، مگر وہاں اُسے ایک دولت مند آدمی کے ہاں جس کا نام قلندر بیگ تھا، پناہ لینا پڑی۔ قلندر بیگ نیک دل آدمی تھا، اُس نے چاہا کہ بندو کو اپنے ہاں نوکر رکھ لے، چنانچہ اُس نے اُس سے پوچھا "برخوردار کیا تنخواہ لو گے؟"

بندو نے جواب دیا "جناب میں تنخواہ نہیں لوں گا۔"

قلندر بیگ کو کسی قدر حیرت ہوئی۔ لڑکا شکل و صورت کا اچھا تھا۔ اُس میں گنوارپن بھی نہیں تھا۔ اُس نے پوچھا "تم کس خاندان کے ہو ——— کس شہر کے باشندے ہو؟"

بندو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا، پھر رونے لگا۔ قلندر بیگ نے اُس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بندو کو اُس کے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گذر گیا تو قلندر بیگ اُس کی خوش اطواری سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "بندو مجھے بہت پسند ہے ——— میں تو سوچتا ہوں، اس سے اپنی ایک لڑکی بیاہ دوں۔"

بیوی کو اپنے خاوند کی یہ بات بُری لگی۔ لیکن آخر میں اُس نے کہا "آپ پہلے اس کے خاندان کے متعلق تو دریافت کیجیے۔"

قلندر بیگ نے کہا "میں نے ایک مرتبہ اُس سے اُس کے خاندان کے متعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا ——— پھر میں نے اس موضوع پہ اُس سے کبھی گفتگو نہیں کی۔"

بندو کئی برس قلندر بیگ کے ہاں رہا۔ جب بیس برس کا ہو گیا تو قلندر بیگ نے اپنا سارا کاروبار اُس کے سپرد کر دیا۔ کافی عرصہ گذر گیا۔ ایک دن بندو نے بڑے ادب سے اپنے آقا سے درخواست کی "دریا کے اُس پار دور جو ایک گاؤں ہے، وہاں میں چھوٹا سا مکان بنوانا چاہتا ہوں ——— کیا آپ اتنا روپیہ مرحمت فرما سکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے؟"

قلندر مسکرایا "تم جتنا روپیہ چاہے لے سکتے ہو بیٹا ——— لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم دریا پار اتنی دور مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو؟"

بندو نے جواب دیا "یہ راز آپ پر عنقریب کھل جائے گا۔"

بندو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں گھل گھل کے مر چکا تھا۔ مزارعوں کی بڑی ابتر حالت تھی۔ اس لئے کہ زمینوں کی دیکھ بھال

کو سنبھالا کرنی بھی نہ تھا۔

بندو، بہت سارا پیسہ لے کر اپنے گاؤں پہنچا ایک پکا مکان بنوایا اور مزارعوں کو خوش حال کر دیا۔

بندو کا بھائی چندو جس شخص کے ہاں ملازم ہوا تھا، اس نے اس کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا تو اس شخص کی بیوی نے جس کا نام صفاں تھا، اپنی بیٹی آمنہ سے کہا کہ وہ اس کی تیمارداری کرے۔

آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی۔ دن رات اس نے چندو کی خدمت کی۔ آخر وہ صحت مند ہو گیا۔ تیمارداری کے اس دوران میں وہ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔

گو چندو سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اور وہ مفلس کنگال۔ ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ اس کے والدین بھلا کب ان کی شادی پر راضی ہوں گے۔ لیکن آمنہ کو کسی قدر یقین تھا کہ اس کے والدین راضی ہو جائیں گے، اس لئے کہ وہ چندو کو بڑی اچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ایک دن چندو گائے بھینسوں کے ریوڑ کو جوہڑ پہ پانی پلا رہا تھا کہ آمنہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ننھا سا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوش خوش چندو سے کہا "ایک بہت اچھی خبر لائی ہوں آج میری ماں اور باپ میری شادی کی بات کر رہے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ اس لئے تمھیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیئے۔"

چندو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آمنہ کو اٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔

ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جمیل رکھا گیا۔

جب بندو اپنے گاؤں میں اچھی طرح جم گیا تو اس نے بھائی کا پتہ لیا۔ جا کے اس سے ملا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ بندو نے اس سے کہا اب اللہ کا فضل ہے۔ چلو میرے ساتھ اور دیوانی سنبھالو۔ میں چاہتا ہوں تمھاری شادی اپنی سالی سے کرا دوں ـــ ـــ بڑی پیاری لڑکی ہے"

چندو نے اس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ سارے حالات سن کر بندو نے اس کو سمجھایا "قلندر بیگ بے حد دولت مند آدمی ہے۔ اس کی لڑکی سے شادی کر لو ـــــ ساری عمر عیش کرتے رہو گے ـــــ آمنہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے"

چندو اپنے بھائی کی یہ باتیں سن کر لالچ میں آ گیا، اور دولت کی خاطر آمنہ کو چھوڑ دیا۔ طلاق نامہ کسی کے ہاتھ بھجوا دیا اور اس سے ملے بغیر چلا گیا۔

چند روز کے بعد ہی بندو نے اپنے بھائی کی شادی قلندر بیگ کی چھوٹی لڑکی سے کرا دی۔ آمنہ حیران و پریشان تھی کہ اس کا پیارا چندو یکدم کہاں غائب ہو گیا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن ضرور واپس آ جائے گا۔ بڑی دیر اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جب وہ نہ آیا تو آمنہ کے باپ نے جمیل کو ساتھ لیا اور چندو کے گاؤں پہنچا۔ اس کی ملاقات چندو سے ہوئی۔ وہ دولت کے نشے میں سب کو بھول چکا تھا۔

آمنہ کے باپ نے اس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا "اور کچھ نہیں تو اپنے اس کمسن بیٹے ہی کا خیال کرو ـــــ تمھارے بغیر اس بچے کی زندگی کیا ہے؟"

چندو نے یہ کورا جواب دیا "میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لئے چھوڑ سکتا ہوں؟ ـــــ جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظروں سے دور کر دو۔"

جب آمنہ کے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی تو چند دستے اُس بڈھے کو دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بچے کو بھی۔

بوڑھا باپ غم و اندوہ سے چور گھر پہنچا اور آمنہ کو ساری داستان سنا دی۔ آمنہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ پاگل ہو گئی۔

چند دن پے در پے اتنے مصائب آئے کہ اُس کی ساری دولت اُجڑ گئی، بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ بیوی لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئی۔ اب اُس کو آمنہ یاد آئی۔ وہ اُس سے ملنے کے لئے گیا۔ اُس کا بیٹا جمیل، ہڈیوں کا ڈھانچہ، اُس سے گھر کے باہر ملا۔ اُس نے اُس کو پیار کیا اور آمنہ کے متعلق اُس سے پوچھا۔

جمیل نے اُس سے کہا "آؤ تمہیں بتاتا ہوں، میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے۔"

وہ اُسے دور لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے "یہاں رہتی ہے آمنہ اماں!"

تصویر

(۱۸ مئی ۵۴ء)

"بچے کہاں ہیں؟"

"مر گئے ہیں!"

"سب کے سب؟"

"ہاں، سب کے سب —— آپ کو آج اُن کے متعلق پوچھنے کا کیا خیال آگیا؟"

"میں اُن کا باپ ہوں۔"

"آپ ایسا باپ خدا کرے کبھی پیدا ہی نہ ہو۔"

"تم آج اتنی خفا کیوں ہو —— میری سمجھ میں نہیں آتا۔ گھڑی میں رتی، گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہو —— دفتر سے تھک کر آیا ہوں اور تم نے یہ پخ پخ شروع کر دی ہے —— بہتر تھا کہ میں وہاں دفتر ہی میں پنکھے کے نیچے آرام کرتا۔"

"پنکھا یہاں بھی ہے —— آپ آرام طلب ہیں —— یہیں آرام فرما سکتے ہیں۔"

"تمہارا طنز کبھی نہیں جائے گا —— میرا خیال ہے کہ یہ چیز تمہیں جہیز میں ملی تھی۔"

"میں کہتی ہوں، کہ آپ مجھ سے اس قسم کی خرافات نہ بکا کیجئے —— آپکے دیدوں کا تو پانی ہی ڈھل گیا ہے۔"

"یہاں تو سب کچھ ڈھل گیا ہے —— تمہاری وہ جوانی کہاں گئی! —— میں تو اب ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے سو برس کا بڈھا ہوں۔"

"یہ آپکے اعمال کا نتیجہ ہے —— میں نے تو خود کو کبھی عمر رسیدہ محسوس نہیں کیا۔"

"میرے اعمال اتنے سیاہ تو نہیں —— اور پھر میں تمہارا شوہر ہوتے ہوئے کیا اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ تمہارا شباب اب رُو بہ تنزل ہے۔"

"مجھ سے ایسی زبان میں گفتگو کیجئے جس کو میں سمجھ سکوں ——— یہ تم پر نزول کیا ہوا؟"

"چھوڑو اسے ——— آؤ، محبت پیار کی باتیں کریں۔"

"آپ نے ابھی ابھی تو کہا تھا کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس کے بڈھے ہیں۔"

"بھئی دل تو جوان ہے!"

"آپکے دل کو میں کیا کہوں ——— آپ اسے دل کہتے ہیں، مجھ سے کوئی پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جو اس شخص نے اپنے پہلو میں دبا رکھا ہے، اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس میں محبت بھری ہوئی ہے ——— آپ محبت کرنا کیا جانیں ——— محبت تو صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔"

"آج تک کتنی عورتوں نے مردوں سے محبت کی ہے ——— ذرا تاریخ کا مطالعہ کرو ——— ہمیشہ مردوں ہی نے عورتوں سے محبت کی اور اُسے نبھایا ——— عورتیں تو ہمیشہ بے وفا رہی ہیں۔"

"جھوٹ ——— اس کا اوّل جھوٹ، اس کا آخر جھوٹ ——— بے وفائی تو ہمیشہ مردوں نے کی ہے۔"

"اور وہ جو انگلستان کے بادشاہ نے ایک معمولی عورت کے لئے تخت و تاج چھوڑ دیا تھا؟ ——— وہ کیا جھوٹی اور فرضی داستان ہے۔"

"بس ایک مثال پیش کر دی اور مجھ پر رعب ڈال دیا۔"

"بھئی تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ——— مرد جب کسی عورت سے عشق کرتا ہے تو وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ کم بخت اپنی جان قربان کر دیگا، مگر اپنی محبوب کو ذرا سی بھی ایذا پہنچنے نہیں دیگا۔ تم نہیں جانتی ہو، مرد میں جب کہ وہ محبت میں گرفتار ہو، کتنی طاقت ہوتی ہے۔"

"سب جانتی ہوں ——— آپ سے تو کل الماری کا جاہوا دروازہ بھی نہیں کھل سکا ——— آخر مجھے ہی زور لگا کر کھولنا پڑا۔"

"دیکھو، جانم ——— تم زیادتی کر رہی ہو ——— تمہیں معلوم ہے کہ میرے دہنے بازو میں ریح کا درد تھا۔ میں اُس دن دفتر بھی نہیں گیا تھا اور سارا دن اور ساری رات پڑا کراہتا رہا تھا ——— تم نے میرا کوئی خیال نہ کیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئیں۔"

"آپ تو بہانہ کر رہے تھے۔"

"لاحول ولا ——— یعنی میں بہانہ کر رہا تھا۔ درد کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے، اور تم کہتی ہو کہ میں بہانہ کر رہا تھا ——— لعنت ہے ایسی زندگی پر۔"

"یہ لعنت مجھ پر بھیجی گئی ہے!"

"تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں ——— میں اپنی زندگی کا رونا رو رہا تھا۔"

"آپ تو ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں۔"

"تم تو ہنستی رہتی ہو ——— اس لئے کہ تمہیں کسی کی پروا ہی نہیں۔ بچے جائیں جہنم میں۔ میرا جنازہ نکل جائے ——— یہ مکان جل کر راکھ ہو جائے مگر تم ہنستی رہو گی ——— ایسی بے دل عورت میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔"

"کتنی عورتیں دیکھی ہیں آپ نے اب تک؟"

"ہزاروں دیکھوں ——— سڑکوں پر تو آج کل عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں "

"مجھوٹ نہ بولئے ——— آپ نے کوئی نہ کوئی عورت خاص طور پہ دیکھی ہے "

"خاص طور پہ سے تمہارا مطلب کیا ہے ؟"

"میں آپ سے دماغ کھونا نہیں چاہتی ——— میں اب چلتی ہوں "

"کہاں ؟"

"ایک سہیلی کے یہاں ——— اُس سے اپنا دکھڑا بیان کروں گی ۔ خود روؤں گی، اُس کو بھی رُلاؤں گی ——— اس طرح کچھ جی ہلکا ہو جائیگا "

"وہ دکھڑا جو تمہیں اپنی سہیلی سے بیان کرنا ہے، مجھے ہی بتا دو ——— میں تمہارے غم میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں "

"آپ کے وعدے ! ——— کبھی ایفا ہوئے ہیں ؟"

"تم بہت زیادتی کر رہی ہو ——— میں نے آج تک تم سے جو بھی وعدہ کیا، پورا کیا ——— ابھی پچھلے دنوں تم نے مجھ سے کہا کہ چائے کا ایک سیٹ لا دو ——— میں نے ایک دوست سے روپے قرض لے کر بہت عمدہ سیٹ خرید کر تمہیں لا دیا "

"بڑا احسان کیا مجھ پر ——— وہ تو دراصل آپ اپنے دوستوں کے لئے لائے تھے ——— اُس میں سے دو پیالے کس نے توڑے تھے ——— ذرا یہ تو بتائیے ؟"

"ایک پیالہ تمہارے بڑے لڑکے نے توڑا ——— دوسرا تمہاری چھوٹی بچی نے "

"سارا الزام آپ ہمیشہ انہیں پر دھرتے ہیں ——— اچھا اب یہ بحث بند ہو ——— مجھے نہا دھو کر کپڑے پہننا اور جوڑا کرنا ہے "

"دیکھو، میں نے آج تک کبھی سخت گیری نہیں کی ۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا ہوں ۔ مگر آج میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم باہر نہیں جا سکتیں "

"اجی واہ ——— بڑے آئے، مجھ پر حکم چلانے والے ——— آپ ہیں کون ؟"

"اتنی جلدی بھول گئی ہو ——— میں تمہارا خاوند ہوں "

"میں نہیں جانتی، خاوند کیا ہوتا ہے ——— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں ——— میں باہر جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی ۔ دیکھتی ہوں، مجھے کون روکتا ہے "

"تم نہیں جاؤ گی ——— بس یہ میرا فیصلہ ہے "

"فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی "

"عدالت کا یہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے ——— میری سمجھ میں نہیں آتا، آج تم کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو ——— تنگ کی بات کہو ——— جاؤ نہاؤ تاکہ تمہارا دماغ کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے "

"آپ کے ساتھ رہ کر میں تو سر سے پیر تک برف ہو چکی ہوں "

"کوئی عورت، اپنے خاوند سے خوش نہیں ہوتی، خواہ وہ بیچارہ کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو ——— اُس میں کیڑے ڈالنا عورتوں کی سرشت میں داخل ہے ——— میں نے تمہاری کئی خطائیں اور غلطیاں معاف کی ہیں "

" میں نے خدانخواستہ کون سی غلطی کی ہے؟"

" پچھلے برس تم نے شلجم کی شب دیگ بڑے ٹھاٹ سے پکانے کا ارادہ کیا ——— شام کو چولہے پر ہنڈیا رکھ کر تم ایسی سوئیں کہ صبح اٹھ کر جب میں باورچی خانے میں گیا تو دیکھا کہ دیگچی میں سارے شلجم کوئلے بنے پڑے ہیں ——— ان کو نکال کر میں نے انگیٹھی سلگائی اور چائے تیار کی ——— تم سو رہی تھیں۔"

" میں یہ بکواس سننے کے لئے تیار نہیں۔"

" اس لئے کہ اس میں جھوٹ کا ایک ذرہ بھی نہیں ——— میں اکثر سوچتا ہوں کہ عورت کو سچ اور حقیقت سے کیوں چڑ ہے ——— میں اگر کہہ دوں کہ تمہارا بایاں گال تمہارے دائیں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ موٹا ہے، تو شاید تم مجھے ساری عمر نہ بخشو ——— مگر یہ حقیقت ہے، جسے شاید تم بھی اچھی طرح محسوس کرتی ہو ——— دیکھو یہ پیپر ویٹ وہیں رکھ دو ——— اٹھا کے میرا سر پر دے مارا تو تمہارا تھوڑا سا تصور ہی ہو جائے گا۔"

" میں نے پیپر ویٹ اس لئے اٹھایا تھا کہ یہ آپ کے چہرے کے عین مطابق ہے ——— اس کے اندر جو ہوا کے بلبلے سے ہیں، وہ آپ کی آنکھیں ہیں ——— اور یہ جو لال سی چیز ہے، وہ آپ کی ناک ہے، جو ہمیشہ سرخ رہتی ہے ——— میں نے جب آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ کی آنکھوں کے نیچے جو گالے کی آنکھیں ہیں، ایک کو کر دیج اوندھے منہ بیٹھا ہے۔"

" تمہارا جی ہلکا ہو گیا؟"

" میرا جی کبھی ہلکا نہیں ہوگا ——— مجھے آپ جانے دیجئے ——— تاکہ میں شاید یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں۔"

" جانے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ یہ جانا کس بنا پر ہے؟"

" میں بتانا نہیں چاہتی ——— آپ تو اوّل درجے کے بے شرم ہیں۔"

" بھئی، تمہاری اس ساری گفتگو کا مطلب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ——— معلوم نہیں تمہیں مجھ سے کیا شکایت ایک دم پیدا ہو گئی ہے؟"

" ذرا اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالئے۔"

" میرا کوٹ کہاں ہے؟"

" لاتی ہوں ——— لاتی ہوں۔"

" میرے کوٹ میں کیا ہو سکتا ہے ——— وسکی کی بوتل تھی ——— وہ تو میں نے باہر ہی ختم کر کے پھینک دی تھی ——— لیکن ہو سکتا ہے رہ گئی ہو۔"

" لیجئے، آپ کا کوٹ یہ رہا۔"

" اب میں کیا کروں؟"

" اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالئے ——— اور اس لڑکی کی تصویر نکالئے جس سے آپ آجکل عشق لڑا رہے ہیں۔"

" لاحول ولا ——— تم نے میرے اوسان خطا کر دیئے تھے ——— یہ تصویر، میری جان، میری بہن کی ہے، جس کو تم نے ابھی تک نہیں دیکھا ——— فرنٹیئر میں ہے ——— تم نے یہ خط نہیں دیکھا ——— ساتھ ہی تو تھا ——— یہ لو۔"

× × × × ×

" ہائے، کتنی خوبصورت لڑکی ہے ——— میرے بھائی جان کے لئے بالکل ٹھیک رہے گی۔"

ملاوٹ

(۱۹ مئی ۱۹۵۴ء)

امرتسر میں علی محمد کی منہاری کی دکان تھی۔ چھوٹی سی، مگر اُس میں ہر چیز موجود تھی۔ اُس نے کچھ اس قرینے سے سامان رکھا تھا کہ ٹھنسا ٹھنسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

امرتسر میں دوسرے دکاندار بلیک کرتے تھے، مگر علی محمد واجبی نرخ پر اپنا مال فروخت کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگ دُور دُور سے اُس کے پاس آتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتے۔

وہ مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ زیادہ منافع لینا اُس کے نزدیک گناہ تھا۔ اکیلی جان تھی، اُس کے لئے جائز منافع ہی کافی تھا۔

سارا دن دکان پر بیٹھتا، گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ اُس کو بعض اوقات افسوس ہوتا جب وہ کسی گاہک کو سنلائٹ صابن کی ایک ٹکیہ نہ دے سکتا، یا کیلی فورنین پوپی تیل کی بوتل۔ کیونکہ یہ چیزیں اُسے محدود تعداد میں ملتی تھیں۔

بلیک نہ کرنے کے باوجود وہ خوش حال تھا۔ اُس نے دو ہزار روپے پس انداز کر رکھے تھے۔ جوان تھا ——— ایک دن دکان پر بیٹھے بیٹھے اُس نے سوچا کہ اب شادی کر لینی چاہیئے ——— بڑے بڑے خیال دماغ میں آتے ہیں۔ شادی کر لوں کہ زندگی میں لطافت پیدا ہو جائیگی۔ بال بچے ہوں گے۔ اُن کی پرورش کے لئے میں اور زیادہ کمانے کی کوشش کروں گا۔

اُس کے والدین عرصہ ہُوا، اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اُس کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ شروع شروع میں، جب کہ وہ دس برس کا تھا، اُس نے اخبار بیچنے شروع کئے۔ اس کے بعد خوانچہ لگایا۔ قلفیاں بیچیں۔ جب اُس کے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا تو اُس نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے لی اور منہاری کا سامان خرید کر بیٹھ گیا۔

آدمی ایماندار تھا۔ اُس کی دکان تھوڑے ہی عرصے میں چل نکلی ——— جہاں تک آمدن کا تعلق تھا، وہ اس سے بے فکر تھا، مگر وہ چاہتا تھا کہ اپنا

گھر بسائے۔ اُس کی بیوی ہو، بچے ہوں، اور وہ اُن کے لئے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ اُس کی زندگی مشین ایسی بن گئی تھی۔ صبح دکان کھولتا۔ گاہک آتے، انھیں سودا دیتا، شام کو دکان بند کرتا اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جو اُس نے شریف پورہ میں لے رکھی تھی، سوہنے گنجے کا ہوٹل تھا۔ اس میں وہ کھانا کھاتا صرف ایک وقت۔ صبح ناشتہ جمیل سنگھ کے کٹڑے میں شاہ جی حلوائی کی دکان میں کرتا۔ دکان کھولتا اور شام تک اپنی گدی پر بیٹھا رہتا۔

اُس کے اندر شادی کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملے میں اُس کی مدد کون کرے۔ امرتسر میں اُس کا کوئی دوست یار بھی نہیں تھا جو اُس کے لئے کوشش کرتا۔

وہ بہت پریشان تھا۔ شریف پورہ کی کوٹھڑی میں رات کو سوتے وقت وہ کئی مرتبہ رو دیا کہ اُس کے ماں باپ اتنی جلدی کیوں مر گئے۔ اُنھیں اور کچھ نہیں تو اس لئے ضرور زندہ رہنا چاہیئے تھا کہ وہ اُس کی شادی کا بندوبست کر جاتیں۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شادی کیسے کرے۔ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اِس دوران میں اُس کے پاس تین ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اُس نے ایک چھوٹے سے گھر کو جو اچھا خاصا تھا کرائے پر لے لیا۔ مگر یہ بھی شریف پورے ہی میں تھا۔

ایک دن اُس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ شادی کے خواہش مند اصحاب ہم سے رجوع کریں۔ بی اے پاس، لیڈی ڈاکٹر، ہر قسم کے رشتے موجود ہیں۔ خط و کتابت کیجئے، یا خود آکے ملئے۔

اتوار کو وہ دکان نہیں کھولتا تھا۔ اُس دن وہ اُس پتے پر گیا اور اُس کی ملاقات ایک داڑھی والے بزرگ سے ہوئی۔ علی محمد نے اپنا مدعا بیان کیا۔ داڑھی والے بزرگ نے میز کا دراز کھول کر بیس پچیس تصویریں نکالیں اور اُس کو ایک ایک کر کے دکھائیں کہ وہ اُن میں سے کوئی پسند کرلے۔

ایک لڑکی کی تصویر علی محمد کو پسند آگئی۔ چھوٹی عمر کی اور خوبصورت تھی۔ اُس نے شادیاں کرانے والے ایجنٹ سے کہا "جناب ——— یہ لڑکی مجھے پسند ہے۔"

ایجنٹ مسکرایا "تم نے ایک ہیرا چن لیا ہے۔"

علی محمد کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ لڑکی اُس کی آغوش میں ہے۔ اُس نے گڑگڑانا شروع کر دیا "بس ——— جناب آپ بات پکی کر دیجئے۔"

ایجنٹ سنجیدہ ہو گیا "دیکھو برخوردار ——— یہ لڑکی جو تم نے چنی ہے، علاوہ حسین ہونے کے، ایک بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے ——— لیکن میں تم سے زیادہ فیس نہیں مانگوں گا۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے ——— میں یتیم لڑکا ہوں ——— اگر آپ میرا یہ کام کر دیں تو آپ کو ساری عمر اپنا باپ سمجھوں گا۔"

ایجنٹ کے مونچھوں بھرے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی "میں بیٹا سمجھتا ہوں ——— میں تم سے صرف تین سو روپے فیس لوں گا۔"

علی محمد نے بڑے متشکرانہ لہجے میں کہا "جناب کا بہت بہت شکریہ ——— یہ منظور ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے تین نوٹ سو سو روپے کے نکالے اور اُس بزرگوار کو دے دیئے۔

تاریخ مقرر ہو گئی۔ نکاح ہوا۔ رخصتی بھی ہوئی۔ علی محمد نے وہ چھوٹا سا مکان جو کرائے پہ لے رکھا تھا اب سجا سجایا تھا۔ وہ اس میں بڑے چاؤ سے اپنی دلہن

لے کر آیا۔ پہلی رات کا تصور معلوم نہیں، اُس کے دل و دماغ میں کس قسم کا تھا۔ مگر جب اُس نے دُولہن کا گھونگھٹ کانپتے ہاتھوں سے اُٹھایا تو اُس کو غش سا آگیا۔

نہایت بدشکل عورت تھی ——— صریحاً اُس مردِ بزرگ نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ علی محمد لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکل گیا اور شرلیف پورے جاکر اپنی کوٹھڑی میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ہُوا کیا ہے۔ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اُس نے اپنی دکان نرکھ لی ——— دو ہزار روپے وہ اپنی بیوی کا حق مہر اُسی رات ادا کر چکا تھا۔ تین سو روپے اُس ایجنٹ کو۔ اب اُس کے پاس صرف سات سو روپے تھے ——— وہ اِس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا شہر ہی چھوڑ دے۔ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ صبح دس بجے اُس نے اپنی دکان ایک شخص کے پاس پانچ ہزار روپے میں یعنی اَدنے پَونے داموں بیچ دی اور ٹکٹ کٹوا کر لاہور چلا گیا۔

لاہور جاتے ہوئے گاڑی میں کسی جیب کترے نے بڑی صفائی سے اُس کے تمام روپے غائب کر دیئے۔ وہ بہت پریشان ہُوا ——— لیکن اُس نے سوچا کہ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔

لاہور پہنچا تو اُس کی دوسری جیب میں جو کتری نہیں گئی تھی صرف دس روپے اور گیارہ آنے تھے۔ اِس سے اُس نے چند روز گذارہ کیا۔ لیکن بعد میں فاقوں کی نوبت آگئی۔

اِس دوران میں اُس نے کہیں نہ کہیں ملازم ہونے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا ——— وہ اس قدر مایوس ہو گیا کہ اُس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ مگر اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ اِس کے باوجود، ایک رات وہ ریل کی پٹڑی پر لیٹ گیا۔ ٹرین آ رہی تھی، مگر کانٹا بدلا اور وہ دوسری لائن پر چلی گئی کہ اُسے اُدھر ہی جانا تھا۔

اُس نے سوچا کہ موت بھی دھوکا دے جاتی ہے، چنانچہ اُس نے خودکشی کا خیال چھوڑ دیا اور ہلدی اور مرچیں پیسنے والی ایک چکّی میں بیس روپے ماہوار پہ ملازمت اختیار کر لی۔

یہاں اُسے پہلے دن ہی معلوم ہو گیا کہ دُنیا دھوکا ہی دھوکا ہے۔ ہلدی میں پیلی مٹی کی ملاوٹ کی جاتی تھی، اور مرچوں میں سُرخ اینٹوں کی۔

دو برس تک وہ اِس چکّی میں کام کرتا رہا۔ اُس کا مالک ہر مہینے کم از کم سات سو روپے ماہوار کماتا تھا۔ اس دوران میں علی محمد نے پانچ سو روپے پس انداز کئے تھے۔ ایک دن اُس نے سوچا، جب ساری دُنیا میں فریب ہی فریب ہے، تو وہ بھی کیوں نہ فریب کرے۔

اُس نے چنانچہ ایک علیحدہ چکّی قائم کر لی اور اُس میں مرچوں اور ہلدی میں ملاوٹ کا کام شروع کر دیا ——— اُس کی آمدن اب کافی معقول تھی۔ اُس کو شادی کا کئی بار خیال آیا، مگر جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس پہلی رات کا نقشہ آیا تو وہ کانپ کانپ گیا۔

علی محمد خوش تھا۔ اُس نے فریب کاری پُوری طرح سیکھ لی تھی۔ اُس کو اب اِس کے تمام گُر معلوم ہو گئے تھے۔ ایک من لال مرچوں میں کتنی اینٹیں پیسنی چاہئیں، ہلدی میں کتنی زرد رنگ کی مٹی ڈالنی چاہیئے۔ اور پھر وزن کا حساب، یہ اب اُس کو اچھی طرح معلوم تھا۔

لیکن ایک دن اُس کی چکّی پہ پولیس کا چھاپہ پڑا۔ ہلدی اور مرچوں کے نمونے بوتلوں میں ڈال کر مہر بند کئے گئے ——— اور جب کیمیکل اگزامینر کی رپورٹ آئی کہ اُن میں ملاوٹ ہے تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

اُس کا وہ تھا ہی کون جو اُس کی ضمانت دیتا ——— کئی دن حوالات میں بند رہا۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور اُس کو تین سو روپیہ جرمانہ اور ایک مہینے کی قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

جرمانہ تو اُس نے ادا کر دیا۔ لیکن ایک مہینے کی قید بامشقت اُسے بھگتنا ہی پڑی۔ یہ ایک مہینہ اُس کی زندگی میں بہت کڑا اور کٹھن تھا ———

اِس دوران میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ اُس نے بے ایمانی کیوں کی جبکہ اُس نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیا تھا کہ وہ کبھی فریب کاری نہیں کرے گا۔

پھر وہ یہ سوچتا کہ اُسے اپنی زندگی ختم کر لینی چاہیئے، اس لئے کہ وہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ اُس کا کردار مضبوط نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مر جائے تاکہ اُس کا ذہنی اضطراب ختم ہو۔

جب وہ جیل سے باہر نکلا تو وہ مضبوط ارادہ کر چکا تھا کہ خودکشی کر لے گا تاکہ سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو ——— اس غرض کے لئے اُس نے سات روز مزدوری کی اور دو تین روپے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کئے۔ اِس کے بعد اُس نے سوچا، کون سا زہر ہو گا جو کارآمد ہو سکتا ہے۔

اُس نے صرف ایک ہی زہر کا نام سُنا تھا جو بڑا قاتل ہوتا ہے ——— سنکھیا۔ مگر یہ سنکھیا کہاں سے ملتی؟

اُس نے بہت کوشش کی۔ آخر اُسے ایک دکان سے سنکھیا مل گئی۔ اُس نے عشا کی نماز پڑھی۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ وہ جلدی اور مرچوں میں ملاوٹ کرتا رہا۔ پھر رات کو سنکھیا کھائی اور فٹ پاتھ پر سو گیا۔

اُس نے سُنا تھا سنکھیا کھانے والوں کے منہ سے جھاگ نکلتے ہیں۔ تشنج کے دورے پڑتے ہیں۔ بڑا کرب ہوتا ہے، مگر اُسے کچھ بھی نہ ہوا۔ ساری رات وہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔

صبح اٹھ کر وہ اُس دکاندار کے پاس گیا، جس سے اُس نے سنکھیا خریدی تھی اور اُس سے پوچھا "بھائی صاحب، یہ آپ نے مجھے کیسی سنکھیا دی ہے کہ میں ابھی تک نہیں مرا؟"

دکاندار نے آہ بھر کے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا "کیا کہوں، میرے بھائی ——— آج کل ہر چیز نقلی ہوتی ہے ——— یا اُس میں ملاوٹ ہوتی ہے"

بس اسٹینڈ

۲۰ مئی ۵۲ء

وہ بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی لے روٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے پاس کئی مرد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک اُسے بہت بُری طرح گھور رہا تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہُوا کہ یہ شخص برمے سے اُس کے دل و دماغ میں چھید بنا رہا ہے۔

اُس کی عمر یہی بیس بائیس برس کی ہوگی۔ لیکن اِس پختہ سالی کے باوجود وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے پر اِس کے باوجود اُس نے کئی رتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ بس اسٹینڈ سے چلی جائے۔ کوئی تانگہ لے لے، یا واپس اپنی سہیلی کے پاس چلی جائے۔

اُس کی یہ سہیلی نئی نئی بنی تھی۔ ایک پارٹی میں اُن کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گرویدہ ہو گئیں ——— یہ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی س نئی سہیلی کے بلاوے پر اُس کے گھر آئی تھی۔

نوکر بیمار تھا، مگر جب اِس سہیلی نے اتنا اصرار کیا تھا، تو وہ اکیلی ہی اُس کے ہاں چلی گئی۔ دو گھنٹے آپس میں گپ لڑاتی رہیں ——— یہ وقت بڑے زے میں کٹا۔ اُس کی سہیلی جس کا نام شاہدہ تھا، اُس سے جاتے وقت کہا "سلمیٰ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔"

سلمیٰ شرما سی گئی "کیسی باتیں کرتی ہو شاہدہ ——— مجھے شادی نہیں کرانا ہے۔"

"تو کیا ساری عمر کنواری رہو گی؟"

"کنواری رہنے میں کیا برا ہے۔"

شاہدہ مسکرائی "میں بھی یہی کہا کرتی تھی ——— لیکن جب شادی ہو گئی تو دُنیا کی تمام لذتیں مجھ پر آشکارا ہو گئیں ——— یہی تو عمر ہے جب آدمی صحیح طرح شادی کی لطافتوں سے حظ اُٹھا سکتا ہے ——— تم میرا کہا مانو ——— بس، ایک دو مہینے کے اندر اندر دلہن بن جاؤ ——— تمہارے ہاتھوں

میں منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی:

''جاؤ، اس چھیڑ خانی کو۔''

شاہدہ نے سلمیٰ کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی ''یہ چھیڑ خانی ہے؟ ——— اگر یہ چھیڑ خانی ہے، تو ساری دُنیا چھیڑ خانی ہے ——— مرد اور عورت کا رشتہ بھی فضول ہے ——— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایک ازلی اور ابدی رشتے سے منکر کیوں ہو؟ ——— دیکھو، اگر کنواری مرد کے بغیر کیسے زندہ رہو گی ——— خدا کی قسم پاگل ہو جاؤ گی ——— ہاں!''

''اچھا ہے، جو پاگل ہو جاؤں ——— کیا پاگلوں کے لیے اس دُنیا میں کوئی جگہ نہیں ——— اتنے سارے پاگل ہیں، آخر وہ جوں توں جی رہے ہیں۔''

''خیر تو میں تجھے یہی کہنا چاہتی ہوں پیاری سلمیٰ ——— میں تجھ سے کہتی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوئی ہے، میری کایا ہی پلٹ گئی ہے ——— میرا خاوند بہت پیار کرنے والا ہے۔''

''کیا مارتے ہیں؟''

''مجھ سے محبت کرتے ہیں ——— یہی اُن کا کام ہے ——— ویسے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ——— میرا خاوند، خدا اُن کو ... نے مجھ کو تنگ ہونے نہیں دیا۔''

سلمیٰ نے یوں محسوس کیا کہ اُس کا دل تنگ ہو گیا ہے۔ کہنے لگی ''شاہدہ، مجھے تنگ نہ کرو، مجھے شادی نہیں کرنا ہے ——— مجھے مردوں سے نفرت ہے۔''

''کیوں؟''

''بس ہے!''

''اب میں تم سے کیا کہوں ——— مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی، لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاوند نے پیار و محبت کیا تو میں نے پہلی مرتبہ جانا کہ مرد، عورت کے لیے کتنا لازمی ہے۔''

''ہوا کرے ——— مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

شاہدہ ہنسی ''سلمیٰ، ایک دن تم ... ورنہ تم اس بات کی قائل ہو جاؤ گی کہ مرد، عورت کے لیے لازمی ہے ——— اُس کے بغیر وہ ایسی گاڑی ہے جس کے پہیے نہ ہوں ——— میری شادی کو ایک برس ہوا ہے۔ اس ایک برس میں مجھے جتنی مسرتیں اور راحتیں میرے خاوند نے پہنچائی ہیں، میں بیان نہیں کر سکتی ——— خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے ——— فرشتہ، مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔''

سلمیٰ نے یہ سن کر یوں محسوس کیا کہ جیسے اُس کے سر پر فرشتوں کے پر پھڑپھڑا رہے ہیں ——— اُس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید مرد، عورت کے لیے لازمی ہو ——— لیکن فوراً بعد اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اُس کی عقل نے اُس کا ساتھ نہیں دیا ——— مرد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا عورت اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

بیشک شاہدہ نے اُس کو بتایا تھا کہ اُس کا شوہر بہت پیار کرنے والا ہے، بہت نیک خصلت ہے ——— لیکن اس سے یہ ثابت تو نہیں

چنانچہ وہ شاہدہ کے سسرال چلی گئی

سلمیٰ حسین تھی، [illegible] بھرے بھرے بازو، کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لمبے کالے بال [illegible] اور اس کا چہرا۔ تاہ

جب وہ اپنی سہیلی سے اجازت مانگ کر غسل خانے میں گئی تو اس نے آئینے میں خود کو بڑے غور سے دیکھا اور [illegible] اب

[illegible] جسم [illegible] ابھار [illegible] لئے ہیں ـــــ قدرت کی ساری کاریگری غارت جا رہی ہے۔

"[illegible] پیدا ہوتا ہے، تو آدمی اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں ـــــ اس کی جوانی بھی تو کسی کھیت میں اگی تھی ـــــ اگر اسے کوئی کھانے کا نہیں، تو کل مرجھا جائے گی!"

وہ بہت دیر تک غسل خانے میں آئینے کے سامنے سوچتی رہی۔ اس کے ذہن میں اس کی سہیلی کی تمام باتیں گونج رہی تھیں ـــــ مرد عورت کے لئے بہت ضروری ہے ـــــ!

اس کا خاوند اس سے بہت پیار کرتا ہے۔

وہ فرشتہ ہے۔

سلمیٰ نے ایک لمحے کے لئے محسوس کیا کہ اس کی شلوار اور اس کا دوپٹہ فرشتوں نے پہن لئے ہیں ـــــ وہ گھبرا گئی اور جلدی فارغ ہو کر باہر نکل آئی۔

باہر برآمدے میں تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ سلمیٰ کو ایسا لگا کہ یہ بھی فرشتے ہیں جو بھیس بدل کر آئے ہیں۔

پھر جب اس کی سہیلی اپنی کوٹھی سے ملحقہ باغ میں اسے لے گئی اور وہاں اس نے چند تتلیاں دیکھیں تو وہ بھی اسے فرشتے دکھائی دیئے ـــــ لیکن اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگین اور ایسے ننھے منے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں۔

اسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے، جو اس کے قریب آتے، اس سے پیار کرتے۔ اس کا منہ چومتے، اس کے سینے پر ہاتھ پھیرتے، جس سے اس کو بڑی راحت ملتی۔ لیکن وہ ان فرشتوں کے ہاتھ بڑی تندی سے ایک طرف جھٹک دیتی اور ان سے کہتی "جاؤ ـــــ چلے جاؤ یہاں سے ـــــ تمہارا گھر تو آسمان پر ہے ـــــ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

وہ فرشتے اس سے کہتے "ہم فرشتے نہیں ـــــ حضرت آدم کی اولاد ہیں ـــــ وہی آدم جو جنت سے نکالے گئے تھے ـــــ ہم تمہیں پھر جنت میں پہنچا دینے کا وعدہ کرتے ہیں ـــــ چلو ہمارے ساتھ۔ وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور شہد کی بھی۔"

سلمیٰ نے یوں محسوس کیا کہ اس کے سینے میں سے دودھ کے ننھے ننھے قطرے نکلنے شروع ہو گئے ہیں، اور اس کے ہونٹ مٹھاس میں چھپے ہوئے ہیں۔

شاہدہ، اس سے بار بار اپنے خاوند کی تعریف کرتی۔ اصل میں اس کا مدعا یہ تھا کہ وہ اس کے بھائی کے ساتھ سلمیٰ کا رشتہ قائم کر دے ـــــ مگر کیونکہ یہ پہلی ملاقات تھی، اس لئے وہ کھل کے بات نہ کر سکی۔ بہر حال اس نے اشاروں کنایوں میں سلمیٰ پر یہ واضح کر دیا کہ اس کا خاوند جو بہت شریف اور محبت کرنے والا آدمی ہے، اس کا بھائی اس سے بھی کہیں زیادہ شریف النفس ہے۔

سلمیٰ نے یہ اشارہ نہ سمجھا، اس لئے کہ وہ بہت سادہ لوح تھی۔ اُس نے صرف اتنا کہہ دیا۔ "آجکل کے زمانے میں شریف آدمیوں کا ملنا محال ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا خاندان مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے۔"

"افسوس ہے کہ اس وقت میرے شاوند گھر میں موجود نہیں، ورنہ میں تم سے انہیں ضرور ملاتی۔"

"کبھی پھر سہی ——— کیا کام کرتے ہیں وہ"

"ہائے، انہیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے ——— لاکھوں روپے کی جائیداد ہے ——— مکانوں اور دکانوں سے کرایہ ہی ہر مہینے دو ہزار کے قریب وصول ہو جاتا ہے ——— اس کے علاوہ ماشاءاللہ زمینیں ہیں۔ وہاں کی آمدن الگ ہے ——— اناج کی کوئی دقّت نہیں ——— منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے ——— چاول بھی ——— ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میسر ہو سکتی ہے ——— اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے ——— اُن کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے، زراعت کے متعلق جانے کیا سیکھ رہا ہے ——— ایک مہینے تک واپس آرہا ہے ——— وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے ——— تم اُسے دیکھوگی ——— تو ———"

سلمیٰ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں، ہاں ——— جب وہ آئیں گے تو اُن سے ملنے کا اتفاق ہو جائے گا"

شاہدہ نے کہا "بڑا شریف لڑکا ہے ——— بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند"

"جی ہاں ——— ضرور ہوگا، آخر شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے"

"وہ بس آنے ہی والا ہے ——— تم مجھے اپنی ایک تصویر دے دو"

"کیا کروگی؟"

"بس شہد لگا کے چاٹا کروں گی"

یہ کہہ کر شاہدہ نے سلمیٰ کا منہ چوم لیا اور پھر اپنے خاوند کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سلمیٰ تنگ آگئی۔ اُس نے تھوڑی دیر کے بعد کوئی بہانہ بنا کر رخصت چاہی اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی، جہاں اسے "لے رُوٹ" کی بس پکڑنا تھی۔

وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرد نے اسے بہت بُری نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیا ——— وہ پریشان ہو گئی۔ جاڑوں کے دن تھے، مگر اُس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

اسٹینڈ پر ایک بس آئی۔ اُس نے اُس کا نمبر نہ دیکھا اور جب چند مسافر اُترے تو وہ فوراً اس میں سوار ہو گئی ——— وہ آدمی بھی اُس بس میں داخل ہو گیا۔ اُس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ بس کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی، جس کے باعث اُسے رُکنا پڑا۔ سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ اُتر جائیں، کیونکہ کافی دیر تک یہ بس نہیں چل سکے گی۔

سلمیٰ نیچے اُتری تو وہ آدمی جو اُسے بہت بُری طرح گھور رہا تھا، وہ بھی اُس کے ساتھ باہر نکلا ——— سڑک پر ایک کار جا رہی تھی، اُس نے اُس کے ڈرائیور کو آواز دی "علم دین"

اسی وقت موٹر ایک دم رُک گئی۔ اُس آدمی نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اُس سے کہا "چلیے — یہ میری اپنی کار ہے — جہاں بھی آپ جانا چاہتی ہیں میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

سلمیٰ انکار نہ کر سکی۔ موٹر میں بیٹھ گئی۔ اُس کو ماڈل ٹاؤن جانا تھا مگر وہ اُسے کہیں اور لے گیا — اور —!

× × × × ×

سلمیٰ نے محسوس کیا کہ مرد واقعی عورت کے لئے لازم ہوتا ہے — اُس نے اپنی زندگی کا بہترین دن گزارا — گو اُس نے پہلے بہت جیل و حجت اور احتجاج کیا، مگر اُس آدمی نے اُسے رام کر ہی لیا —!

تین چار گھنٹوں کے بعد جب سلمیٰ نے اُس شخص کا بٹوہ کھول کر یونہی دیکھا تو اُس میں ایک طرف شاہدہ کا فوٹو تھا — اُس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا "یہ — یہ — عورت کون ہے؟"

اُس شخص نے جواب دیا "میری بیوی۔"

سلمیٰ کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی "آپ کی بیوی؟"

شاہدہ کا خاوند مسکرایا "کیا مردوں کی بیویاں نہیں ہوتیں؟"

نعیمہ

(۲۱ر مئی ۵۴ء)

تالیوں کے شور میں پرنسپل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلبا اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے ۔

یہ رسم جب سے ، میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں ۔ ہر سال باقاعدہ ادا کی جاتی ہے ۔ ہر سال اس موقعے پر تالیوں کے شور کے درمیان میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی ۔ تمھیں دیکھ کر میرے دل میں وہی جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے آغاز میں ہوئے تھے ——— آج جب میں نے غور کیا ہے تب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹر ہوں اور کالج کی یہ بلڈنگ بہت بڑا ڈاک خانہ ۔ تم سب خطوط ہو جو کچھ دیر اس بلڈنگ میں رہ کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیئے جاتے ہو ——— تم میں سے کچھ بیرنگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمھارے والدین کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے ۔ کچھ غلط ایڈریس کی وجہ سے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں ۔ بہرحال یہ کھیل ہے بہت دلچسپ ——— ہر سال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے ——— اس میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں ، کچھ ناکام ——— مسرت اور رنج کی ملی جلی لہریں میں ہر سال دیکھتا ہوں ۔ اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں جو کامیابی کے باعث تمتما رہے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ میں چند ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو ناکامی کے صدمے سے مرجھائے ہوئے ہیں ——— خزاں اور بہار کا یہ ادلا بدلا موسم ہر سال آتا ہے اور گذر جاتا ہے ——— وہ لڑکیاں اور لڑکے جو بی ۔ اے کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی بڑے کالج میں داخل ہو جائیں گے یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دنیوی کاموں میں مصروف ہو جائیں گے ۔ وہ جو اس امتحان کی دیوار نہیں پھاند سکے ، دوبارہ کوشش کریں گے ——— جو یہاں سے جا رہے ہیں ، ان کو میں الوداع کہتا ہوں اور ان کی کامیاب زندگی کے لئے دعا کرتا ہوں ۔ جو نئے آئے ہیں ، میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کے فائدے کے لئے کہتا ہوں کہ اس تعلیم گاہ میں داخل ہوتے وقت ان لوگوں کو ایک نظر ضرور دیکھ لیں جو باہر جا رہے ہیں ——— جو خواہش کے باوجود اپنی کمزوریوں کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے ۔ خاص طور پر نعیمہ سے جو محنت کرنے کے باوجود اس سال بھی امتحان میں

کامیاب نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں —— خدا کرے آئندہ سال نعیمہ کامیاب ہو جائے۔"

تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ برخواست ہو جاتا ہے۔

کالج کی لڑکیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ذکیہ۔ فرخندہ —— کیا نعیمہ ہال میں موجود تھی۔

فرخندہ۔ نہیں تو۔

ذکیہ۔ تو پھر وہ آئی ہی نہیں۔

فرخندہ۔ بے چاری غم سے نڈھال ہو گی۔

ذکیہ۔ ایک بار فیل ہونے ہی سے دل کی کلی مرجھا جاتی ہے۔ وہ بے چاری تو دو مرتبہ فیل ہوئی ہے۔

فرخندہ۔ محنت تو بے حد کرتی تھی۔

ذکیہ۔ اصل میں یہ سب اس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے ... کسی سے مدد لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ امتحان شروع ہونے سے دو مہینے پہلے میں نے کئی بار اس سے کہا نعیمہ تم میرے گھر آجایا کرو میں تمہیں ساری اکنامکس ازبر کرا دوں گی —— بس یہ سنتے ہی جیسے اس کے مرچیں لگ گئیں —— کہنے لگی تم اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہو۔ تمہاری مدد کے بغیر کیا اکنامکس کسی کو آ ہی نہیں سکتی —— میں تو اندھی ہوں۔ بیوقوف ہوں۔ اب واحد ذہین تم ہی بنا دی گئی ہو ... میں نے تو اپنی مدد پیش کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکنامکس میں بالکل صفر ہے —— بس دماغ جو ایسا پایا ہے کوئی اچھی بات بھی کرے تو اسے بری لگتی ہے۔

فرخندہ۔ میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔ میں نے کہا دیکھو نعیمہ ایسا نہ ہو تمہارا سال ضائع جائے پھر مزہ رہ جائے۔ کہو تو میں اپنے نوٹ تمہیں دے دوں۔ بس یہ سنتے ہی آگ بگولا ہونے لگی۔ نوٹ کی تو اس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب سے کچھ نہ سمجھ سکے۔ ویسے بازار میں عام بکتے ہیں۔ کوئی اتنی بڑی ... تم غرض تو نہیں ہوتی —— بس وہ دن اور یہ دن۔ میری زبان جلے جو میں نے پھر اس سے ایسی بات کی ہو۔

جمیلہ۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو۔

ذکیہ۔ پہنچ وری کی بات نہیں جمیلہ —— ہمارا دل پتھر کے تو نہیں۔ اس کو دیکھ کر کیسے ... نہیں ہوتا —— اور ایسے لمحات میں منہ سے ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے۔

فرخندہ۔ پہلے سے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں —— کاٹنے کو دوڑتی ہے اگر اس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے۔

ذکیہ۔ جانے اس کے مزاج میں تلخی کہاں سے آ گئی۔

جمیلہ۔ سچ پوچھو تو سب وجہ یہ ہے کہ بے چاری مفلس ہے۔ لیکن اگر اس سے کہو نعیمہ تم ہر روز یہ سبز ساڑھی ہی کیوں پہنتی ہو تو بگڑ کر جواب دے گی۔ میرے پاس ایک نہیں ایسی کئی ساڑھیاں ہیں۔ مجھے یہ رنگ پسند ہے۔

فرخندہ۔ سر پر تیل ایسا واہیات ہے کہ اس کی بدبو سے ناک پھٹ جاتی ہے۔ اس سے پوچھو تو کہے گی۔ یہ خاص تیل ہے۔ اس سے بال لمبے ہوتے ہیں۔

جمیلہ ۔ بیچاری کی بچی ۔

ذکیہ ۔ نہیں جمیلہ ایسا نہ کہو اُس کا آشیانہ پن دُور ہو جائے تو اُس جیسی اچھی سہیلی تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے ۔

لڑکیوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک لڑکا اَنوَر اُدھر سے گذرا ۔ کافی خوبصورت تھا ۔ اُس نے سب سے پوچھا "کیا باتیں ہو رہی ہیں ؟"

ذکیہ ۔ ہم نعیمہ کا ذکر کر رہے تھے ——— آپ دوستوں وغیرہ سے مل چکے ۔

انور ۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا ۔ البتہ نعیمہ سے مل کے آ رہا ہوں ۔

فرخندہ ۔ کہاں ہے وہ ؟

انور ۔ باہر باغ میں ۔

جمیلہ ۔ چلو دیکھ چلیں ۔

انور ۔ نہیں ۔ اِس وقت آپ اُس کے پاس نہ جائیں ۔ اُس کی طبیعت بے حد مغموم ہے ——— کسی نے اُس کو ذرا بھی چھیڑا تو آفت برپا ہو جائیگی ۔

ذکیہ ۔ یہ بڑی مصیبت ہے ۔ اب اگر کوئی اُس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے ۔

انور ۔ بس ، خاموش رہے ۔

ذکیہ ۔ کیسے ۔

انور ۔ بالکل میری طرح ——— باغیچے کی طرف میرا گذر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ بینچ پر بیٹھی ہے اور اُس کی آنکھوں میں نامکمل آنسو ہیں ——— میرے قدم رُک گئے ——— اُس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف ۔ اُس کے نامکمل آنسو تکمیل کی آرزو میں تڑپا کئے ——— اور میں یہاں چلا آیا ۔

ذکیہ ۔ تو مجھے اُس کے پاس نہیں جانا چاہیئے ؟

انور ۔ وہ اِس وقت غضبناک حالت میں ہے ۔ ناکامیوں کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے جنہیں ضرورت سے زیادہ خود پر اعتماد ہوتا ہے ——— دراصل میں کوشش کے باوجود نعیمہ کو نہیں سمجھ سکا ۔

ذکیہ ۔ لیکن کلاس میں اُس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے ۔

انور ۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری ہمدردی کو روندتی رہی ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ اِس لڑکی کا انجام کیا ہوگا ۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر دُبلی ہو گئی ہے ۔ اُس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں ——— میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے پُراسرار محاذ پر لڑتی لڑتی تنہا ماری جائے گی ۔

یہ کہہ کر اَنوَر اُن لڑکیوں سے رخصت لے کر چلا گیا ——— اُس کے قدم غیر ارادی طور پر اُسے باغیچے کی طرف لے گئے ۔ نعیمہ بینچ پر بیٹھی تھی ۔ اَنوَر اُس کے پاس پہنچا ۔

انور۔ نعیمہ ——— کیا میں تمہارے پاس آسکتا ہوں؟

نعیمہ۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔

انور۔ تم یہاں بہت دیر کی بیٹھی ہو۔

نعیمہ۔ کہتے ہو تو اٹھ کے چلی جاتی ہوں۔

انور۔ یہ کیسی باتیں کرتی ہو ——— میں پوچھتا ہوں تنہائی میں تم کیا بالکل نہیں گھبراتی ہو۔

نعیمہ۔ کیسی تنہائی ——— میں بالکل تنہا نہیں۔

انور۔ ہاں، اب تم تنہا نہیں ہو۔

نعیمہ۔ اس سے پہلے بھی تنہا نہیں تھی ——— تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی تنہا نہیں ہوں گی ——— تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے ——— تم کیا سب، کے سب ——— مجھ میں کیا نقص ہے ——— کیا خرابی ہے جو دوسروں کے دل میں خواہ مخواہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ——— ہمدردی ——— جاؤ اس ہمدردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

انور۔ تم نے رونا شروع کر دیا۔

نعیمہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم ——— میں تو ہنس رہی ہوں ——— تم سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں۔ بے یار و مددگار ہوں ——— اسی لئے تم مجھے اپنی ہمدردی کے سوکھے ٹکڑے دیتے ہو ——— میں یہ بھیک نہیں لینا چاہتی ——— جاؤ ——— جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ۔

انور محسوس کرتا ہے کہ اگر اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی تو شاید نعیمہ کا دماغی توازن بگڑ جائے، اس لئے وہ خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ نعیمہ پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیتی ہے، مگر کوئی آواز پیدا نہیں کرتی۔

انور اپنے گھر چلا گیا۔ وہ اکثر نعیمہ کے بارے میں سوچتا۔ اس نے کئی بار اس کو خط لکھے، مگر اس کو اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا، اس لئے پھاڑ دیئے۔

ایک دن وہ باہر برآمدے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا ——— یہ نعیمہ کا تھا جس میں صرف ایک سطر تھی ——— "مسٹر انور ——— میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

انور سخت گھبراہٹ میں اٹھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی موٹر لی۔ خط میں ایڈریس موجود تھا۔ وہاں پہنچا۔

اندھیرا اور غلیظ سا کمرہ تھا ——— انور کو کچھ نظر نہ آیا۔

انور۔ نعیمہ، نعیمہ ——— کہاں ہو تم۔

نعیمہ۔ آجاؤ ——— ادھر میرے پاس آجاؤ۔

اب اندھیرے میں انور کو سجھائی دینے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چارپائی پر نعیمہ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نعیمہ۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہے اس غلیظ کمرے کو دیکھ کر ——— اسے نہ دیکھو۔ یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے تمہیں حیرت ہو گی ——— سب سے بڑی حیرت انگیز

چیز تو میں ہوں ——— مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہونا چاہو ہو لو۔

انور ۔ یہ کیا ہو گیا تمہیں ؟

نعیمہ ۔ انور میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے ——— سینے اور پتواروں کے بغیر اسے کئی برس کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی ——— انور ——— کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی ؟ ——— تم بولتے کیوں نہیں۔

انور ۔ میں سن رہا ہوں "

نعیمہ ۔ میں اپنی اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے لئے ادھر ادھر سے چیتھڑے اکٹھے کر کے بادبان بناتی رہی، لیکن طوفانوں نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر پھاڑ دیا ——— انور، مجھے بتاؤ۔ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں ؟

انور ۔ طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نعیمہ۔

نعیمہ ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ——— میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں، صرف اس لئے کہ بی۔ اے کا امتحان پاس کر لوں اور خود کمانے کے قابل ہو جاؤں ——— لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں بیٹھا ہے۔

نعیمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ انور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نعیمہ ۔ میں مر رہی ہوں انور، اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا ——— اب ایسا کرنا کہ میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں اور یہ سلدی کتاب اٹھا کر میرے ساتھ ہی دفن کر دینا ——— ممکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ مہنگی ملیں ——— میں نے بڑی مصیبتوں سے خریدی تھیں ——— اور دیکھو کسی اور کو میری موت کی خبر نہ ہو ——— مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا ——— میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔"

انور نے دیکھا کہ اس پر حالت نزاع طاری ہے ——— اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ نعیمہ نے جس کی آنکھیں مندی رہی تھیں، بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور انور کے آنسو اپنے میلے دوپٹے سے پونچھے اور کہا "مجھے یاد آ گیا ہے ——— جو مجھے تم سے کہنا تھا :

انور ۔ "کیا کہنا تھا "

نعیمہ مسکرائی " ایک بے وقوفی کی بات ہے ——— اپنے ہونٹ میرے مردہ ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔

انور نے اس کی تعمیل کی ——— نعیمہ کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کی تاب نہ لا سکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے سپرد کر دیا۔

بدتمیزی

(۲۲ مئی ۵۴ء)

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔"

"جب کوئی بات سمجھ ہی نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔"

"آپ تو بس ہر بات پہ گلا گھونٹ دیتے ہیں ——— آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کہنا کیا چاہتی ہوں۔"

"اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی ——— تم بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔"

"لڑائی میں مول لینا چاہتی ہوں کہ آپ ——— سارے ہمسائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔"

"خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں نے تم سے کوئی تلخ بات کی ہے نہ شیریں۔"

"شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے ——— نوکر کو آواز دے کر بلائیں گے، تو سارے محلے کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اُسے گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔"

"میرے پاس بندوق ہی نہیں ——— دیکھو میں خرید سکتا ہوں، مگر اس کو چلائے گا کون؟ ——— میں تو پٹاخے سے ڈرتا ہوں۔"

"آپ بنئے نہیں ——— میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں ——— یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔"

"اب میں فراڈ ہو گیا؟"

"آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے ———"

"یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا؟"

"آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے، تو کیا آپ نے اپنے ابا جی کی جیب سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟"

"نکالے تھے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی"

"بھنگی کی لڑکی سے آپ کو اتنی ہمدردی کیوں تھی؟"

"اس لئے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی ـــــ بہت بیمار ـــــ والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسہ بھی اُسے نہ دیتے ـــ میں نے اسی لئے مناسب سمجھا کہ اُن کے کوٹ سے دو روپے نکال کر اُس کو دے دوں ـــــ یہ کوئی گناہ نہیں"

"جی ہاں ـــ بہت بڑا ثواب ہے ـــــ باپ کے کوٹ پر چھاپہ مار کر آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں اپنی سیٹ بک کرا چکے ہوں گے، لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی کڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی"

"طبیعت تو میری یہاں ہر روز صاف کی جاتی ہے ـــــ اب اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کیچڑ میں لت پت کر دوں، تاکہ تمہارا مشغلہ جاری رہ سکے"

"کیچڑ میں تو آپ ہر وقت تھڑے رہتے ہیں"

"یہ سراسر بہتان ہے"

"بہتان کیا ہے ـــ حقیقت ہے ـــــ آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں ـــــ آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں۔ بات کریں گے تو غلاظت کی ـــــ نہاتے آپ نہیں"

"غضب خدا کا ـــ میں تو دن میں تین مرتبہ نہاتا ہوں"

"وہ بھی کوئی نہانا ہے ـــ بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈالے ـــــ تولئے سے اپنا نیم خشک جسم پونچھا اور غسل خانے سے باہر نکل آئے ـــــ"

"دو ڈونگے تو نہیں، کم از کم بیس ہوتے ہیں"

"تو ان سے بھی کیا ہوتا ہے ـــــ کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟"

"میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ صابن جلد کے لئے بہت مضر ہے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس میں ایسے تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے ہیں"

"میری جلد کا تو آج تک ستیاناس نہیں ہوا ـــــ آپ کی جلد بہت ہی نازک ہوگی"

"نازک ہونے کا سوال نہیں ـــــ یہ ایک سائنٹیفک بحث ہے ـــــ"

"میں سائنٹیفک وائنٹیفک کچھ نہیں جانتی ـــــ بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟"

"بھئی، تمہیں بتا تو چکا ہوں کہ یہ مضر ہے۔"

"تو پھر آپ نہاتے کس طرح ہیں؟"

"نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ـــــ پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے۔"

"جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملتے ـــــ میرا مطلب ہے، صابن نہیں تو کوئی اور چیز۔"

"ملا کرتا ہوں۔"

"کیا؟"

"بیسن۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ارے بھئی، چنے کا آٹا۔"

"آپ کی جو بات ہے، نرالی ہے ـــــ میں تو آپ ایسے سنکی سے خدا قسم تنگ آ گئی ہوں ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں جاؤں۔"

"اپنے میکے چلی جاؤ ـــــ وہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔"

"میں کیوں جاؤں وہاں ـــــ میں یہیں رہوں گی۔"

"میں نے تم سے آج ہی کہا ـــــ اس لئے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے یہ دھمکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔"

"مجھے جب جانا ہو گا، چلی جاؤں گی۔"

"آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟"

"آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی ـــــ اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقین مانو، تم ابھی تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔"

"کوشش کر کے دیکھ لیجئے ـــــ میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہٹوں گی ـــــ یہ میرا گھر ہے۔"

"آپ کا ہے ـــــ آپ کے باپ دادا کا ہے ـــــ لیکن یہ تو بتائیے ـــــ"

"میرے باپ دادا کا نام مت لیجئے ـــــ اُن بیچاروں کا کیا قصور تھا؟"

"قصور تو سارا میرا ہے ـــــ لیکن بیگم، تم نے کبھی اتنا تو غور کر لیا کہ میں نے آخر تمہیں کون سا جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔"

"لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے ـــــ میں تو اُسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔"

"تم بڑے سے بڑا گرز اُٹھا سکتی ہو ـــــ تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے ـــــ تم عقاب ہو ـــــ تمہارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔"

"باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے —— آپ بچڑ کیا ہیں —— سبحان اللہ۔ جب کڑکتے اور گرجتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔"

"اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔"

"کیا دیکھوں؟ —— پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔"

"یہ خاکسار شیر ہے کیا؟"

"شیر ہے، مگر خاک میں لپٹا ہوا۔"

"اس تعریف کا شکریہ —— اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہنا کیا چاہتی تھیں۔"

"آپ اتنے لائق فائق بنے پھرتے ہیں —— سمجھئے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔"

"تمہاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے —— میں کیا سمجھوں گا۔"

"خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟"

"خدا اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بڑے آئے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔"

"خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں —— وہ طاقت جو دنیا پر کنٹرول کرتی ہے۔"

"کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔"

"کس قسم کا؟"

"ہر قسم کا —— میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی —— کپڑے لیتا ہوں، تو اس میں آپ کی مرضی کو دخل ہوتا ہے —— کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے —— آج یہ پکے، کل وہ پکے ——"

"اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض کیوں نہیں —— میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ اوجھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔"

"اوجھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے؟"

"آپ کیا جانیں، کتنی مزیدار ہوتی ہے —— چونے میں ڈال کر اسے صاف کیا جاتا ہے، اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے —— اللہ قسم مزا آجاتا ہے۔"

"لاحول ولا —— میں ایسی غلیظ چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"اور ٹینڈے؟"

"بکواس ہیں —— سبزی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ ان میں کوئی رس ہوتا ہے نہ مزہ —— بس منڈ منڈے سے ہوتے ہیں —— میری سمجھ میں نہیں

تاکہ وہ پیدا اس غرض کے لیے کئے گئے تھے ——— نہایت واہیات ہوتے ہیں —— میں تو اکثر یہ دُعا مانگتا ہوں کہ اُن کا وجود سرے ہی سے غائب ہو جائے —— بڑے بے جان ہوتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں کدّو بدرجہا بہتر ہے، حالانکہ وہ بھی مجھے سخت ناپسند ہے"

" آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟ ——— ہر اُس چیز میں آپ کیڑے ڈالتے ہیں —— بھنڈی آپ کو پسند نہیں کہ اُس میں لیس ہوتی ہے —— توری آپ کو نہیں بھاتی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے ——— ٹماٹر آپ کو اچھے نہیں لگتے، اس لئے کہ اُن کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے"

" تم ان باتوں کو چھوڑو —— ٹھنڈے —— اگر کچھ اور بات بڑھا کر جھگڑا ہوں ——— تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں"

" کچھ بھی نہیں ——— بس ایسے ہی آ گئی —— میں نے دیکھا آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آ کے بیٹھ گئی"

" بڑی نوازش ہے آپ کی ——— لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہوگا آپ کو"

" آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو آپ کا حاصل کیا ہوگا"

" چونکہ آپ کو حاصل ہونا ہے، آج ہی آپ سے آج ہی حاصل ہو جائے گا ——— آپ یہاں سے کچھ حاصل کئے بغیر ٹلیں گی کیسے؟"

" میں آپ سے ایک خاص بات کہنے آئی تھی"

" کیا؟"

" یہی ——— یہی کہنے آئی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟"

" آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے"

" آپ کو تو خدا سمجھائے گا ——— میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں ... گلی میں ... ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے۔ یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے"

———————————

قادر قصائی

(۲۴ مئی ۵۴ء)

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی ماں زہرہ جان نے اُس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی۔ بڑی دور دور سے رئیس اُس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ زہرہ جان کو ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اُس سے محبت ہو گئی۔ اُس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اُس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اُس کے پاس آتا اور رات ٹھہر کر صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں، ان کا یہ بیان ہے کہ اُس کا چاہنے والا ایک بڑھئی تھا۔ مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بے چارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا، مگر وہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا، لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا:۔

"زہرہ جان ——— میں غریب آدمی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کرتے ہیں ——— لیکن تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے ——— میں تم سے محبت کرتا ہوں ——— معلوم نہیں کیوں۔"

زہرہ جان ہنسی۔ اس ہنسی سے بڑھئی کا دل مجروح ہو گیا۔ "تم ہنستی ہو ——— میری محبت کا مذاق اُڑاتی ہو، اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت۔

جو کچھ نام ہے جو کہ اپنی روزی کماتا ہے ـــــ یاد رکھو، یہ تمہارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمہیں محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لئے موجود ہے ۔

زہرہ جان اکتا گئی ۔ اُس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اُس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دو ۔ لیکن وہ اِس سے پہلے ہی چلا گیا ۔

ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی ـــــ اُس کا باپ کون تھا، یار ق اور اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے ـــــ کسی کے نطفے سے بھی ہو، مگر بلا کی خوبصورت تھی ۔

اِدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی، اُدھر عیدن جوان ہوتی گئی ۔ اُس کی ماں نے اُس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی ۔ لڑکی ذہین تھی، کئی اُستادوں سے اس نے سبق لئے اور اُن سے داد وصول کی ۔

زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہوئی ۔ وہ اب اُس منزل سے گذر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے ۔ وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے جی رہی تھی ۔ ابھی تک اُس نے اُس سے مجرا نہیں کروایا تھا ۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے ۔

عیدن بائی کے حسن کے چرچے عام تھے ۔ دور دور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے ۔ وہ اپنے ایجنٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی نتھنی اُتار نے کے لئے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے، مگر اُس کو اتنی جلدی کوئی نہیں تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ مستی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے ـــــ اُس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی ۔ سارے شہر میں اُس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی ۔

اس کے حسن کی نمائش کرنے کے لئے وہ ہر جمعرات کی شام کو اُس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی ۔ عشق پیشہ لوگ اُس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے ۔

چندن کا بدن، تیکھی ہی لمبی ناک، ہرا جوبن، سڈول باہیں، مخروطی انگلیاں، جن کے ناخنوں پر مینا جیتا لہو ایسا رنگ، بھرا سا قد، گھنگریالے بال ـــ قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی ۔

آخر ایک روز زہرہ جان کی اُمید بر آئی ۔ ایک نواب عیدن پر ایسا لٹو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا ۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مسی کی رسم کے لئے بڑا اہتمام کیا ۔ کئی دیگیں پلاؤ اور متنجن کی چڑھائی گئیں ۔

شام کو نواب صاحب اپنی بگھی میں آئے ۔ زہرہ جان نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی ـــــ نواب صاحب بہت خوش تھے ۔ عیدن دلہن بنی ہوئی تھی ۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اُس کا مجرا شروع ہوا ـــــ پھٹ پڑنے والا شباب، کہا جو نغمہ سرائی تھا ۔

عیدن اُس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی ۔ اُس کی ہر جنبش، ہر ادا، اُس کے گانے کی ہر مُرکی زہر بُجھی تھی ۔ نواب صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لئے بیٹھے تھے ۔ انھوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے ۔ جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی ۔

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا ۔ وہ بہت گھبرائی ۔ یہ وہی بڑھئی تھا ـــــ اُس کا عاشقِ زار ۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا ۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے ابکائیاں آنے لگیں ۔ انھوں نے

"زہرہ جان سے کہا، یہ کون بدتمیز ہے؟"

بڑھئی نے کہا: "حضور، میں ان کا عاشق ہوں۔"

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی: "زہرہ جان نکالو اس حیوان کو باہر۔"

بڑھئی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی پھرتی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اُس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔

بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لہو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبالِ جرم کر لیا ——— کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔

عیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دو اڑھائی مہینے تک بیمار رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی، مگر آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اُس کی تیمارداری صرف اُس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے۔ وہ نواب اور رئیس جو اُس پر اپنی جان چھڑکتے تھے، بھولے سے بھی اُس کو پوچھنے کے لئے نہ آئے ——— وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔

وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی ——— ملول اُس کی طبیعت تھی اور اس قدر تھی کہ اُس کا جی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے، جن میں زیادہ تر اُس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انہیں بیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ اُس کو بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ کوئی چوڑی یا نکلس اونے پونے دام بیچتی تھی ——— لیکن آخر بالا اُس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ رنگ رنگ کی محفلیں قائم کرے۔

اُن دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے زوروں پر تھا۔ آخر ایک دن یہ اعلان ہوا، جو عیدن نے اپنے پانچ والو ریڈیو سیٹ پر سنا، کہ ہندوستان کے دو حصے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد فسادات شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو مار رہے تھے، مسلمان ہندوؤں کو ——— عجب عالم تھا۔ خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ اُن کی جانیں محفوظ رہیں۔ عیدن نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ دہلی نہیں رہے گی، لاہور چلی جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کچھ زیورات بچا کر وہ لاہور پہنچ گئی، لیکن راستے میں اُس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اُس کے ایک بھائی کمینے ہی نے غائب کر دیئے۔

جب وہ لاہور پہنچی تو وہ دکھی ہو چکی تھی ——— لیکن اُس کا حسن ویسے کا ویسا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اُس کی طرف دیکھا، مگر اُس نے بے اعتنائی برتی۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اُس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی؟ اُس کے پاس تو چنے کھانے کے لئے بھی چند پیسے نہیں تھے ——— لیکن وہ ذہین تھی، سیدھی اُس جگہ پہنچی جہاں اُس کی ہم پیشہ رہتی تھیں۔ یہاں اُس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔

ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہیرا منڈی کے وارے نیارے تھے۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوتی، وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا ـــــ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا لے کے وہاں اٹھ آئی، چونکہ جہاں وہ مقیم تھی اس کی نائکہ کو اسے اپنی آدھی آمدن دینا پڑتی تھی۔

جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرا کرنا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی۔ اس نے کئی زیور بنوائے۔ کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرائے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا۔ اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کما لیے تھے۔ خوبصورت تھا۔ اس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھلی سفید پیکارڈ اس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم ڈھائی سو روپے اس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی۔ اس نے عیدن سے پوچھا "کیا بات ہے، آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے"؟

عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا "آجکل لٹھا کہاں ملتا ہے"؟

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ کے بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیئے۔ اس کے تیسرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیئے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگرے اور دلی میں تھی تو اسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا، مگر لاہور میں اسے قادرا قصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا ـــــ بغیر ریشے کی ... بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

دکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادرا صبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی ہر بوٹی پھڑک رہی ہوتی، عیدن کے حوالے کر دیتا۔ اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا، جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ، جس کا نام غضنفر شاہ تھا، عیدن کے عشق میں بہت بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائداد، منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے اگر وہ اس سے شادی کر لے ـــــ مگر عیدن نہ مانی۔ غضنفر شاہ بہت مایوس ہوا۔

اس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اس کی ہو جائے، مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی، معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کرکے ——— یعنی شراب پی کر ـ پیدل ہی چلا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں ——— کے تکیے کے باہر عیدن ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پڑ کے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لئے مجھ پر نظر کرم کرو ـ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں ——— تم اتنے ظالم کیوں ہو ـ ——— اور وہ شخص جسے غور سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادرا قصائی ہے ، اُسے دھتکار رہا ہے "چل ——— ہم نے آج تک کسی کنجری کو منہ نہیں لگایا ——— مجھے تنگ نہ کیا کر ـ ———"

قادرا اُسے ٹھوکریں مار رہا تھا اور عیدن اسی میں لذت محسوس کرتی رہی ـ

خودکشی

(۲۵ مئی سنہ ۵۴ء)

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا۔ اُس کے زہد و تقویٰ کے سب قائل تھے۔ اُس نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اُس زمانے میں اُس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے، شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زاہد بہت خوش تھا۔ اُس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی۔ اُس کو اُس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اُس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد اُن کے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو ماں پر تھی، یعنی ویسی ہی حسین۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، اُن پر لمبی لمبی پلکیں، مہین ابرو، چھوٹا سا لب دہن ——— اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اُس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کیے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے۔ ..چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا، لیکن اُس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرتا۔

اُس نے اپنی بیوی سے کہا ”اتنی جلدی کیا ہے ——— نام رکھ لیا جائے گا۔“

بیوی مُصر تھی کہ نام ضرور رکھا جائے۔ ”میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔“

وہ کہتا ”اس میں کیا حرج ہے ——— جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس ”گُل گوتھنی“ کے ساتھ ٹانک دیں گے۔“

”پر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں ——— مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔“

”فی الحال بٹیا کہہ دینا کافی ہے۔“

”یہ کافی نہیں ہے ——— میری بٹیا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔“

"تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔"

"یہ کام آپ کا ہے، میرا نہیں۔"

"تو تھوڑے دن انتظار کرو ——— میں اردو کی لغت لاتا ہوں ——— اس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا ——— یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا۔"

"میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا۔ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔"

"نہیں میری جان، نکالتے ہیں ——— میرا ایک دوست ہے۔ اس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اردو کی لغت نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔"

"کیا نام تھا؟"

"نکہت۔"

"اس کے معنی کیا ہیں؟"

"خوشبو۔"

"بڑا اچھا نام ہے ——— نکہت ——— یعنی خوشبو۔"

"تو یہی نام رکھ لو۔"

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی ایک نظر دیکھا اور کہا "نہیں ——— میں اپنی بچیا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی ——— کوئی نیا نام تلاش کیجئے ——— جائیے ڈکشنری لے آئیے۔"

زاہد مسکرایا "لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔"

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی "میرا پرس الماری میں پڑا ہے، اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں، نکال لیجئے۔"

زاہد نے "بہت بہتر" کہا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خرید لے۔

وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا ——— کئی لغت دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے، جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص ——— آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی خرید لیا۔ اور راستے میں اس کی ورق گردانی کرتا رہا، تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انارکلی میں سے گزر رہا تھا تو اس کو ایک دوست مل گیا۔ وہ اسے اپنی بوٹوں کی دکان میں لے گیا ——— وہاں اسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا، کیونکہ بہت دیر کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا "یہ اس بچی کو دے دینا، کہنا تمہارے چچا نے دیئے ہیں ——— نام کیا رکھا ہے اس کا؟"

زاہد نے تختی کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی "ابھی تک کوئی اچھا نام سوچا نہیں۔"

اُس کے دوست نے چشمے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا "یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے۔ شمینہ ہے۔ شاہینہ ہے۔ نسرین ہے۔ الماس ہے۔"

زاہد نے جواب دیا "یہ سب بکواس ہے۔"

اُس کے دوست نے چونا ڈبے میں رکھا۔ "تو اب جو کچھ اس نے کر دکھائے وہ بھی تم سن بیٹھے" اس کے بعد اُٹھ کر اُس نے زاہد کو گلے سے لگایا "خدا اس کی عمر دراز کرے۔۔۔ نام ہو نہ ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

زاہد جب دکان سے باہر نکلا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے جو پرواہ کی جائے؟ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیریت کرتا ہے۔ عبیدن کیا بلا ہے۔۔۔ اور گلستان۔۔۔ کیا آج سے لوگ گلستان شروع کر دیں۔۔۔ اور بیگم [illegible]۔۔۔ شیرازی؟

اُس کے جی میں آئی کہ لعنت کسی گندی موری میں پھینک دے اور جا کر اپنی بیوی سے کہے "میری جان، نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔"

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا۔۔۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے۔۔۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اُس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔ بغل میں لعنت تھی۔۔۔ اس کو اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی، مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا۔۔۔ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔۔۔ مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اس نے اس کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا "چابک مار کے چلو۔۔۔ مجھے جلدی پہنچا دو [illegible]۔۔۔ ایک بڑا ضروری کام ہے۔"

تانگہ بہت ہی سست رفتار تھا۔ یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرتا رہا۔ آخر جب اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگے سے اتار دیا۔۔۔ ہائی کورٹ کے قریب۔ اس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔

زاہد اور زیادہ پریشان ہوا۔ وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھ کر وہ موزنگ پہنچا۔ [illegible] دیا اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

اس نے دیکھا کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں۔ غالباً ہمسائیاں تھیں۔ وہ دروازے کے پاس رک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی "[illegible] تشنج ہے۔۔۔ بڑے خطرناک ہیں۔"

زاہد [illegible] کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بھاگا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں [illegible] اس کی بیوی رہتے تھے۔ [illegible] اس نے اپنی بیوی کی [illegible] پہنچ سکی۔

[illegible] اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ زاہد [illegible] ہمسائیاں [illegible]

میں اور زاہد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا۔

ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو انجکشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آگئی۔

زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لغت دبائے خلا میں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اپنی بچی کے لئے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد باہوش ہو گیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں لپٹی ہوئی بچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی سے تیار کر لی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود اسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔

لوگوں نے سمجھا قرآن مجید ہے۔ انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

بچی کو دفنا کر جب گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے۔ سرسام کی کیفیت ہے۔

فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا "حالت بہت نازک ہے ——— میں علاج تجویز کر دیتا ہوں، لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے۔ لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا "تکلیف کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "بہت سی تکلیفیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھیں بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے ——— تیسری یہ کہ انھیں ایک دم پانچ ڈگری بخار ہے۔"

ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کئے۔ دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے اور چلا گیا۔

زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے لگائے۔ دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں ٹپکائی گئیں ——— لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔

پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا سا ہوش آیا۔ ہذیانی کیفیت بھی ختم ہو گئی۔ زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن چارپائی پر لیٹی ہوئی بیوی نے بڑی نحیف آواز میں کہا "میرا اب آخری وقت آگیا ہے ——— میں چند گھڑیوں کی مہمان ہوں ———"

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے "کیسی باتیں کرتی ہو تم ——— تمہیں خدا نہ کرے اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔"

اس کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا "یہ سب لکھنے کی باتیں ہیں ——— میں مر گئی تو کل دوسری آجائے گی ——— خدا آپ کی عمر دراز کرے ——— اور ——— اور ———"

اس نے ہچکی لی اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی روح پرواز کر گئی ——— زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ رات کو گھر سے باہر نکلا اور [illegible] ریلوے لائن کا رخ کیا۔

رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آتی تھی۔ وہ پٹڑی کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پٹڑی پر لیٹ جائے اور اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو میں کٹ کر مر جاؤں گا ——— مجھے اب عمر کی کوئی خواہش نہیں ——— یہ جتنی جلدی ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے اور

زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اُسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر ہوتی ہے دکھائی دی ——— لیکن ابھی وہ دُور تھی۔ اُس نے سوچا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آ گئی ——— زاہد آگے بڑھا، مگر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہُوا اور پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہو گیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ اور قریب تھا کہ وہ آدمی اُس کی جھپیٹ میں آ جائے۔ وہ تیزی سے لپکا اور اُس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی کے اُس طرف گرا دیا ——— گاڑی دندناتی ہوئی گزر گئی۔

اِس آدمی سے زاہد نے۔ "کیا تُم خودکشی کرنا چاہتے تھے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

"کیوں؟"

"بس ——— صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا"

زاہد ناصح بن گیا۔ "بھائی میرے، زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اِس کو اچھی طرح استعمال کرو۔ خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے ——— اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلمندی ہے ——— اُٹھو، اپنے صدموں کو بھول جاؤ ——— انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو وہ خوشیوں سے کیا حظ اُٹھائے گا ——— چلو میرے ساتھ۔"

پشاور سے لاہور تک

(۲۶ مئی سنہ ۵۴ء)

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گذرا۔

لڑکی حسین تھی۔ جاوید اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اُس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹا سا تل تھا۔ کانوں میں ننھے ننھے کرٹے تھے جو اُس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔

راولپنڈی اسٹیشن پر اُس لڑکی نے کھانا منگوایا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

وہ یقیناً اُس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زنانہ تھا۔ عورتوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کر سکا۔

لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے، جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں جن کو اُس نے اچھی طرح صاف کیا، اور اٹیچی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پونچھے۔ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جاوید گاڑی چلنے تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اُسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔

معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔

دونوں کلائیوں میں قریب قریب بارہ بارہ سونے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کانوں میں ٹاپس بھی تھے۔ دو انگلیوں میں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں، ہیرے انگوٹھیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ ساٹن کی شلوار۔ لٹھیا کی قمیص۔ شنون کا دوپٹہ۔

حیرت ہے کہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہی ہے!

پشاور سے آئی ہے ——— وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کرتی ہیں ——— لیکن یہ برقعے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی۔

اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں ——— نہ کوئی عورت۔ اکیلی سفر کر رہی ہے۔ آخر یہ قصّہ کیا ہے؟

میرا خیال ہے، پشاور کی رہنے والی نہیں ——— وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہوگی ——— مگر اکیلی کیوں؟ ——— کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اٹھا کر لے جائے گا کوئی ——— ایسے تنہا حُسن پر تو ہر مرد جھپٹا مارنا چاہتا ہے۔

پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہُوا ——— کہ شادی شدہ تو نہیں؟

وہ در اصل دل میں تہیّہ کر چکا تھا کہ اُس لڑکی کا پیچھا کرے گا اور بدوران لڑاکر اُس سے شادی کرے گا۔ وہ حرام کاری کا بالکل قائل نہیں تھا۔

کئی اسٹیشن آئے اور گذر گئے ——— اُسے صرف راولپنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اُس کا گھر تھا، مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔

ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی جس کے باعث اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑا، مگر اُس نے اِس کی کوئی پروا نہ کی۔

ٹکٹ چیکر نے پوچھا "آپ کو کہاں تک جانا ہے؟"

جاوید مُسکرایا "جی، ابھی تک معلوم نہیں ——— آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجئے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔"

ٹکٹ چیکر نے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کئے اور دوسرے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔

ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا۔ وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔ جاوید کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اُس کے دل و دماغ میں پھلجھڑیاں دوڑنے لگیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے۔

جاوید کو دیکھ کر وہ مُسکرائی۔ اُس کا دل باغ باغ ہو گیا ——— مگر جاوید فرطِ جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبّے میں چلا گیا اور واہوں کی دُنیا کی سیر کرنے لگا ——— اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے آس پاس کی تمام چیزیں مُسکرا رہی ہیں۔

ٹرین کا پنکھا مُسکرا رہا ہے ——— کھڑکی سے باہر تار کے کھمبے مُسکرا رہے ہیں ——— انجن کی سیٹی مسکرا رہی ہے، اور وہ بدصورت مسافر جو اُس کے ساتھ بیٹھا تھا، اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مُسکراہٹ ہے ——— اُس کے اپنے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نہیں تھی، لیکن اُس کا دل مسکرا رہا تھا۔

اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہاں چلی گئی؟ ——— کہیں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اُتر گئی جہاں اُس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا تھا؟ ——— نہیں نہیں، غسل خانے میں ہوگی۔

وہ واقعی غسل خانے ہی میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ کر مُسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اُس کو بلایا۔

جاوید کا پتہ اُڑتا کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اُس لڑکی نے بڑی مہین اور سُریلی آواز میں کہا "ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کو ——— مجھے دو سیب لا دیجئے ——— یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔

جاوید نے جو اِس غیر متوقع بلاوے سے قریب قریب بوکھلا گیا تھا، ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا، لیکن فوراً اُس کے ہوش و حواس برقرار ہو گئے۔ نوٹ

واپس ہوئے کہ اس نے اس لڑکی سے کہا "آپ یہ رکھیے —— میں سیب لے آتا ہوں" اور وہ پلیٹ فارم پر اس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بک رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی چھ سیب خریدے، کیونکہ سگنل ہو چکی تھی۔

وہ شادا و زادہ اس لڑکی کے پاس آیا۔ اس کو سیب دیئے اور کہا "معاف کیجئے گا —— سگنل ہو رہی تھی، اس لئے میں اچھے سیب چن نہ سکا۔"

لڑکی مسکرائی —— وہی دل فریب مسکراہٹ —— گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کانپ رہا تھا، لیکن بہت خوش تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو دونوں جہان مل گئے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تر و تازہ بنا دیتی ہے —— وہ سیب کھا رہی ہو گی —— لیکن اس کے گال تو خود سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اس کو دیئے ہیں کیا وہ ان کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔

وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی ہے جبھی تو وہ مسکرائی، اور اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا کہ میں اسے سیب لا دوں۔ مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رُخ پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں، لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سر انجام دے سکتا ہے —— فرہاد نے شیریں کے لئے پہاڑ کاٹ کر کیا نہر نہیں کھود دی تھی!

میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اس سے اور کچھ نہیں، تو کم از کم یہی پوچھ لیا ہوتا کہ تمہیں کہاں تک جانا ہے —— خیر میں لاہور تک کا ٹکٹ تو خرید چکا ہوں —— ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا۔

ویسے وہ اب مجھے بن بتائے جائے گی بھی نہیں —— شریف خاندان کی لڑکی ہے —— میرے جذبۂ محبت نے اسے کافی متاثر کیا ہے —— سیب کھا رہی ہے۔ کاش کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں ایک سیب کو بیک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے —— اس کا منہ میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔

میں اس کے گھر کا پتہ لوں گا —— ذرا اور باتیں کر لوں، پھر راول پنڈی پہنچ کر امی سے کہوں گا کہ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے، اس سے میری شادی کر دیجئے۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی —— بس ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔

اگلے اسٹیشن پر جب جاوید اسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ جرأت کر کے آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا "آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرمایئے۔"

لڑکی مسکرائی —— وہی دلفریب مسکراہٹ "مجھے سگرٹ لا دیجئے۔"

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا "آپ سگرٹ پیتی ہیں؟"

وہ لڑکی پھر مسکرائی "جی نہیں —— یہاں ایک عورت ہے، پردہ دار، اس کو سگرٹ پینے کی عادت ہے۔"

"اوہ —— میں ابھی لایا —— کس برانڈ کے سگرٹ ہوں؟"

"میرا خیال ہے، وہ گرونڈ فلیک پیتی ہے"

"میں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں" یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اس نے دو پیکٹ لئے اور اس لڑکی کے حوالے کر دیئے۔ اس نے شکریہ اس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگرٹ پینے کی عادی تھی۔

جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ غور کر کر سا کہ اس نے نام کیوں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی رہیں، لیکن وہ اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا "آپ کا نام؟"

اس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اس سے نام ضرور پوچھے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی، کیونکہ اس میں قباحت ہی کیا تھی۔

اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا، اس لئے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ ٹائم ٹیبل دیکھا۔ گھڑی بار بار دیکھی —— اس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کو پر لگ جائیں، تاکہ وہ اڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پہنچ جائے۔

گاڑی ایک دم رک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن کے سامنے ایک بھینس ٹکرا گئی ہے —— وہ اپنے کمپارٹمنٹ سے اتر کر ساتھ والے ڈبے کے پاس پہنچا، مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹڑی سے ہٹانے میں کافی دیر لگا دی۔ اتنے میں وہ لڑکی جو غالباً دوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید پر جب اس کی نظر پڑی تو مسکرائی —— وہی دلفریب مسکراہٹ۔

جاوید کھڑکی کے پاس گیا، مگر اس کا نام پوچھ نہ سکا۔

لڑکی نے اس سے کہا "یہ بھینسیں کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں؟"

جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی، اس لئے وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

کئی اسٹیشن آئے، مگر وہ نہ اترا۔ آخر لاہور آ گیا۔ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی موجود تھی۔ جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اس نے جس نے ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑا ہوا تھا کہا "لائیے یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیجئے"

اس لڑکی نے اٹیچی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اٹھایا، اور دونوں باہر نکلے۔ تانگہ لیا۔ جاوید نے اس سے پوچھا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

لڑکی نے بڑے نرم و نازک لہجے میں جواب دیا "جی، راوی روڈ"

"چلئے، میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں"

"بہت بہت شکریہ"

تانگہ راوی روڈ سے گذر رہا تھا —— جاوید نے اس لڑکی سے پوچھا "کہاں جائیے گا اب آپ؟"

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "جی، ہیرا منڈی"

جاوید بوکھلا سا گیا "کیا آپ وہاں رہتی ہیں؟"

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا —— "جی ہاں —— میرا مکان دیکھ لیں۔ آج رات میرا مجرا سننے ضرور آیئے گا۔"

جاوید پشاور سے کرومبٹک اپنا مجرا سن چکا تھا۔ اس نے اس طوائف کو اس کے گھر چھوڑا اور اسی تانگے میں سید مٹھا بازار کے اڈے پر پہنچا اور

بجلی پہلوان

(۲۷ مئی ۱۹۵۴ء)

بجلی پہلوان کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ برق رفتار تھا۔ بجلی کے مانند اپنے دشمنوں پہ گرتا تھا اور انھیں بھسم کر دیتا تھا ——— لیکن جب میں نے اُسے مغل بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر کدو کے مانند نظر آیا۔ بڑا پھسپھس سا۔ توند باہر نکلی ہوئی، بند بند ڈھیلے گال لٹکے ہوئے۔ البتہ اُس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔

وہ مغل بازار میں ایک بزاز کی دکان پہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کو غور سے دیکھا۔ مجھے اُس میں کوئی غنڈہ پن نظر نہ آیا۔ حالانکہ اُس کے متعلق مشہور یہی تھا کہ ہندوؤں کا وہ سب سے بڑا غنڈہ ہے۔

وہ غنڈہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ اُس کے خدوخال اس کی نفی کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر سامنے والی کتابوں کی دکان کے پاس کھڑا اُس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی، بزاز کی دکان کے پاس پہنچی۔ بجلی پہلوان سے اُس نے کہا "مجھے بجلی پہلوان صاحب سے ملنا ہے۔"

بجلی پہلوان نے ہاتھ جوڑ کر اُسے پرنام کیا "ماتا، میں ہی بجلی پہلوان ہوں۔"

اُس عورت نے اُس کو سلام کیا "خدا تمھیں سلامت رکھے ——— میں نے سُنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو۔"

بجلی نے بڑی انکساری سے کہا "ماتا، دیالو پرمیشور ہے ——— میں کیا دیا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

"بیٹا، مجھے اپنی جوان لڑکی کا بیاہ کرنا ہے ——— تم اگر میری کچھ مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمھیں دعائیں دوں گی۔"

بجلی نے اُس عورت سے پوچھا "کتنے روپوں میں کام چل جائے گا؟"

عورت نے جواب دیا "بیٹا، تم خود ہی سمجھ لو ——— میں تو ایک بھکارن بن کر تمہارے پاس آئی ہوں۔"

بجلی نے کہا "بھکارن منہ سے کہو ——— میرا فرض ہے کہ تمہاری مدد کروں۔" اس کے بعد اُس نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا کہا "لالہ جی ——— دو ہزار روپے نکالئے۔"

لالہ جی نے دو ہزار روپے فوراً اپنی صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی پہلوان کو دے دیئے۔ یہ روپے اُس نے اُس عورت کو پیش کر دیئے "ماتا ——— بھگوان کرے کہ تمہاری بیٹی کے سہاگ اچھے ہوں۔"

وہ عورت چند لمحات کے لئے، نوٹ ہاتھ میں لئے بُت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اُس کو اتنے روپے ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔ جب وہ سنبھلی تو اُس نے بجلی پہلوان پر دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا، آخر اُس نے اُس عورت سے کہا "ماتا، مجھے شرمندہ نہ کرو ——— جاؤ، اپنی بیٹی کے دان دہیز کا انتظام کرو ——— اُس کو میری اشیرباد دینا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بدمعاش ہے جو دو ہزار روپے ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا بھی نہیں، دو ہزار روپے پکڑا دیتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا مخیر ہے۔ ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔

مجھے چونکہ اُس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس لئے میں کافی چھان بین کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔ مغل بازار کی اکثر دکانیں اُس کی تھیں۔ حلوائی کی دکان ہے، بزاز کی دکان ہے، شربت بیچنے والا ہے، شیشے فروخت کرنے والا ہے، پنساری ہے۔ غرضیکہ اس سرے سے اُس سرے تک جہاں وہ بزاز کی دکان میں بیٹھا تھا، اُس نے ایک "لائن آف کمیونیکیشن" قائم کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر پولیس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اُسے فوراً اطلاع مل جائے۔

دراصل اس کی دو بیٹھکوں میں جو بزاز کی دکان کے بالکل سامنے تھیں، بہت بھاری جؤا ہوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں روپے نال کی صورت میں اسے وصول ہو جاتے تھے۔

وہ خود جؤا نہیں کھیلتا تھا۔ نہ شراب پیتا تھا۔ مگر اُس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی۔ اس سے بھی اُس کی آمدن کافی تھی۔

شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے، اُن کو اُس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا، یعنی ہفتہ وار انہیں اُن کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اُس نے یہ سلسلہ بطور حفظِ ماتقدم شروع کیا تھا کہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے، زیادہ تر ہاتھی دروازے کے۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ وصول کر لیتے ——— وہ اُن کو کبھی ناامید نہ لوٹاتا، اس لئے کہ اُس کے پاس روپیہ عام تھا۔

میں نے سنا کہ ایک دن وہ بزاز کی دکان پر حسبِ معمول بیٹھا تھا کہ ایک ہندو بنیا جو کافی مالدار تھا، اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "پہلوان جی، میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے ——— اُس کو ٹھیک کر دیجئے۔"

پہلوان نے مسکرا کر اُس سے کہا "میرے دو لڑکے ہیں ——— بہت شریف۔ لوگ مجھے غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں، لیکن میں نے انہیں اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ کوئی بُری حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصور ہے، آپ کے لڑکے کا نہیں۔"

بنیے نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پہلوان جی ——— میں نے بھی اُس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے، پر اُس نے اب چوری چوری بہت بُرے کام شروع

سے بیٹے ہیں ":

بجلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "اس کی شادی کر دو۔"

اس واقعہ کو دس سال گزر گئے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا، حالانکہ اُس سے اس قسم کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہو گی اور بجلی پچاس سے اُوپر ہو گا۔ آدمی با اثر اور مالدار تھا۔ لڑکی کے والدین راضی ہو گئے۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ اُس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی۔ دولہن کو وہ جب اس میں لے کر گیا، تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام جھاڑ اور فانوس ماند پڑ گئے ہیں۔

لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی، مگر نہ کر سکا، اس لئے اُس کے دماغ میں اپنی پہلی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا۔ اُس کے دو جوان لڑکے تھے، جو اُسی کوٹھی کے کسی کمرے میں سو رہے تھے، یا جاگ رہے تھے۔

اُس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں باہر بھیج دیا تھا۔ اُس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اُس کے پتی نے دوسری شادی کر لی ہے ——— بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ اُسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی استری کو مطلع ضرور کر دینا چاہیئے تھا۔

ساری رات نئی نویلی دولہن جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی، چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے۔ کیا اُسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سننا ہوں گی۔

"کل میں تمہارے لئے دس ہزار کے زیور اور لاؤں گا۔"

"تم بڑی سندر ہو۔"

"برفی کھاؤ گی، یا پیڑے؟"

"یہ سارا شہر، سمجھو کہ تمہارا ہے۔"

"یہ کوٹھی میں تمہارے نام لکھ دوں گا۔"

"کتنے نوکر چاہئیں تمہیں ——— مجھے بتا دو۔ ایک منٹ میں انتظام ہو جائے گا۔"

"میرے دو جوان لڑکے ہیں، بہت شریف ——— تم اُن سے جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو۔ وہ تمہارا حکم مانیں گے۔"

دولہن ہر روز اسی قسم کی باتیں سنتی رہی۔ حتیٰ کہ چھ مہینے گزر گئے۔ بجلی پہلوان دن بدن اُس کی محبت میں غرق ہوتا گیا۔ وہ اُس کے تیکھے تیکھے نقوش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اُس کی پہلی بیوی بدشکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اُس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ ایک عام گھرانے کی تھی جو ایک بچہ جننے کے بعد ہی بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن اُس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹھوس تھی۔ دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و سالم رہ سکتی تھی۔

بجلی پہلوان کا ایک وید دوست تھا۔ اُس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا۔ اُس نے بجلی کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پہلوان خوش تھا۔ وہ کے ہاں سے آتے ہوئے اُس نے کئی اسکیمیں تیار کیں۔ راستے میں مٹھائی خریدی۔ بیٹے کے دو بڑے بڑے خوشنما کرتے سلے۔ بارہ قمیصوں اور بارہ شلواروں کے لئے بہترین کپڑا قیمت ادا کئے بغیر حاصل کیا، اس لئے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے اس سے مرعوب تھے اور قیمت لینے سے انکاری تھے۔

شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں گیا۔ دیکھا، تو وہاں اُس کی دوسری بیوی نہیں تھی۔ اُس نے سوچا، شاید غسلخانے میں ہوگی۔ چنانچہ اُس نے اپنا بوجھ، میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا رُخ کیا۔ مگر وہ خالی تھا!

بجلی پہلوان بڑا متحیّر ہوا کہ اُس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کرسکا۔ اُس نے دبہ کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اُس کی بیوی آجائے گی۔ آخر اُسے جانا کہاں ہے؟

وہ گولیاں کھا کر پلنگ پر بیٹھا، قمیصوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سُنائی دی۔ وہ چونکا۔ اُٹھ کر اُس کمرے میں گیا جو اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا۔ اندر سے اُس کی بیوی اور اُس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اُس نے دستک دی ——— لیکن دروازہ نہ کھلا۔ پھر بڑے زور سے چلّانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو۔ اُس وقت اُس کا خون کھول رہا تھا۔ دروازہ پھر بھی نہ کھلا ——— اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس کمرے کے اندر اُس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کردیا ہے۔

بجلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورمکھی زبان میں ایک رُقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے:-

"یہ کوٹھی اب تمہاری ہے ——— میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے خوش رہو ——— تمہارے لئے کچھ تحفے لایا تھا، وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔"

یہ رُقعہ لکھ کر اُس نے سارے کے تھان کے ساتھ ٹانک دیا۔

——— ——— ———

ایک زاہدہ، ایک فاحشہ

(۲۸ مئی ۵۴ء)

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اُس کی مرضی کے خلاف اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ پہ نثار تھا میں اُس پہ۔ ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ رہتے۔

وہ اپنے رشتے داروں سے خوش نہیں تھا، اس سے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی بُرائی کرتا اور کہتا سگ باش، برادر خورد مباش۔ اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا، جیسے خلاؤں میں دیکھ رہا ہے۔ میں اُس کے اِن لمحات سے تنگ آ کر جب زور سے پکارتا "جاوید! یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

وہ ایک دم چونکتا اور معذرت طلب کرتا "اوہ ———— سعادت بھائی۔ معاف کرنا ———— اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

وہ اُس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا ———— میں کہتا "بھئی جاوید، دیکھو ———— مجھے تمہارا یہ دفعتاً نو دفعتاً معلوم نہیں کن گہرائیوں میں کھو جانا بالکل پسند نہیں ———— مجھے تو ڈر لگتا ہے، ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے۔"

یہ سن کر جاوید بہت ہنسا "پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت ————"

لیکن آہستہ آہستہ اُس کا خلاؤں میں دیکھنا بڑھتا گیا۔ اور اُس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پہ ہر وقت کھیلتی رہتی تھی، بالکل پھیکی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا "آخر بات کیا ہے ———— تم تصویر یاس بن گئے ہو ———— ہوا کیا ہے تمہیں؟ ———— میں تمہارا دوست ہوں۔ خدا کے لئے مجھ سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔"

جاوید خاموش رہا۔ جب ہم نے اُس کو بہت لعن طعن کی تو اُس نے اپنی زبان کھولی "میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ اُس

"میں جو پوچھنا ہو گا، بتا دوں گا۔"

وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے حد خوبصورت۔ اُس میں نسوانیت کی جھلک تھی۔ پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لئے میں آوارہ گرد تھا۔ لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے اُس کو سگریٹ پیش کیا تو اس نے مجھ سے کہا، "تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں ——— روگ ہے یا سوگ، بہرحال تم نارمل حالت میں نہیں ہو ——— تمہیں کوئی نہ کوئی ذہنی تکلیف ضرور ہے۔"

وہ مسکرایا ہے ——— اس لئے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔"

محبت! ——— میں بوکھلا گیا ——— جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہو گی۔ خود ایک خوبرو لڑکی کے مانند اُس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے، یا ہو گئی ہے۔ وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور لچکیلا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دیہاتی دوشیزہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے، مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا۔ ایسا لگتا تھا فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے اُس سے پوچھا "کس لڑکی سے محبت ہوئی ہے تمہیں؟"

اُس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی "ایک لڑکی ہے زاہدہ ——— ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ بس اُس سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ عمر سولہ برس کے قریب ہے۔ بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی ——— چوری چھپے اُس سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا "تو پھر اس اُداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پہ ہر وقت چھائی رہتی ہے؟"

اُس نے مسکرا کر کہا "سعادت، تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو ——— محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے ——— ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے، اس لئے کہ اُس کے دل و دماغ میں صرف خیالِ یار ہوتا ہے ——— میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اُس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے۔"

"یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس، میں نے کہہ دیا ——— اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمہیں اُس سے ملاؤں۔ اُسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں ——— بولو، چلو گے اپنی بھابی کو دیکھنے؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُس سے کیا کہوں۔ اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ بھابی سجتا نہیں تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔"

میں نے سرسری طور پہ کہہ دیا "چلیں گے ——— ضرور چلیں گے ——— پر کہاں؟"

"اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی ——— آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لائیے گا ——— اب تم کل تیار رہنا ——— بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں تمہارا انتظار کرتے

ں گے۔"

میں انکار کیسے کرتا، اس لئے کہ مجھے جاوید سے بے حد پیار تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن مجھے اُس پر کچھ ترس آ رہا تھا۔ میں نے اُس سے اچانک پوچھا "تم کی شریف اور پاکباز ہے نا؟"

جاوید کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا "میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں سوچ سکتا ہوں، نہ سُن سکتا ہوں —— تمہیں اگر اُس سے ملنا ہے تو کل شام کو ٹھیک پانچ بجے لارنس گارڈنز پہنچ جانا —— خدا حافظ۔"

جب وہ ایک دم اُٹھ کر چلا گیا، تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے کیوں اُس سے ایسا سوال کیا، جس سے اُس کے جذبات مجروح ہوئے —— آخر وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو ضروری نہیں کہ وہ بدکردار ہو۔

جاوید مجھے اپنا مخلص ترین دوست یقین کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود اُس سے برہم نہ ہوا اور اُس کو جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈنز آئے۔

میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا۔ بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں، لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اُس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا —— یقیناً اُس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو، کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں۔ شاید میرا مذاق اُڑانے کے لئے اُس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوست سے ضرور ملاؤ۔

بہرحال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا —— اس تقریب پر میں نے سوچا، کوئی تحفہ لے جانا چاہیئے —— رات بھر غور کرتا رہا۔ آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے۔ انار کلی میں گیا تو سب دکانیں بند۔ معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے —— لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اُس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک شش و پنج میں مبتلا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے —— لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا، اس لئے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا، مگر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹاپس میرے تکیے کے نیچے پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں —— اُٹھا —— غسل کیا۔ اس کے بعد شیو —— پھر نہایا اور کپڑے بدل کر بیٹھا رہا اور کلاک کی ٹک ٹک سننے لگا۔

تین بج چکے تھے۔ اخبار اُٹھایا —— مگر اُس کی ایک خبر بھی نہ پڑھ سکا —— عجب مصیبت تھی۔ عشق میرا دوست جاوید کر رہا تھا، اور میں ایک قسم کا مجنوں بن گیا تھا۔

میرا بہترین سوٹ، ریشمی کا سلا ہوا میرے بدن پر تھا۔ رومال نیا۔ شو بھی نئے —— میں نے یہ سنگھار اس لئے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں، کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔

ساڑھے چار بجے میں اُٹھا۔ اپنی ریلے کی سبز سائیکل لی اور آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا۔ جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں مجھے جاوید دکھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُس نے زور کا نعرہ بلند کیا۔ میں جب سائیکل پر سے اُترا تو وہ میرے ساتھ چمٹ گیا۔ کہنے لگا "تم پہلے ہی پہنچ گئے۔ بہت اچھا کیا۔

"وہ اب آتی ہی ہوگی ——— میں نے تو اُس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیج دوں گا۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔ تانگے میں آئے گی"
جاوید کے باپ کی ایک کار تھی۔ بے بی آسٹن، خدا معلوم کس صدی کا ماڈل تھا۔ زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی۔ لارنس گارڈنز میں
مل چرتے وقت یہ موٹر بیروزگار موٹر دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا "آؤ بیٹھ جائیں"
لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا "تم ایسا کرو ——— باہر گیٹ پر جاؤ ——— ایک تانگہ آئے گا، جس میں ایک دبلی پتلی لڑکی سیاہ برقع
میں ہوگی۔ تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اُس سے کہنا۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں ——— اُس نے مجھے تمہارے استقبال کے لئے بھیجا ہے"
"نہیں جاوید ——— مجھ میں اتنی جرأت نہیں"
"لاحول ولا ——— جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی ——— تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ———
یار، زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے، جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محظوظ ہو سکے ——— جب زاہدہ سے میری شادی ہو جائے گی تو ہم آج کے
اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے ——— جاؤ میرے بھائی ——— وہ بس اب آتی ہی ہوگی"
میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ چلا گیا اور گیٹ سے کچھ دور کھڑا رہ کر اُس تانگے کا انتظار کرنے لگا، جس میں زاہدہ اکیلی
کالے برقعے میں ہو۔
آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا، جس میں ایک لڑکی کالے ریشمی برقعے میں ملبوس پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔
میں جھجکتا، سمٹتا، ڈرتا، آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔ میں نے اُس سے کہا "یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟"
تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا "تمہیں اِس سے کیا مطلب ——— جاؤ اپنا کام کرو"
برقع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا "تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے"
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب"
میں نے ہکلا کے جواب دیا "جاوید ——— جاوید ——— میں جاوید کا دوست سعادت ہوں ——— آپ کا نام زاہدہ ہے نا"
اُس نے بڑی نرمی سے جواب دیا "جی ہاں! ——— میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں"
"اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اِسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں ——— وہ اُدھر جمخانہ کلب کے پاس گھاس کے
تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے"
اُس نے اپنی نقاب اُٹھائی۔ اچھی خاصی شکل صورت تھی۔ مسکرا کر مجھ سے کہا "آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے ——— مجھے ایک ضروری کام ہے
——— ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے۔ آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا"
میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تانگہ اسمبلی ہال کے پاس سے گذرا تو میں نے تانگے والے سے کہا "بھائی صاحب
یہاں کوئی سگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لئے ٹھہر جانا۔ میرے سگرٹ ختم ہو گئے ہیں۔"
ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرٹ پان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اُترا، تو زاہدہ نے کہا "آپ کیوں تکلیف کرتے

میں یہ تانگے والے آئے گا۔"

میں نے کہا "اِس میں تکلیف کی کیا بات ہے" اور اُس پان سگرٹ والے کے پاس پہنچ گیا۔ ایک ڈبیہ گولڈ فلیک کی لی۔ ایک ماچس اور دو پان جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے دبی زبان میں مجھ سے کہا "حضور! اس عورت سے بچ کر رہیئے گا۔"

میں بڑا حیران ہوا "کیوں؟"

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا "فاحشہ ہے ——— اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو پھانستی رہے ——— میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے۔"

یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے تانگے والے سے "خدا کے لئے تم اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو ——— کہہ دینا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ میرا دوست وہاں لارنس گارڈنز میں انتظار کر رہا ہے۔"

تانگے والا چلا گیا ——— معلوم نہیں اُس نے زاہدہ سے کیا کہا۔ میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈنز پہنچا۔ دیکھا کہ جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محوِ گفتگو ہے۔ بڑی شرمیلی اور لجیلی تھی۔ میں جب پاس آیا تو اُس نے فوراً اپنے دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔

جاوید نے بڑی خفگی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا "تم کہاں غارت ہو گئے تھے ——— تمہاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔"

سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں۔ بہت بوکھلا گیا ——— اِس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا "تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟"

جاوید ہنسا "مذاق نہ کرو مجھ سے ——— بیٹھ جاؤ اور اپنی بھابی سے باتیں کرو۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔"

میں بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔

شیدا

(۳۰ رمئی ۱۹۵۴ء)

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ چٹان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔ اُس میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی۔ گو تن و توش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا، لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اُس سے خوف کھاتے اور اُس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

فرید کا چوک، معلوم نہیں فسادات کے بعد اُس کی کیا حالت ہے، عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم بھی، موچی اور جلاہے، جواری اور بدمعاش، نیک اور پرہیزگار سبھی یہاں بستے تھے۔ ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔

شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں، یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا، جس پہ اُس کے محلے والوں کو اعتراض ہو — اُس نے جتنی لڑائیاں لڑیں، دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔

وہ کہا کرتا تھا "اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامردی کی نشانی ہے ——— مزا تو یہ ہے کہ دشمن کو اُس کی اپنی جگہ پچھاڑا جائے۔"

اور یہ صحیح تھا۔ ایک بار پہاڑ گنوں سے اُس کی ٹھن گئی۔ وہ کئی مرتبہ چوک فرید سے گذرے ——— بڑکیں مارتے، نعرے لگاتے۔ شیدے کو گالیاں دیتے۔ وہ یہ سب سن رہا تھا، مگر اُس نے اُن سے بھڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان تاندوری کی دکان میں بیٹھا رہا۔

لیکن دو گھنٹوں کے بعد وہ پہاڑ گنوں کے محلے کی طرف روانہ ہوا۔ اکیلا ——— بالکل اکیلا اور پھر غیر مسلح۔

وہاں جا کر اُس نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور پہاڑ گنوں کو جو اپنے کام میں مصروف تھے للکارا "نکلو باہر ——— تمہاری ....."

دس پندرہ پہاڑ گنگ لاٹھیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے، شیدا گتکے اور بنوٹ کا ماہر تھا۔ اُس پر لاٹھیاں برسائی گئیں، لیکن اُس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ لگنے دی۔ ایسے پینترے بدلتا رہا کہ پہاڑ گنوں کی سٹی گم ہو گئی۔

آخر اُس نے ایک پرنگ سے بڑی چابکدستی سے لاٹھی چھینی اور حملہ آوروں کو مار مار کے ادھ موا کر دیا۔

دوسرے روز اسے گرفتار کر لیا گیا ـــــ دو برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا، جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہے۔

اِس دوران میں اُس کی بوڑھی ماں وقتاً فوقتاً ملاقات کے لئے آتی رہی۔

وہ مشقت کرتا تھا، لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے، صحت ٹھیک رہے گی۔

اُس کی صحت، باوجود اس کے کہ کھانا بڑا واہیات ہوتا تھا، پہلے سے بہتر تھی۔ اُس کا وزن بڑھ گیا تھا، لیکن وہ بعض اوقات مغموم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہتا۔ اُس کے ہونٹوں پر پنجابی کی یہ بولی ہوتی ـــــ

کی کھٹیے نیہری یاری

مہناں مہناں ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گذر گیا مشقت کرتے کرتے ـــــ اب اُس کی افسردگی کا دور شروع ہوا۔ اُس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں

مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اُس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ یہ بولیاں گایا کرتا تھا ـــــ

لبھ جان گے یار گواچے

ٹھیکے لے پتّاں دے

اِس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا گم شدہ محبوب مل جائے گا اگر تو دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ لے لے۔

گڈی کٹ جاندی جنھاں دی پریم والی

منڈے لے جاندے اونہاں دی ڈور لُٹ کے

یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے لڑکے بلے بڑا شور مچاتے ہیں اور اُن کی ڈور لُوٹ کر لے جاتے ہیں۔

میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ اُن سب کا جو شیدے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں، ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔

اُس قیدی نے مجھ سے کہا "ہم سمجھ گئے تھے کہ شیدا کسی کے عشق میں گرفتار ہے ـــــ کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے بھی دیکھا۔

مشقت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے ـــــ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔"

ڈیڑھ برس کے بعد جب شیدا خود کشی کا ارادہ کر چکا تھا، اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر لے کہ اُسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔ اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ اُس کی تو صرف ماں ہی ماں تھی جو اُس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آجایا کرتی تھی۔

ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ مسلح سپاہی۔ لڑکی کو بلایا گیا۔ شیدے نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ ایک برقع پوش عورت آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اُس کو ابھی تک یہ حیرت تھی کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔

سفید برقع تھا۔ جب وہ پاس آئی تو اُس نے نقاب اُٹھائی ——— "شیدا چچا" تم ——— تم کیسے ...."
زلیخا جو کہ سرگوں کی لڑکی تھی، زار و قطار رونے لگی۔ اُس کے حلق میں لفظ اٹک اٹک گئے "میں تم سے ملنے آئی ہوں ——— لیکن ——— لیکن مجھے
مجھے معاف کر دینا اتنی دیر کے بعد آئی ہوں ——— تم ——— خدا معلوم ——— اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے"
شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سر لگا کر کہا "نہیں میری جان ——— میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا ——— لیکن میں جانتا تھا کہ تم مجبور ہوگی"
زلیخا نے روتے ہوئے کہا "میں واقعی مجبور رہی ——— لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آگئی۔ سچ کہتی ہوں میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا
تھا"

"یہ موقع تمہیں کیسے مل گیا؟"

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے "میرے ابا کا انتقال ہوگیا ہے۔ کل اُن کا چالیسواں تھا"
شیدا مرحوم سے اپنی ساری مخاصمت بھول گیا "خدا انہیں جنت بخشے ——— مجھے یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں
میں آنسو آگئے "صبر کرو زلیخا ——— اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں"
زلیخا نے اپنے سفید برقعے سے آنسو پونچھے "میں نے بہت صبر کیا ہے شیدے، اب اور کتنی دیر کرنا پڑے گا ——— تم یہاں سے کب نکلو گے؟"
"بس چھ مہینے رہ گئے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں ———"
زلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوگیا "جلدی آؤ پیارے ——— مجھے اب تمہاری ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا کی
قسم اگر کسی نے تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اُس سے نپٹ لوں گی ——— میں نہیں چاہتی کہ تم پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ"
سنتری نے کہا کہ وقت ختم ہوگیا، چنانچہ اُن کی ملاقات بھی ختم ہوگئی۔ زلیخا روتی روتی چلی گئی۔ اور شیدا دل میں مسرت اور آنکھوں میں آنسو لئے
جیل کے اندر چلا گیا، جہاں اُس کو مشقت کرنا تھی۔ اُس دن اُس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گئے۔
دو مہینوں کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا ——— اس دوران میں زلیخا دو مرتبہ اُس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات میں
اس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا، چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرطِ مسرت میں آنسو بہانے لگے۔
شیدے نے تانگہ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زلیخا کو کہاں لے جائے گا۔
"زلیخا تمہیں کہاں جانا ہے" زلیخا نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں ——— تم جہاں لے جاؤ گے، وہیں چلی جاؤں گی"
شیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا "نہیں ——— یہ ٹھیک نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ ——— دنیا مجھے غنڈہ کہتی ہے، لیکن میں تمہیں جائز
طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں ——— تم سے باقاعدہ شادی کروں گا"
زلیخا نے پوچھا "کب؟"
"بس ایک۔ دو مہینے لگ جائیں گے ——— میں اپنی جوئے کی بیٹھک پھر سے قائم کر دوں۔ اس عرصے میں اتنا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا کہ
میں تمہارے لئے زیور کپڑے خرید سکوں ———"

زلیخا بہت متاثر ہوئی " تم کتنے اچھے ہو شیدے ——— جتنی دیر تم کہوگے، میں اُس گھڑی کے لئے انتظار کروں گی جب میں تمہاری ہوجاؤں گی "

شیدا فوراً جذباتی ہوگیا " جانی، تم اب بھی میری ہو ——— میں بھی تمہارا ہوں ——— لیکن میں چاہتا ہوں، جو کام ہو طور طریقے سے ہو ——— میں اُن لوگوں سے نہیں جو دوسروں کی جوان کنواری لڑکیوں کو ورغلا کر خراب کرتے ہیں ——— مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل میں کاٹے ——— خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں، ہر وقت میرے ہونٹوں پر تمہارا نام رہتا تھا "

زلیخا نے کہا " میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن تمہارے لئے میں نے ایک ہمسائی سے سیکھی اور بلاناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی ——— ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے "

شیدے نے شہر پہنچتے ہی دوسرا تانگہ لیا اور زلیخا سے جدا ہوگیا، تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے۔

شیدے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لئے۔ ان سے اُس نے زلیخا کے لئے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں۔ گلے کے لئے ایک نکلس بھی لیا ——— اب وہ پوری طرح لیس تھا۔

ایک دن وہ اپنے گھر میں اوپر برجی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ نیچے سے کسی عورت کے بین کرنے جیسی آواز آئی۔ وہ اُسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوسنے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا، تو ایک بڑھیا تھی، جو اُس کے محلے کی نہیں تھی۔ اُس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اور کہا " کیا تم ہی شیدے ہو؟"

" ہاں ہاں "

" خدا کرے نہ رہو اس دنیا کے تختے پر ——— تمہاری جوانی ٹوٹے ——— تم پر بجلی گرے "

شیدے نے کسی قدر غصے میں اُس بڑھیا سے پوچھا " بات کیا ہے؟"

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہوگیا " میری بچی تم پر جان چھڑکے اور تمہیں کچھ پتا ہی نہیں "

شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا " کون ہے تمہاری بچی؟"

" زلیخا اور کون؟"

" دیکھو کیا ہوا اُس کو؟"

بڑھیا رونے لگی " وہ تم سے ملتی تھی، تم غنڈے ہو، اس لئے ایک تھانیدار نے زبردستی اُس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا "

شیدے کے ہوش و حواس ایک لمحے کے لئے غائب ہوگئے، مگر سنبھل کر اُس نے بڑھیا سے پوچھا " کیا نام ہے اُس تھانیدار کا؟"

بڑھیا کانپ رہی تھی " کرم داد ——— تم یہاں اوپر مزے میں بیٹھے ہو۔ بہت بڑے غنڈے بنے پھرتے ہو ——— اگر تم میں تھوڑی سی

بے غیرت ہے، تم جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گنڈاسے سے کاٹ کے رکھ دو۔"

شیدا نے کچھ نہ کہا۔ کھڑکی سے ہٹ کر اس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا۔ پیٹ بھر کے۔ دو گلاس پانی کے پیئے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی لے کر باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اس نے زلیخا کے گھر دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکلی ——— شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کلہاڑی تھی۔ اس نے بڑے پرسکون لہجے میں اس سے کہا۔ "ماں ——— جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا ہوں ——— زلیخا سے میرا سلام کہنا ——— میں اب چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھا کوتوالی گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

بُڈھا کھوسٹ

(۳۱ رمئی ۵۴ء)

یہ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے جب میرا عزیز ترین دوست لفٹنٹ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا، بمبئی پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا، میرا فلیٹ کہاں ہے۔ ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا، اس لئے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ اِدھر سے جائے یا اُدھر سے آئے۔ عجیب مصیبت تھی۔

مگر اب اِن مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا۔ اُسے بمبئی کے بی۔ بی اینڈ سی۔ آئی۔ اے کے ٹرمینس پر اُس کی پوسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف لفٹنٹ تھا۔ ہم دونوں وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن کے 'بوفے' میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پیتے رہے۔ اُس نے اِس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اُس نے ایران، عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے۔ میں سُنتا رہا۔ پیشہ ور عاشق تو کالج کے زمانے سے تھا۔ اُس کی داستانیں اگر میں سناؤں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بہرحال آپ کو اتنا بتانا ضروری ہے کہ اُسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر معلوم تھا۔

گورڈن کالج راولپنڈی میں وہ راجہ اندر تھا۔ اُس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مُجرا عرض کرتی تھیں ——— خوبصورت تھا۔ کافی خوبصورت مگر اُس کا حُسن مردانہ حسن تھا۔ پتلی نوکیلی ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی گہرے بھورے رنگ کی آنکھیں، جو اُس کے چہرے پر سج گئی تھیں بڑی ہوتیں تو شاید اس کے چہرے کی ساری کشش ماری جاتی۔

وہ کھلنڈرا تھا جس طرح لارڈ بائرن صرف کچھ عرصے کے لئے کسی سے دلچسپی لیتا تھا اور پھر اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں، اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جال میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا۔ مجھے اُس کا یہ رویّہ پسند نہیں تھا کہ یہ میری نظر میں بہت غلط ہے۔ مگر وہ بے پروا تھا۔ کہا کرتا "آلے کے پتّے ——— غالب پڑھو وہ کیا کہتا ——— اُسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا، مگر اُس کا مفہوم اپنے الفاظ

میں اداکر دیا کرتا ــــــ وہ کہتا ہے ، وہی شاخِ طوبےٰ اور جنت میں وہی ایک حور ــــــ واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی ـــ شہد کی مکھی ہو، ہر کلی کا رس چوسو ــــــ مکھی کسی مصری کی نہ ہو، جو وہیں چپک کر رہ جائے" پھر اُس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ اپنا بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا۔ کیا کہا ہے اقبال نے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

ثابت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو، بلکہ درجہ اوّل کا سیپی کی طرح درجہ اوّل چغد بھی ہو ــــــ اب بتاؤ اِس بکواس کو "

میں نے یہ بکواس اِس طرح بتائی جس طرح بیرے نے میری بیئر کی خالی بوتل۔

پیشتر اِس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں، میں آپ کو شیخ سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کالج میں بی، اے کا میں پڑھتے تھے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں ایک رکمنی کی شادی کی اُڑتی اُڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکمنی ہماری ہی کلاس میں پڑھتی تھی اور کچھ عرصہ پہلے بُری طرح شیخ سلیم پر فریفتہ۔ شکل صورت اس کی واجبی تھی، مگر میرا دوست شہد کی مکھی تھا، چنانچہ دو مہینے اُن کا معاشقہ چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ اُس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔

جب اُس کو بتایا گیا کہ رکمنی جو تمہاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کئے۔ وہ اگر دوسری جگہ بیاہی جائے تو ڈوب مرو ــــــ لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔ ڈبونے کا کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں "

شیخ سلیم کو اِس قسم کی باتیں عموماً کھا جاتی تھیں۔ اُس نے اپنی مہین مہین مونچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا۔ اچھا، تم دیکھ لینا ــــــ کیا ہوگا "

اس کی پارٹی کے ایک توی ہیکل لڑکے نے پوچھا " کیا ہوگا "

شیخ سلیم نے اُس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا " ہوگا تمہاری ماں کا سر ــــــ جب شادی کا دن آئے گا، دیکھ لینا ــــــ چلو آؤ میرے ساتھ مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں "

شادی کا دن آگیا۔ بارات جب دولہا والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی شخص سر پر سہرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دولہا موٹر میں تھا جس پر پھولوں کا جال بنا ہوا تھا۔

گھوڑ سوار سہرے سے لدا پھندا شامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دولہا بنا ہوا تھا۔ دولہن کا باپ اور اُس کے رشتہ دار آگے بڑھے۔ گھوڑے کا مالک بھاگا بھاگا آگیا تھا۔ اِس سہرے سے لدے ہوئے آدمی کو اُس جگہ بٹھا دیا گیا، جہاں دولہن کو بس سامنے بیٹھنا تھا۔ بیچ میں ہون کنڈ تھا، جس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ اُنھوں نے ننگے بدن اُٹھ کر دولہن کو آشیرواد دی اور دولہن سے کہا " سردار جی دولہن کو جلد بلا لیجیے۔ مہورت ہو گیا ہے "

فوراً رکمنی پہنچ گئی اور کچھ دیر سے کے لئے دولہا کے ساتھ بٹھا دی گئی۔ پنڈت جی نے کچھ پڑھا، جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا ——— لیکن ب رسم شادی کے اس جلسے میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی، جب کا سے ایک دولہا نکل کر سامنے آگیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا "میرے ساتھ دھوکا ہُوا ہے ——— میں دعوےٰ دائر کر دوں گا۔"

وہ دولہا جو ہاتھ پکڑ کر دولہن کو اُٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلّایا۔ "ابے، جا بے دعوے دائر کرنے کے کچھ لگتے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے پھولوں کا گھونگھٹ اُٹھا دیا اور اُن ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا چاہا ——— مگر قہقہہ ایک سمندر موجیں مارنے لگا ——— دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے، کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ علیحدہ ہُوا تو اُنھوں نے بھا کر شیخ سلیم ہے۔

رکمنی بڑی خفیف ہوئی، مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پوچھا "تم اِس چغد کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو؟"

رکمنی خاموش رہی۔

"اچھا جاؤ جہنم میں ——— لیکن ایک دن نہیں، پورے تین مہینے تم ہمیں پوجتی رہی ہو" یہ کہہ کر وہ سیدھا دولہا کی طرف بڑھا، جس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اُس نے اپنے سارے ہار اُس کے گلے میں ڈال دیئے ——— سب براتی بُت بنے بیٹھے تھے۔ ہنستا، قہقہے لگاتا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہُوا اور ایڑھ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اُتر کر ہم دونوں نکل گئے تھے، اس سے پہلے میں اُس کے پیچھے گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے بھاگا تھا۔ اُس نے میرا کاندھا بڑے زور سے ہلایا "کیوں بیٹے، تم سے میں نے کیا کہا تھا ——— اب دیکھ لیا؟"

ہُوا تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا، کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے۔ میں نے اُس سے کہا، "جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا، لیکن بھائی میرے، کہیں ہنسی ہنسی میں پھنس نہ جائے۔ فرض کرو اگر رکمنی کے باپ نے تمہیں گرفتار کرا دیا؟"

وہ اکڑ کر بولا "اُس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا ——— کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے گا ——— میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لئے تیار ہوں ——— لے جائے مجھے تھانے ——— اُس سال کے سارے پول کھول دوں گا ——— میرے پاس اُس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں۔"

سارے شہر میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ رکمنی کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے۔ مگر کچھ نہ ہُوا۔

جب کئی دن گزر گئے تو وہ میرے پاس گاتا ہُوا آیا۔ ؎

"تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہُوا"

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں، جو اِس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے ——— یہ خود اُس نے مجھے سُنائی، جس کی صداقت پہ مجھے سو فی صد یقین ہے ——— اس لئے کہ شیخ سلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔

اُس نے مجھے بتایا "میں ایران میں تھا۔ وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں، وہی لباس، وہی وضع قطع، البتہ ناک نقشے کے لحاظ

سے کافی مختلف ہوتی ہیں ——— جتنی خرافات وہاں ہوتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے ——— میں نے وہاں کئی شکار کیے۔ وہاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔ حالانکہ اُن کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا۔ لیکن وہ میرے بڑے مہربان تھے۔ میس میں جب بھی مجھے دیکھتے، دور سے پکارتے ——— ادھر آؤ شیخ، میرے پاس بیٹھو، اور وہ میرے لئے ایک کرسی منگواتے۔ کسی کا دَور چلتا تو اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے۔ کرنل عثمانی صاحب کو مجھ سے چھیڑ خانی کرنے میں خاص مزا آتا ——— جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چُست کرتے تو بہت خوش ہوتے ——— کافی معمر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا افسر، میں خاموش رہتا۔ ——— اُن کو اُن پرستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی جو وہاں ایمبولنس کور میں کام کرتی تھیں ——— یہ پرستانی لڑکیاں بلا کی تنومند ہوتی ہیں ——— یہ موٹی موٹی سفید پنڈلیاں۔ بڑی مضبوط۔ چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند۔ کولھے چوڑے اور گوشت سے بھرے ہوئے، جن میں سختی ہو ——— وہ بے ایسی سختی ——— میری کئی دوست تھیں، پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ایمان کو بھول گیا۔ بڑی صنعتیں تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اگر تم اُس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیش نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اُس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اُس کی انگلیاں اتنی موٹی ہوں گی جیسے کسی درخت کے تنے ——— مگر نہیں دوست، اُس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور اُس کی انگلیاں، تم یہ سمجھ لو کہ چغتائی کی بنائی تصویروں کی مخروطی لانبی نہیں، مگر پتلی پتلی تھیں ——— میں تو اُس پہ فریفتہ ہو گیا ——— چند دنوں کی ملاقاتوں ہی میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے ۔“

یہاں تک پہنچ کر شیخ رُک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غٹاغٹ پی گیا ”نہ یاد کراؤ یہ قصہ“۔ میں نے اُس سے کہا ”نعمت صاحب، آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔“

اُس نے ماتھے پہ تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک اور پیگ اپنے گلاس میں۔ تین چار پیگ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے، انتقاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود سوکھی جسے انگریزی میں نیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا برا حال کر لیا ”لعنت ہو تم پر!“

”یعنی یہ کیا موقعہ تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔“

اُس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اور وہ رومال سے اپنا مُنہ پونچھ رہا تھا ”کچھ دیر چُپ رہو میری جان ——— دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی ——— اُنھوں نے بڑے طنز سے کہا، کہو صاحبزادے، مجھے بڈھا سمجھتے ہو ——— وہ تم نے ضرب المثل نہیں سنی ——— نیا ایک دن، پرانا سو دن ——— میں نے اُن سے عرض کی، کرنل صاحب، آپ کا میرا کیا مقابلہ ——— مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کمبخت اِس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جب اِس عمر کو پہنچوں گا تو خودکشی کر لوں گا ——— اس مُنہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں، میری آئرن پہ نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ کرنل ہو گا تو اپنے گھر میں۔ اِس نے کبھی پھر اُس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسہ جماؤں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آ جائے گا۔“

دیر تک اُس بڈھے کھوسٹ سے آئرن ——— جو ایت ہماری پیاری آئرن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ وِسکی کا دَور چل رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پہ بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اُس سے کہا ”کرنل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے، وہ خود بڈھا ہے۔“

آپ تو ماشا اللہ دھان پان ہیں!"

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی۔ اس میں فوجیوں کو اجازت تھی۔ اتوار تھا، اس لئے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سوٹ پہن کر وہاں پہنچا۔ سات بجنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے۔ میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا، تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے ——— کرنل عثمانی صاحب آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا بوسہ لے رہے تھے ——— مجھے احساس ہوا۔ میں اس کرنل سے کہیں زیادہ بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔

انارکلی

(یکم جون ۵۴ء)

نام اس کا سلیم تھا، مگر اس کے یار دوست اسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لئے کہ اس کے خدوخال مغلئی تھے خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعونت ٹپکتی تھی۔

اس کا باپ پی، ڈبلیو، ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ہو گی، مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا۔ ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ جیب خرچ بھی اس کو کافی ملتا تھا، اس لئے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔

بہت بن ٹھن کے رہتا۔ اس کے پاس کئی سوٹ کئی قمیصیں تھیں، جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شو کم از کم بیس کے قریب ہوں گے۔

جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اس پر جان چھڑکتی تھیں ـــــ مگر وہ بے اعتنائی برتتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا، لڑ گئی۔ سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کا التفات حاصل کر لے گا۔ ـــــ نہیں، وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں میں گر پڑے گی اور اس کی ممنون و متشکر ہوگی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا "آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں ـــــ لائیے یہ مجھے دے دیجئے ـــــ میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

سیما نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا "آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ـــــ بہرحال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔"

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا ـــــ چند لمحات کے لئے وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا "عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

آپ تو ماشاءاللہ جوان ہیں!

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی۔ اس میں ڈچیوں کو اجازت تھی۔ اتوار تھا، اس لئے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سوٹ پہن کر وہاں پہنچا۔ سات بجنے میں ابھی نو منٹ باقی تھے۔ میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا، تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے —— کرنل عثمانی صاحب اُس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا بوسہ لے رہے تھے —— مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اُس کرنل سے کہیں زیادہ بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔

انارکلی

(یکم جون ۵۴ء)

نام اس کا سلیم تھا، مگر اس کے یار دوست اسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لئے کہ اس کے خد و خال مغلئی تھے۔ خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے وجاہت ٹپکتی تھی۔

اس کا باپ پی، ڈبلیو، ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ہو گی، مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا۔ ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ جیب خرچ بھی اس کو کافی ملتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔

بہت بن ٹھن کے رہتا۔ اس کے پاس کئی سوٹ تھے، کئی قمیصیں تھیں، جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شو کم از کم بیس کے قریب ہوں گے۔

جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اس پر جان چھڑکتی تھیں —— مگر وہ بے اعتنائی برتتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا، لڑ گئی۔ سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کا التفات حاصل کرے گا —— نہیں، وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں میں گر پڑے گی اور اس کی ممنون و متشکر ہو گی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا "آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں —— لائیے، یہ مجھے دے دیجئے —— میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

سیما نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا "آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں —— بہرحال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔"

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا —— چند لمحات کے لئے وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا "عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے —— مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا۔ "عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ——— مگر فی الحال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ——— آپ کی پیش کش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں ——— اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔ شہزادہ سلیم جو انارکلی کے خواب دیکھ رہا تھا، آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اس نے بہت بڑی طرح شکست کھائی تھی۔

اس سے قبل اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آچکی تھیں، جو اس کے ابرو کے اشارے پر چلتی تھیں ——— مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے کو ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے۔ جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حسین ہے، مگر مجھے ٹھکرا دینا ——— یہ بہت بڑی زیادتی ہے ——— میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا ——— چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں، مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جرم کر بیٹھتا، مگر اسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا مصور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا، مگر تقدیر نے اس کی مدد کی۔ اس کی والدہ نے اس کے لئے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی بہن کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات پکی ہو گئی، مگر سلیم نے انکار کر دیا۔ اس پر اس کے والدین بہت ناراض ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔

سلیم کے والد ذرا سخت طبیعت کے تھے۔ انھوں نے اس سے کہا، "دیکھو، تمھیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہو گا۔"

سلیم ہٹ دھرم تھا، جواب میں یہ کہا "آپ کا فیصلہ کوئی ہائی کورٹ کا فیصلہ نہیں ——— پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سنا رہے ہیں"

اس کے والد کو یہ سن کر طیش آ گیا "تمھارا یہ جرم ہے کہ تم ناخلف ہو ——— اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول حکمی کرتے ہو میں تمھیں عاق کر دوں گا۔"

سلیم کا جوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا "لیکن ابا جان، شادی میری مرضی کے مطابق تو ہونی چاہیئے۔"

"بتاؤ، تمھاری مرضی کیا ہے؟"

"اگر آپ ٹھنڈے دل سے سنیں تو میں عرض کر دوں۔"

"میرا دل کافی ٹھنڈا ہے ——— تمھیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو ——— میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔"

سلیم نے رک رک کے کہا "مجھے ——— مجھے ——— ایک لڑکی سے محبت ہے۔"

اس کا باپ گرجا "کس لڑکی سے؟"

سلیم تھوڑی دیر ہچکچایا "ایک لڑکی ہے۔"

"کون ہے وہ؟ ——— کیا نام ہے اس کا؟"

"سیما ——— میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔"

"میاں افتخار الدین کی لڑکی؟"

"جی ہاں، اُس کا نام سیما افتخار ہے ——— میرا خیال ہے وہی ہے۔"

اُس کے والد بے تحاشہ ہنسنے لگے "خیال کے بچے ——— تمہاری شادی اسی لڑکی سے قرار پائی ہے ——— کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟"

سلیم بوکھلا سا گیا ——— یہ سلسلہ کیسے ہوگیا، اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہیں اُس کا باپ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا ——— سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اُس کا جواب اُس کے والد کو نہیں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے کڑک کر پوچھا "سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما تمہیں پسند کرتی ہے؟"

سلیم نے کہا "جی نہیں۔"

"تم نے یہ کیسے جانا؟"

"اُس سے ——— اُس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں ——— محبت کا اظہار کیا ——— لیکن اُس نے مجھے ———"

"تمہیں وہ خورِ اعتنا نہ سمجھا۔"

"جی ہاں ——— بڑی بے رُخی برتی۔"

سلیم کے والد نے اپنے گنجے سر کو تھوڑی دیر کے لئے کھجلایا اور کہا "تو پھر یہ رشتہ نہیں ہونا چاہیئے ——— میں تمہاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لڑکا رضامند نہیں۔"

سلیم ایک دم جذباتی ہوگیا "نہیں، ابّا جان ——— ایسا نہ کیجئے گا۔ شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی ——— لیکن آپ اُن لوگوں کو ——— میرا مطلب ہے سیما کو یہ پتہ نہ لگنے دیجئے کہ اُس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے، جس سے وہ بے رُخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔"

اُس کے باپ نے اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیرا "میں اس کے متعلق سوچوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ انھیں ایک ٹھیکیدار سے رشوت وصول کرنا تھی۔ اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں۔

شہزادہ سلیم جب رات کو پلنگ پر سونے کے لئے لیٹا تو اُسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں۔ ساری رات وہ اِن کے خواب دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آیا ہے ——— شاہانہ لباس پہنے۔ اسپ تازی سے اُتر کر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے ——— کیا دیکھتا ہے کہ سیما انار کے بوٹے کی سب سے اونچی شاخ سے ایک نوخیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے ——— اُس کی بھاری بھرکم کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں ——— زُلفیں اُلجھی ہوئی ہیں، اور وہ اُچک اُچک کر اُس شاخ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے، مگر ہر بار ناکام رہتی ہے۔

وہ اُس کی طرف بڑھا۔ انار کی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اُس نے اُس شاخ کو پکڑا اور جھکا دیا۔ سیما نے وہ کلی توڑ لی جس کے لئے وہ اتنی کوشش کر رہی تھی ——— لیکن فوراً اُسے اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ نیچے کیسے جھک گئی۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ شہزادہ سلیم، اُس کے پاس پہنچ گیا۔ سیما گھبرا گئی، لیکن سنبھل کر اُس نے اپنی کتابیں اُٹھائیں اور بغل میں دابیں، انار کلی اپنے جوڑے میں اُڑس لی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چلی گئی "آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی ——— بہرحال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔"

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ سیما، اُس کی بھاری بھرکم کتابیں، انار کی کلیاں اور شادی کی دھوم دھام۔

شادی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم نے اس تقریب پر اپنی انارکلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ اُس لمحے کے لیے تڑپ رہا تھا جب سیما اُس کی آغوش میں ہوگی۔ وہ اُس سے اتنا پیار کرے گا کہ وہ تنگ آ کر رونا شروع کر دے گی۔

سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اُس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت جب رو رہی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے۔ اُس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو اُس کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں جن سے اُسے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔

رات کے دس بجے دولہن کو حجلۂ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔ سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اُس کمرے میں جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور رسم و رسوم سب ختم ہو گئی تھیں۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دولہن گھونگھٹ کاڑھے ریشم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کرایا تھا کہ پھول انار کی کلیاں ہوں —— وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اور دولہن کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا —— اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی بغل میں کتابیں ہوں گی جن کو وہ اُٹھانے نہیں دے گی۔ آخر اُس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اُس سے کہا: "سیما ——"

یہ نام لیتے ہی اُس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اُس نے پھر جرأت فراہم کی اور اپنی دولہن کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھا دیا اور بھونچکا رہ گیا ——

یہ سیما نہیں تھی، کوئی اور ہی لڑکی تھی —— انار کی ساری کلیاں اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ مرجھا گئی ہیں۔

کمیشن

(۲؍جون ۱۹۵۴ء)

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ نظریں روبرو۔ شہنشاہ عالم لنچ کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ ۔ ہیڈ بٹلر کہاں ہے؟

چوبدار ایک بہت بڑی ڈش پر سے سرپوش اٹھاتا ہے۔ ہیڈ بٹلر پھدک کر باہر نکلتا ہے اور فرشی سلام عرض کرتا ہے۔

ہیڈ بٹلر ۔ غلام سلوٹ بجا لاتا ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ ۔ دسترخوان پر بدولت کے کیا کیا چیز حاضر ہے؟

ہیڈ بٹلر ۔ گوشت پلاؤ۔ ماہی پلاؤ۔ مٹر پلاؤ۔ نارنگی پلاؤ۔ متنجن۔ بریانی۔ زردہ۔ روغن جوش۔ قورمہ۔ نار گوشت۔ بھنڈی گوشت۔ مرغ گوشت۔ پائے کا شوربہ۔ قیمہ۔ میسا۔ چکن کٹلس۔ پوٹیٹو کٹلس۔ مٹن کٹلس۔ چکن چاپس۔ مٹن چاپس۔ پوٹیٹو چاپس ——— اور خدا جہاں پناہ کو سلامت رکھے ——— ارہر کی دال۔

شہنشاہ ۔ (غصے میں) ارہر کی دال بدولت کو بالکل پسند نہیں۔

ہیڈ ٹیلر ۔ یور مجسٹی ——— آج کل پوتیوں اشتہار کی ولایتوں کے مقدر بہ اعظم ہو رہی ہیں ——— اس لئے ———

شہنشاہ ۔ (خوش ہو کر) ماہدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہو کر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ ٹیلر ۔ میری سانس رک جائے گی عالم پناہ۔

شہنشاہ ۔ (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو ——— اچھا ماہدولت تمہیں سر کا خطاب عنایت فرماتے ہیں۔

ہیڈ ٹیلر ۔ جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ ۔ اور کس صفائی سے ——— ہینگ لگی نہ پھٹکری۔

ہیڈ ٹیلر ۔ غلام سیلوٹ بجا لاتا ہے یور مجسٹی۔

دروازہ کھلتا ہے ——— چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار ۔ با ادب، با ملاحظہ۔ ہوشیار۔ نظر بہ روبرو۔ با ادب با ملاحظہ، ہوشیار۔ نظر بہ روبرو ——— ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے ——— ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ ۔ جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا؟ ——— میں اپنی خادماؤں کے سر میں جوئیں ڈلوا رہی تھی۔

شہنشاہ ۔ کیوں؟

ملکہ ۔ رعایا کے لئے میں ایک بلڈ بینک کھولنا چاہتی ہوں۔

شہنشاہ ۔ امور سلطنت سے تمہاری یہ دلچسپی ماہدولت کے لئے باعث مسرت ہوئی۔

ہیڈ ٹیلر ۔ رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص ملکہ اس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ ۔ پہلے یہ بڑی مشہور تھا کہ فلاں بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے ——— لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر اور بکریاں اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حلقۂ امکان میں لانے کے لئے ماہدولت کو تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ ٹیلر ۔ اس میں کیا شک ہے۔

گھنٹی کی آواز آتی ہے

شہنشاہ ۔ (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بلایا ——— یہ کون فریادی ہے، جس نے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کو جنبش دی؟

ملکہ ۔ جہاں پناہ، کیا اسی وقت جھروکے میں تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ ۔ اسی وقت، اسی گھڑی۔ جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سن لیں گے، اس کی دال ہم پر حرام۔ ہم ابھی جھروکے میں جا کر فریادی سے

کریں گے ——— معلوم ہوتا ہے اس پر کوئی ظلم ہوا ہے۔

چوبدار تین مرتبہ ریپ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار ——— نگاہیں روبرو ——— شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ، ملکہ اور ہیڈ ٹیلر تینوں جھروکے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ یہ کون تھا، جس نے ہمارے عدل، انصاف کی آہنی زنجیر ہلائی اور ہمارا انصاف چاہا۔

فریادی۔ یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ تمہارے ساتھ پورا انصاف ہوگا فریادی ——— دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی۔ عالم پناہ۔ آج کل ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے ہوتے ہیں، باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہ۔ مطمئن رہو فریادی۔ دودھ کے یہ دو قطرے بھی علیحدہ کر کے دکھا دیئے جائیں گے ——— بولو ——— بے خوف و خطر ہو کے بولو کہ تمہیں کس نے ایذا پہنچائی ہے ——— کیا ملکۂ عالم کے سپاہیوں سے تمہاری بیوی . . .

فریادی۔ نہیں عالم پناہ۔ ملکۂ عالم کے سپاہی کے ہاتھ سے میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔

شہنشاہ۔ تاریخ نے اس کا مطلب ہے، خود کو نہیں دہرایا ——— یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے ——— بولو، تم کام کیا کرتے ہو؟

فریادی۔ عالم پناہ کے سائے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔

شہنشاہ۔ کپڑے گھاٹ پر تم دھوتے ہو؟

فریادی۔ نہیں عالم پناہ ——— یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

شہنشاہ۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے ——— اب بتاؤ تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

فریادی۔ جہاں پناہ مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے ——— میرے پاس الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں۔

شہنشاہ۔ ہوں (تھوڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد) فریادی تم کوئی فکر نہ کرو ——— ہم الفاظ کا بندوبست کر دیتے ہیں ——— ہیڈ ٹیلر!

ہیڈ ٹیلر۔ غلام حاضر ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا۔

ہیڈ ٹیلر۔ غلام اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ۔ اب خود کو اس قدر افزائی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمہیں وزیر الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں، تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ ٹیلر۔ غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کریگا۔

شہنشاہ۔ تم مطمئن ہو فریادی؟

فریادی۔ میں بالکل مطمئن ہوں عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ، جاؤ، فریادی کی فریاد رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ ٹبلر۔ کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لئے درخواست کرتا ہے۔

شہنشاہ۔ بادولت دو ماہ کی مہلت عطا فرماتے ہیں۔

ہیڈ ٹبلر۔ شکریہ!

فریادی۔ شکریہ۔

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ ——— ہوشیار ——— نظریں روبرو ——— شہنشاہ عالم دو مہینے کے بعد لانڈری والے کیس کے متعلق ہیڈ ٹبلر المعروف وزیر الفاظ کی رپورٹ سننے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ جھروکے میں تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ، لانڈری والے فریادی کی رپورٹ موزوں و مناسب الفاظ میں تیار ہوئی۔

ہیڈ ٹبلر۔ دو مہینے کی مسلسل محنت و مشقت اور عرق ریزی کے بعد بندہ ہیچمدان ایک کروڑ الفاظ کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو پبلک کی آگاہی کے لئے سرکاری پریس میں چھپ رہی ہے۔

شہنشاہ۔ فریادی ——— وزیر الفاظ کے اس کام سے کیا تم مطمئن ہو۔

فریادی۔ قطعی طور پر عالی جاہ ——— کام بڑے سلیقے سے ہو رہا ہے۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ ——— ہم تھوڑے عرصے کے لئے تمہیں وزیر خلاصہ بنا کر اس رپورٹ کا خلاصہ پوچھنا چاہتے ہیں، جو پبلک کی آگاہی کے لئے پریس میں چھپ رہی ہے۔

ہیڈ ٹبلر۔ رپورٹ کا اصل خلاصہ یہ ہے عالم پناہ ——— فریادی ایک بہت بڑی لانڈری کا مالک ہے۔ اس لانڈری میں تمام کپڑے صابن سے نہیں، کسی اور ہی چیز سے دھوئے جاتے ہیں جس کا نسخہ صرف فریادی ہی جانتا ہے۔

فریادی۔ یہ نسخہ سینہ بسینہ چلا آ رہا ہے عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ خوب!

ہیڈ ٹبلر۔ ڈرائی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی۔ غلام پٹرول کا سارا کوٹہ بلیک مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

شہنشاہ ۔ جنت خوب۔

ہیڈ ٹیلر ۔ فریادی کی لانڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ اِن کو سینہ بہ سینہ چلنے والے اصول کے مطابق وہی تنخواہ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں کے عہد میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار مہینے ہوئے محسوس کیا کہ اُس کے یہ تنخواہ پانے والے اس کا صابن کھا رہے ہیں۔

شہنشاہ ۔ فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا۔

فریادی ۔ اُن کا رنگ دن بدن اُجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ۔

شہنشاہ ۔ درست!

ہیڈ ٹیلر ۔ اُنھوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی ـــــ اس غریب کا پٹرول پینا بھی شروع کر دیا۔

شہنشاہ ۔ فریادی ـــــ پٹرول پینے کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟

فریادی ۔ عالم پناہ ـــــ اُن کی دھواں دھار تقریروں نے غمازی کی۔

شہنشاہ ۔ درست۔

ہیڈ ٹیلر ۔ پے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اِس بلاخوری اور بلانوشی سے تنگ آ کر فریادی نے ایک اور کپڑے سُکھانے کے لئے اُن کو اُس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہزادیاں چاند ماری سیکھتی ہیں۔

شہنشاہ ۔ (فکرمند ہو کر) والاشان شہزادیوں نے اِن بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟

ہیڈ ٹیلر ۔ ایسا ہی ہوا جہاں پناہ ـــــ شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سات سو دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ ہے جو والاشان شہزادیوں کا نشانہ دُرست کرنے کے لئے ہر ہفتے فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ ۔ دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہیڈ ٹیلر ۔ عالم پناہ کا ارشاد بالکل بجا ہے ـــــ ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین چنانچہ فریادی کو اُن کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

فریادی ۔ غلام کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اُس نے تنگ آ کر اُن کو اُس میدان کی طرف بھیجا جہاں والاشان شہزادیاں نشانہ درست کرتی ہیں ـــــ لیکن اُن کی افسوسناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

شہنشاہ ۔ غور کرنے کے بعد ما بدولت بھی اِسی نتیجے پر پہنچے ہیں ـــــ تاریخ میں اِس سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقعے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن ہم عہدِ جدید کے شہنشاہ ہیں ـــــ جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ـــــ خون کا بدلہ صرف خون ہے۔

ہیڈ ٹیلر ۔ کیا والاشان شہزادیاں، خاکم بدہن ـــــ

شہنشاہ ۔ وزیرِ الفاظ، ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔

چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار - باادب، باملاحظہ، ہوشیار ——— نظر روبرو ——— ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکۂ عالیہ کی سواری بال کھولے ہوئے آتی ہے

ملکہ - جہاں پناہ ——— یہ میں کیا سن رہی ہوں۔

شہنشاہ - خون کا بدلہ خون ——— ہماری مملکت کے ہر در و دیوار سے یہی صدا آرہی ہے ——— خون کا بدلہ خون ——— کوئی خون بہا نہ ہوگا۔

ملکہ - جہاں پناہ!

ہیڈ ٹیلر - عالم پناہ!!

فریادی - ساڑھے سات سو دھوبیوں کے، گیتی پناہ، خون کا بدلہ خون نہیں چاہئے ——— فی دھوبی پانچ روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ - نہیں ——— مابدولت اپنے دامنِ عدل پر جہانگیر کی طرح کوئی دھبہ نہیں لگنے دیں گے ——— خون کا بدلہ خون ہے ——— خون بہا نہیں ——

وزیر بے الفاظ - والاشان شہزادیوں کی تعداد کیا ہے؟

ہیڈ ٹیلر - پچھلے برس کے اعداد و شمار کے مطابق والا قدر شہزادیوں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی تھی۔

ملکہ - ان میں میری کوئی دختر نیک اختر شامل نہیں ——— پھر بھی میں جہاں پناہ سے درخواست کرتی ہوں کہ ———

شہنشاہ - ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ ——— خون کا بدلہ خون ہے۔

فریادی - جہاں پناہ ——— اُن ساڑھے سات سو دھوبیوں میں خون کا صرف ایک قطرہ تھا۔

شہنشاہ - تمہیں کیسے معلوم ہے؟

فریادی - اُن کا سارا خون نچوڑ کر میں نے صرف ایک ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا، تاکہ اُن میں زندگی کی رمق باقی رہے۔

شہنشاہ - مابدولت کی نگاہِ عدل میں خون کے ایک قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اِس سے پیشتر کہ رجعت پسند قوتیں ہمیں گمراہ کریں، مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لانڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی شانِ غیر جانبداری برتیں گے ——— خون کا بدلہ خون ہے ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ والاشان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن اِسے دھوبیوں کے سرخ خون کا بدلہ دینا ہوگا ——— ہر چہار اکناف اعلان کر دیا جائے کہ مابدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لئے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ ٹیلر - کمیشن!

ملکہ - کمیشن؟؟

فریادی - کمیشن؟؟؟

شہنشاہ - ہاں ——— کمیشن ——— یہ کمیشن ملک کے چار بڑے دھوبیوں، دو سب سے بڑے ڈرائی کلینروں اور چھ خطاب یافتہ سرکاری لوگوں پر مشتمل ہوگا ——— ہیڈ ٹیلر جس کو ہم نے پہلے سر کا خطاب عنایت فرمایا تھا اور بعد میں وزیر بے الفاظ بنا دیا تھا۔ اِس کمیشن کا صدر ہوگا۔

ہیڈ ٹیلر ۔ ظلم ہے اتنا بڑا کام سرانجام نہیں دیا جا سکے گا یہ بجھتی ۔
شہنشاہ ۔ بادولت کو اس کا علم ہے ——— ہماری صدارت میں تحقیقاتی کمیشن جو بھی اپنی رپورٹ مرتب کریگا ۔ عوام کی کامل تشفی کے لئے بادولت اس کمیشن پر ایک اور کمیشن بٹھا دیں گے ۔ تاکہ عدل و انصاف کی نگاہ سے کوئی گوشہ ، کوئی کونہ پوشیدہ نہ رہے ۔
ہیڈ ٹیلر ۔ عالم پناہ عوام کی تشفی پھر بھی نہیں ہوگی ——— انکار ان کی سرشت میں داخل ہے ۔
شہنشاہ ۔ (فکرمند ہو کر) عوام کی تشفی بہت ضروری ہے ——— سب سے مقدم ہے ۔ ہم اس وقت تک کوئی فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل مطمئن ہیں ——— ہم اعلانیہ کہہ کر چنانچہ ہم سب سے پہلے ، سب سے ضروری کمیشن بٹھاتے ہیں ——— اس کا نام شاہی کمیشن ہوگا ۔
ہیڈ ٹیلر ۔ عالم پناہ زندہ باد ۔
ٹلر ۔ عدل و انصاف زندہ باد !!
آبادی ۔ شاہی کمیشن پائندہ باد ۔

سیاہ حاشیے

فسادات کے بارے میں منٹو نے جن جن لطیف
باتوں کو دیکھا اور سنا انہیں بھی قلمبند کر دیا تھا۔

جوتا

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں، اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے منہ پر تارکول مل دیا۔ دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کئے اور ان کا ہار بنا کر بُت کے گلے میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ اور پولیس آگئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ جوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لئے اُسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

○

حلال اور جھٹکا

"میں نے اس کی شہ رگ پر چھری رکھی۔ ہولے ہولے پھیری اور اس کو حلال کر دیا۔"

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"کیوں؟"

"اس کو حلال کیوں کیا؟"

"مزا آتا ہے اس طرح۔"

"مزا آتا ہے کے بچے، تجھے جھٹکا کرنا چاہیئے تھا ـــــ اس طرح۔"

اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا۔

○

رعایت

"میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔"

"چلو اسی کی مان لو ـــــ کپڑے اُتار کر ہانک دو ایک طرف۔"

○

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں ـــــ دیکھو ابھی جان باقی ہے۔"

"رہنے دو یار ـــــ میں تھک گیا ہوں۔"


فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
کپڑوں کو چمک کرانے آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں جبکہ سن لائٹ کا فوری
جھاگ اسی کام کو نصف وقت میں کر دیتا ہے اور پھر کس خوبی سے کپڑوں کو
خوب نکھر دیتے ہیں اور دھو ڈالتے منٹوں میں آپ کے سفید کپڑے
شفاف اور رنگین کپڑے چمکدار ہو جائیں گے۔ اگر آپ چاہتی ہیں
کہ آپ کے کپڑے زیادہ دنوں تک کام دیں تو آپ آج ہی سے
سن لائٹ صابن کا استعمال شروع کر دیجئے۔
SUNLIGHT
سن لائٹ صابن


فطاری
اور
سحری
کیلئے
خالص ڈالڈا
سے پراٹھے کو ذائقہ دار بنائیے
ڈالڈا کو ہر ایک کوئی پسند کرتا ہے، کیونکہ یہ ہر قسم کے کھانے پکانے کیلئے موزوں ہے۔ کیونکہ یہ ذائقہ دار اور قوت بخش بھی ہے! یہ خالص ہے اور اسکی تیاری میں اسکو ہاتھوں سے چھوا نہیں جاتا۔ مہر بند ڈبوں میں آپ اسے ہمیشہ صاف اور تازہ پائیں گے۔
ڈالڈا ونا سپتی

(۳)

منٹو کی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا انتخاب

(یہ انتخاب بھی منٹو کا ہے)

جب میرے اور منٹو کے درمیان منٹو نمبر چھاپنے کی بات چیت ہوئی تھی۔
تو میں نے کچھ منتخب تخلیقات کی شمولیت پر بھی زور دیا تھا اُس وقت
انھوں نے جن جن کہانیوں کے نام بتلائے تھے۔ وہی پیش کی جا رہی ہیں۔
سوائے "نیا قانون" "شہید ساز" اور "سیاہ حاشیے" کے چند لطیفوں کے

(محمد طفیل)

ہتک

("منٹو کے افسانے" میں سے)

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بیحد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے!

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے ——— دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے۔ جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے، دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے

کنڈوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار کنڈوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اُڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

اِن تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر، یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی۔ جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لَو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے، البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لیکر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھود رکھا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سُنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا ــــــ "اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ ــــــ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! ــــــ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اُڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ــــــ سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ــــــ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصّوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا ــــــ "سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر ــــــ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اُتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار ــــــ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ یار آیا کرے تو اُس سے کہا کر ــــــ تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں ــــــ سمجھیں؟ بہت نازک وقت آ گیا ہے میری جان ــــــ اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اُس سے کہا تھا۔ "نیچے سے اِن بم کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سُنکر ہنس دی۔ "جمنا تو سب کو اپنے سر کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا ــــــ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ ــــــ ارے ہاں کل کی بات تجھے سُناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک سپاہی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا ــــــ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی ــــــ ارے وہ تو ڈرنے لگا! ــــــ سُنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اُس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا! ــــــ وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو؟ تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا ــــــ بولا ــــــ روشنی کرو ــــــ روشنی کرو ــــــ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا ــــــ بولا لائٹ ــــــ لائٹ! ــــــ

اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ یہ بمبئی میں تو لاٹ نہ کر دوں گی!" ——— اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی ——— تب کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا "تجھے شرم نہیں آتی مردوے!" ——— وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور بھاگ کر موم بتی بجھا دی! ——— وہ پھر گھبرانے لگا ——— تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا! کبھی اجالا، کبھی اجالا، کبھی اندھیرا ——— ہم کو کھٹ کھٹ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا ——— سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا ——— جمنا، تو بالکل الھڑ ہے، بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے!"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی ——— "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو، اسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو ——— اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ——— اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ——— وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی ——— ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن ——— ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ نہایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں! ——— ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں ——— جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی۔ لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات ——— کوئی کومل بول ——— اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا، مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب بہت بری طرح اس کے قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے ——— ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر ——— انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے! ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ——— وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے! ——— کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو! اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی، اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی! ——— کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا ——— بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے بے شمار گر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی!

ہر ہر قدر بات کو اس کا پُرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم ——— کتنا سُندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو گھول کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اُس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اُس کے اندر داخل ہو جائے اور اُوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود ہی میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اُس مرد سے جو اُس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اُس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اُس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ——— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا تھا ——— "سوگندھی ——— تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اُس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اُس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اُس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اُس کے دن بیتتے چلے جائیں، اُسے کون سے محل کھڑے کرنے تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اُس کا عام نرخ تھا۔ جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اُسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اُس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پُونے سے، بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا۔ تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اُس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا، اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں! ——— سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ ——— اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ ——— چھی چھی چھی ——— دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ——— اب ان ساڑھے سات روپلیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ——— مجھے عورت چاہیئے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیئے؟ ——— مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں! ——— تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں ——— بس یہ دس روپے جن میں سے ڈھائی دلال میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر اُدھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ——— تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ——— کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ——— پُونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے ——— یہ دھندا چھوڑ ——— میں تجھے خرچ دیا کروں گا ——— کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ———؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اُس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا ——— "سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ——— اور پانی کا یہ گھڑا ——— دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ ——— یہ چیتھڑے ——— یہ چندیاں ——— اُف کتنی بُری باس آتی ہے، اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ——— اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ——— اور ——— اور ———"

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے وہ اس کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار بچھونوں، میلے گدّوں اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اُس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔ "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ـــــ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔" مادھو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی ہر بات باون تولے پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اُس نے سوگندھی کو ـــــ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔ "دیکھ سوگندھی! اگر تُو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی ـــــ اگر تُو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ـــــ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا"

نہ مادھو نے کبھی پونے سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا۔ "تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے؟ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں؟" ـــ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے ـــــ لیکن سوگندھی خوش تھی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے سامنے ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ـــــ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی ـــــ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اُس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اُس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اُس کا کتّا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اُس نے کُلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اُس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنّا کر کہنے لگا۔ "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟" ـــــ پھر آواز دبا کر اُس نے ہولے سے کہا۔ "اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا۔ "نہیں" ـــــ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ـــــ بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ـــــ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ ـــــ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ـــــ چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

اُس کی آنکھیں، اُس کے کان، اُس کی باہیں، اُس کی ٹانگیں، اُس کا سب کچھ مرتا تھا کہ اُس سیٹھ کو وہیں دیکھ پائے ——— اُس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ——— صرف ایک بار ... وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری سنبھالے اور اُس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ ——— سوگندھی ——— اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اُس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور ——— اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اُس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اُس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے ——— بالوں سے پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور ——— جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اُس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا: "تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟" ——— آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی؟ ——— سوگندھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کسی کو نہ پایا ——— ارے! یہ تو اُس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے ——— اُس کا دل ——— یہ کیا ہو گیا تھا اُس کے دل کو! ——— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے ——— اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ——— بالکل اُس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رُک جاتا تھا۔ "رات کٹی گن گن تارے" کہتا کہتا "تارے تارے" کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا: "کتنے سندر ہیں!" ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اُس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں کودا: "یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہوئی تھی۔ اس کی شکل و صورت اُن عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی، اُس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ——— بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اُس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اُتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اُڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اُس کے پاس واپس جانے کے لئے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس روپے واپس دے دیئے تھے ——— "مجھ میں کیا بُرائی ہے؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اُکھڑی ہوئی بجری ——— ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں جو اُس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اُس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی تائید کرے ——— کوئی ——— کوئی ———

کوئی اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے "سوگندھی، کون کہتا ہے، تو بُری ہے، جو تجھے بُرا کہے۔ وہ آپ بُرا ہے" ——— نہیں، یہ کہنے کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا "سوگندھی تو بہت اچھی ہے!"

وہ سمجھتی تھی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اُسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے اُن پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ کیوں "ماں" بن رہا تھا ——— وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ——— اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اُس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ——— اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اُس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اُس کے اُوپر جھکا ہُوا آسمان بھی جو میلیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ——— لیکن اُس کے اندر یہ کیا گڑ بڑ تھی؟ ——— وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کر رہی تھی۔ جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ——— اُس کا جی چاہتا تھا اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے، اور جو کچھ اُس کے اندر اُبل رہا ہے۔ اُن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ——— کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بمبے کے پاس کھڑی تھی ——— ہوا کے تیز جھونکے سے اس بمبے کی آہنی زبان جو اُس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اُٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— اُسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ——— اور ———

نہ آئے ——— بلا سے ——— میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں ——— گھر چلتے ہیں۔ اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردِ سری ہی تو ہے ——— چل سوگندھی گھر چل ——— ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ——— فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ——— سیٹھ اور اُس موٹر کی ایسی تیسی ———"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پُوجا کرنے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

جب مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اُس کے رویں رویں پر چھا گیا ——— قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں، مُنہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ اُسے خیال آیا تو اُس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ——— اُس سیٹھ نے ——— پرماتما کرے ... سوگندھی نے چاہا کہ اُس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اُس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ——— اُس کے مُنہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا ——— کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نا تو؟ ——— لے دام دیئے بنا لے جا اسے ——— پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہے، وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ———"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اُس سیٹھ سے ایک بار ——— صرف ایک بار ——— اُس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے ——— نہیں، یہ نہیں، یہ کرے ——— یوں اُس سے انتقام لے ——— نہیں یوں نہیں یوں ——— لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارہ ملنا غیر ممکن ہے تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ——— بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اُس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے

تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے ——— اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ...."

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا: "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ——— اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ——— ہاں بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا: "میں بتاتی ہوں ——— پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا ——— اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا ——— اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپلیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا۔ جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا ——— تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ——— پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں ——— یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "یہ چیتھڑے، یہ چندیاں ——— اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا کے باہر پھینک ان کو ...."

مادھو چلایا "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا: "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے یہاں! ——— تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں .... کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟ ——— بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ ——— میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ ——— چور یا گٹھ کترا؟ ——— اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ ——— بلاؤں پولیس کو؟ ——— پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ———"

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا "سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"تیری ماں کا سر ——— تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا ——— بھاگ یہاں سے، ورنہ ———" سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی "خبردار ——— پڑی رہنے دے وہاں ——— تو جا، تیرے پونہ پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ——— اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ——— ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ——— جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں

مسافر گاڑی کہ اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے .... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے بہت اذیت دے رہا تھا۔ اُس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ اِدھر دماغ کو پُر کرتی تھی۔ اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اُٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سو گئی!

موذیل؎

(سڑک کے کنارے" میں سے)

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ـــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی مصنوعی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ـــ محلے میں تھا جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ـــ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ـــ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ـــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ ب

؎ یہ افسانہ سب سے پہلے 'نقوش' ہی میں چھپا تھا۔ منٹو کے نمائندہ افسانوں کی صورت میں اسے دوبارہ نقوش میں پیش کیا جا رہا ہے۔

رہی تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "نرنجن، یہ ٹھیکے دیکھے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارہ کر لیا کرتا ہے ـــــ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ "یار، تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ـــــ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبئے ہے ـــــ بمبئے۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ـــــ بارہ برس سے۔"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے، اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھومنتر ہے ـــــ یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا ـــــ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لئے اچھا تھا ـــــ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ـــــ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے ـــــ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسرائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ـــــ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا، شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اسی افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ ـــــ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی، جو بری نہیں تھی ـــــ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے ـــ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی

جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چونکائی
جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چھٹی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی
کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو ننگی تھیں میں حیران بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوا میں ابھار

ان پر جم گئی ہیں۔ ... کے گوشت کے ٹکڑے معلوم
ہونٹ ... ننھے موٹے نہیں تھے ... ناک کی ... اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے

ہوتے تھے۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے
ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔
آگے بڑھا تو موزیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف
دیکھا اور ہنسی ——— ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور

اس کے اوپر آ رہی۔ ——— اس کی ننگی ٹانگیں اس کے
جب ترلوچن سنبھلا تو موزیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی
اِدھر اُدھر تھیں اور ... جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موزیل ——— ساری موزیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح

اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔
ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی ... یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے" اور
وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنسا کر راہداری کو ڈوبتے سے باہر چلی گئی۔
ترلوچن کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت
خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پہ
نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی

داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔
ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان
میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں گوڈے گوڈے دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی
بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا
شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔
ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موزیل کے لئے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر
اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔
ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن
اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب
نہیں ہو سکتا۔
جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو ——— یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔"
ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کون سی نازک باتیں ——— تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی ننگی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ـــ ہاں وہ میرے یار ہیں۔ ـــ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی "تم سچ مچ سکھ ہو ـــــ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ـــــ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو ـــــ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ در اصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی ـــــ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی، اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ـــ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ـــــ "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ـــــ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ـــــ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ـــــ تم خوبصورت ہو"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ـــــ تم تکلیف نہ کرو"

ترلوچن چلایا "موذیل"

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔ جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں "خدا کی قسم ـــــ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ـــــ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو اسکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ـــــ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ـــــ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کی داڑھی مونچھ نہیں اُگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خد و خال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنسل دبائے وہ مسکرائی۔ "تمہارے بال بہت ملائم ہیں ——— میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو اسکرٹ صاف ہو سکے گا ——— ترلوچ ——— تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فرسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔ "میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ——— تم کیوں اڑاتی ہو ——— دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ——— میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ——— کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟"

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"پھر ..." ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنسل نکال لی۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ——— میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ "میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن اچھل پڑا۔ "سچ؟"

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔ "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "تو ... تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی۔ "جب ——— تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!"

ترلوچن اس وقت "جو ہو سو ہو" بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔ "میں کل ہی کٹوا دوں گا۔"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ——— تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ "تم دیکھ لو گی۔"

"دیکھ لوں گی۔" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ——— وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیے اور داڑھی بھی منڈوا دی ——— یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے تھوڑی دیر کیا

ئے۔ موذیل رُکی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچن" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس
سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ——— موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ——— ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ——— ایسے ہی چلتا ہے۔"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "شادی کل ہو گی؟"

"ضرور" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا ——— ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری؟ ——— یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ——— اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ——— وہ بے مروت تھی ——— بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے، جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے

کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو ——— مجھے تم سے نفرت ہے!" ——

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ——— اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ——— یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ——— مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ——— تم سکھ ہو ——— مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے ——— یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہیئے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا ——— کرپال کور ——— ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور اور اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری ——— اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ——— بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ——— اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ——— اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ——— اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ——— ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رد عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا: "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کرے ـــــ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی: "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا، تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ـــــ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا: "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں" موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی: "تم گویا کہ ـــــ اب پھر ـــــ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا: "ہاں۔"

"مبارک ہو" موذیل نے ایک کھڑاؤں اتاری اور پانی کے نل پر بجانے لگی: "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "ہاں۔"

"مبارک ہو ـــــ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں۔"

"یہ بہت بری بات ہے" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی: "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا: "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں۔"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی: "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ ... ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ـــــ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بے وفا ہے۔ بے مروت ہے۔ مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا: "موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ـــــ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا: "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ ـــــ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں ۔۔۔ داڑھی میں نے تمہارے دیوالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ۔۔۔ محض انتقامی طور پر ۔۔۔ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ۔۔۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے" ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی "یہ بہت اچھا ہے . . . . مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ۔۔۔ دیکھو کس زور سے کاٹا ہے"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی "کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا "ترلوچن ۔۔۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی "تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ۔۔۔ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل ۔۔۔ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ۔۔۔ کسی بھی معاملے کی نزاکت ۔۔۔ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری "افسوس بی ڈیمڈ ۔۔۔ سلی ایڈیٹ ۔۔۔ تم یہ سوچو کہ تمہاری اس . . . کیا نام ہے اس کا . . . اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے . . . تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے . . . تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے ۔۔۔ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو ۔۔۔ اور بہت ڈرپوک، مجھے نڈر مرد چاہیے . . . لیکن چھوڑو ان باتوں کو . . . چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ۔۔۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے ۔۔۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ۔۔۔ چلو آؤ میرے ساتھ"

"مگر سنو تو ۔۔۔ کرفیو ہے"

"موذیل کے لیے نہیں ۔۔۔ چلو آؤ"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک کر ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری داڑھی ۔۔۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے ۔۔۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو"

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"

"لیکن ٹھیک نہیں۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ——— وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پہ یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ "تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو ——— گدھے کہیں کے ۔۔۔۔۔ اس کی جان کا سوال ہے ——— کیا نام ہے۔ تمہاری اس کور کا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے ——— اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

موذیل چڑ گئی۔ "اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ ——— میں پوچھتی ہوں، کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں ——— اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ——— اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو ——— مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ——— تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں ——— اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں تو پگڑی پہن کر جاؤں گا ——— میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے ——— تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ رہو گے ——— تمہاری وہ ——— کیا نام ہے اس بھڑوی کا ——— جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا ——— تم سکھ ہو ——— خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی باہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ "ڈارلنگ، چلو، جیسے تمہاری مرضی ——— جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی؟"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "نہیں ——— چلے گا اسی طرح۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پہ جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔ "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مسکرائی۔ "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ——— اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا ——— ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں

ان کی روشنی بہار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لاریوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ ابھی خاصی کھاگھی

ہو گی۔ نہ گزرے گا"

ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گذرا ہے نہ گزرے گا"

موذیل آگے آگے تھی۔ نٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن

دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے

کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے

وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ "اے ——— کدھر جا رہا ہے؟"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا: "اوہ، تم ——— ہم کو پہچانا نہیں

تم نے ——— موذیل" پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا "ادھر اس باجو ——— ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے ———

ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے ......"

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا۔ "لو پیو ——"

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا "ہیر از لائٹ!"

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی ——— جس

میں سے گذر کر انہیں ——— محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کرکے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے ———

خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی،

بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں

سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔

موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا: "ترلوچ ڈیئر ——— اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ——— تم ڈرو گے تو ضرور

کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا ——— سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کرکے دوسری گلی میں پہنچے۔ جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی ———

کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا: "کوئی بات

نہیں ——— چلو آؤ"

دونوں چلنے لگے۔ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن

کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا ——— کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے

میں چور ہے۔ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا "اے کیا کرتا ہے ——— اپنے بھائی کو مارتا ہے ——— ہم اس سے شادی

کو مانگنا ہے۔" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی "کریم ——— اٹھاؤ، یہ پات اور رکھ دو اس کے سر پہ۔"
اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا۔
"عیش کر سالی ——— عیش کر۔" پھر اس نے پات اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔
ترلوچن بڑبڑایا "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے۔"
موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا "کوئی ذلیل حرکت نہیں ——— سب چلتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ آؤ۔"
۔ ۔ ۔ وہ تیز تیز چلنے لگی ——— ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔
یہ گلیاں طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"
ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں ——— نکڑ والی بلڈنگ۔"
موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔
جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ——— ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا "ترلوچن ڈیئر ——— یہ پگڑی اتار دو۔"
ترلوچن نے جواب دیا "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا۔"
موذیل جھنجھلا گئی "تمھاری مرضی ——— لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے۔"
سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ——— صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پر اسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی، ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو ایسا کرو ——— میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ——— تم میرے پیچھے آنا ——— بڑی تیزی سے جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ——— سمجھے ——— مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"
موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ——— سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔ "کون سا مالا؟"
ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا۔"
"چلو۔"
یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔
دوسرے مالے پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "مہنگا سنگھ جی ـــــ مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ـــــ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے ـــــ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ـــــ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لئے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "ڈرو نہیں، ترلوچن تمھیں لینے آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ـــــ اور ماتا جی سے بھی ـــ لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی "اسے پکڑ لیا انھوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ـــــ تم یہ کپڑے اتار دو۔"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی باہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازاربند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی "جاؤ، اسے لے جاؤ ـــــ لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا "جاؤ ـــــ جلدی نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا "آؤ" مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے ہوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی باہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ ـــــ تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انھوں نے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا "سنو ـ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے میں دروازہ کھولتی ہوں ۔۔۔۔۔۔"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی: "دروازہ۔"

موذیل نے ترلوچن سے مخاطب ہو کر کہا: "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں —— تم میرے پیچھے بھاگنا —— میں اوپر چڑھ جاؤں گی —— تم بھی آ پیچھے چلے آنا —— یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔۔۔۔"

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ "پھر؟"

موذیل نے کہا: "یہ تمہاری —— کیا نام ہے اس کا —— موقع پا کر نکل جائے —— اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری —— سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی —— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی —— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے —— موذیل کا پاؤں پھسلا —— اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی —— پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہو گئے —— کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی: "موذیل —— موذیل!"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا: "جاؤ، دیکھو —— میرا انڈرویئر وہاں ہے کہ نہیں —— میرا مطلب ہے وہ ۔۔۔"

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا: "تم سچ مچ سکھ ہو ۔۔۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا: "یہ میاں بھائی ہے، لیکن بہت دادا قسم کا ۔۔۔ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے ۔۔۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا —— لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ "اوہ ڈیم اٹ ۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی: "آل رائٹ ڈارلنگ —— بائی بائی۔"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی: "لے جاؤ اس کو —— اپنے اس مذہب کو۔" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو گیا۔

ممی

("یزید" میں سے)

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ میں کیسے آئی، کب سے وہاں تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے حسب و نسب کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون متعلق ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ وہ پونہ کے ہر ذرے سے وابستہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو، مگر پونہ مجھے لئے جو کچھ ہے، اس کے وہی ذرے، اس کے تمام ذرے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں ——— اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پونے ہی میں ہوئی۔ میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھیں گے کہ میں عنقریب کنچن چنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لئے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے، مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کرکے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونے گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں ...... ٹھہریئے میں حساب لگاؤں ...... آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا مگر اس دوران میں وہاں گاڈ کشتریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا، اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ کلفت دور کرنے کے لئے پونہ ہو آؤں۔ وہ بھی اس لئے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگہ لے چکے

شستہ اور نیز وہ صحیح طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لئے آیا تھا اس لئے مجھے یہ بات نگر پہنچ ہی کوئی علت
نہیں تھی تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکثر سے ہی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو
دفعہ جھٹکے سے بازار انسان زنجیروں میں جکڑے ہوئے زبیری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے
بڑی معصومیت سے کہا میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہوگا جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ
ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا ——— وہ صرف واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی ہوٹل ٹائپ کا ایک تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا "روکئے گھوڑے"!

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گول مٹول سی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کر بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردِ عمل اتنا ہی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جوانی
جس کمال کی تھی جو اسے لال لگائی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں
سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا فقرہ
بلند کیا ہوتا، مگر میں عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوایا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائیے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا "ممی جسٹ اے منٹ"
تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا "تم ؟ ——— تم یہاں کیسے آئے" پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری بے تکلف بیوی کی
طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بھابی جان ——— آپ نے کمال کر دیا ——— اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں"۔

میں نے اس سے پوچھا "تم جا کہاں رہے ہو؟"

چڈے نے اونچے سروں میں کہا "ایک کام سے جا رہا ہوں ——— تم ایسا کرو سیدھے ......" وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب
ہوا "دلبر صاحب کے ہاں گھر لے جاؤ ——— کرایہ وغیرہ مت لینا ان سے" ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نپٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا "تم جاؤ نوکر
وہاں ہوگا ——— باقی تم دیکھ لینا"۔

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ
بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا
"بیٹھے صاحب ......"

میں نے پوچھا "کہاں ؟"

اس نے جواب دیا "چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے"۔

"اوہ" میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو وہ
چڈے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں رہنے والے دوست مل جائیں گے۔ گندگی دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے اس لئے وہ ادھر
اُدھر لے گی ——— میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا "چلو"!

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے حیل و حجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ

چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلم والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام برا کیا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہوتا ہے، جو فلموں کا ہیرو ہو۔ اور کسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر مہینے پیچھے ملتی ہے، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈھا آ جائے تو اس کے ساتھ ہی پونا چلے جائیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی تھوڑا بجانِ درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لا اُبالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے، مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈھا کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذاتِ شریف چڈھا صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا: "رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے، معلوم نہیں کدھر گئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا: "کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں؟"

تیل لینے جانا، بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا: "نہیں صاحب... میں تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔"

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈھے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈھا آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا "ویل، ویل —— تو تم آ گئے اولڈ بوائے — چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی... آج شام کو...." میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا "بھابی جان، کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا" پھر اور زور سے ہنسا: "مولویوں کی ایسی تیسی، اشو مشو!" یہاں بیٹھئے جی۔ ہم ابھی آ جائیں گے۔"

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈھا کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں سیٹھ کے سر چڑھ کے چڈھے نے بمشکل دو سو روپے وصول کئے۔ اور دو ڈھائی گھنٹے میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر پڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے بدتر تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمیت اختیار کر گئی تھیں۔

ہوئے گرد و غبار تھی، اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا۔ جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی باہمی فضا کی تکمیل کے لئے لازمی تھی۔ چنڈرے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا "چین کے شہزادے ...... دو تین تھرڈ کلاس رَم کی لے آؤ ___ میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی اور نصف درجن گلاس۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں، دُنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چنڈرے کی زبان پر جس ملک کا نام آجاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا ___ اس وقت چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چنڈرے نے ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس رم کے استقبال میں چٹخاتے ہوئے کہا "دیٹ از دی بیسٹ ___ تم آخر آل تم ادھر آ ہی نکلے ___" لیکن ایک دم متفکر ہو گیا "یار، بھابی کا کیا ہو۔ وہ تو گھبرا جائے گی؟"

چنڈرے بے بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا، وہ کہا کرتا تھا "یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں لیکن بعد میں یہ سوچ کر میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کو کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں۔"

رم فوراً ہی آگئی۔ گلاس بھی چنڈرے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ باقی راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چنڈرے نے اس کی کوئی پروا نہ کی، اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا "تمہارے آنے کی خوشی میں!"

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیئے۔

دوسرا دور شروع کر کے چنڈرے اُٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا "میں شور کرتا ہوں ان کی نیند کھل جائے گی ___ پھر ایسا کریں گے ... ٹھہرو ___ پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی "جمیکا کے شہزادے۔"

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چنڈرے نے اُس سے کہا "دیکھو، ہم سے کہو۔ ایک، دو، فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے ___ ایک دم!"
نوکر چلا گیا۔ چنڈرے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا "میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چنڈرے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا "ٹی از اے جیول ___!" پھر اُس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان جھلا اُٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اُٹھائی اور مجھ سے کہا "آؤ۔"

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چنڈرے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مؤدبانہ کہا "حاضر ہے بیگم صاحب!"

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا، لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا اس لئے اُس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی۔ اور اُس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا "آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!"

میں نے جواب نہ دیا مگر چنڈرے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا ___ "جی ہاں یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے، لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔"

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھلکھلا کے ہنسا "ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سؤر ہیں .... جن پر ہر حرام شئے حلال ہے! ___ چلیئے اب ہم آپ

سب ٹھیک چھوڑ آئیں !

میری بیوی کو پھر چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ در اصل اس کو چڈے ہی سے نفرت تھی ایک یوں سمجھئے کہ میرے بے پرواہی سے نفرت تھی لیکن چڈھا تو میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے
سے بہت کھلتا تھا، اس لئے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حد سے بھی بڑھ جاتا تھا مگر چڈے کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے
بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی ان ڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کہیں گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے
جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی: "کبابستان کے شہزادے ——— ایک سوڈا لگاؤ، جلدی
ساتھ فرسٹ کلاس قسم کا!"

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت
نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جایا کرتے ہیں۔ جو ہم دیکھ کر بھی نہیں سہتے۔ ان کو بسر کرنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گذر
جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کیفیت شعارانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ سوڈا ولائتی قسم کا
مانگ کے لے آیا۔ ہم پی پلا کے تکمبر روانہ ہوگئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا انکوائری کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی، چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا: "خربوزہ خربوزے
کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "چلو منٹو، اسٹینڈ میں
تمام بندوبست کر چکا ہوں۔"

چڈے کو ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو کچھ سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری
بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا: "یہ تو ہو گیا ——— اب کیا پروگرام ہے؟" پھر کھلکھلا کر ہنسا
"ڈمی ——— گریٹ ڈمی!"

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا، یہ ڈمی کس قسم آموں کی اولاد ہے، کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی
موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا۔ مگر چڈہ اس کو کبیدہ کاٹیج کہتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب
کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ
ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائرکٹر
کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر، کوئی اس کا نائب، کوئی نائب در نائب۔ ہر دوسرا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیاد ڈالنے
کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہ
تھا۔ وہ چیزیں بھی جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں، یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ پکچر ضرور دیکھتے
ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ۔ جیتتے شاذ و نادر تھے اگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لئے موٹر گراج بھی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں
کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید محض یکسانیت توڑنے کے لئے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم
نہیں وہ کب آتا تھا ——— اور کب جاتا تھا کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا ——— شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جب

سیدھے کالج ... کے اوقات میں بیدار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔
کالج کا سنہ زیست چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی اکٹھے تھے مگر سید نہیں تھے۔ ایک سید صاحب کا فلمی نام رحمت کا رتھا
پنڈی کا کاتب تھا۔ سعید کالج اس عنوانات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ ... کا نام کبیر کا بیج ہی تھا۔ خوش شکل تھا اور بہت کم گو چڈہ کبھی کبھی اُٹھ کر اپنا تختہ اس سے لگا کر وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے لڑکے کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اُسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں بمبئی بھاگ آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اُس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لیے تھے وہ بھی چڈے سے کہ اُس پر ایک بڑے تنگ ارتجان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ ادب لطیف قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اُس کا شغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیا کرتا تھا۔ کالج کا ہر شخص اُس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عتیق دو بھائی تھے۔ دونوں کمسن اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نہند نام زنگی کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

ان تینوں یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کالج کے ... سے ہی ... تو ان میں سے ایک آ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی وہ اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اُس کو سودا سلف لا دیا۔ کبھی لانڈری میں اُس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور کبھی اُس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کوئی وہ ظاہر کرتی بھی نہ تھا۔ سب کے سب مسرور تھے۔ شاید ... کی پڑی۔ وہ اپنے حالات کی ناسازی کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ رہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ ... گنے اُس نے کچھ غریب نواز کو دیئے اور کہا: "چار ریڈ لیبل اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجیے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔"

غریب نواز کے حیدرآبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اُس نے غریب نواز سے کہا۔ "یہ مسٹر ... ہیں .... لیکن ان سے متعلق ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ گرم چیز ہیں۔ شام کو اسکاچ آ جائے تو .... لیکن آپ جائیے۔"

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک نور کی جانی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اُس نے روشنی میں مصلحہ کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی: "قبرستان کے شہزادے۔" جب وہ نمودار ہوا تو اُس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا۔ "گلاس دو ... کم بخت؟"

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکرمند ہو گیا۔ "یار، بھابی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے ——— خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔" پھر اُس نے خود ہی اپنے کو تسکین دلائی: "لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوں گی وہاں؟"

میں نے کہا: "ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی" اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ بسے بر سے گڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے اُس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا ... آباد حصہ نظر آتا تھا۔ اِدھر سے کسی نے بآواز بلند چڈہ کا نام

بیٹھا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائرکٹر ون کرتسے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے، منگولی ہے، حبشی ہے، آریہ ہے، یا کیا بلا ہے۔ میں اُس کے کسی خد و خال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اُس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آ جاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑتا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا، مگر شیواجی کی تیکھی ناک کے بجائے اُس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی جو اُس کے خیال کے مطابق اُن سُروں کے لیے بہت ضروری تھی، جن کا تعلق براہِ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اُس نے مجھے دیکھا تو چلایا۔ "منٹو ——— فنٹو مینٹو؟"

چڈے نے اُس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا: "بینڈ کی ایسی تیسی ..... چل اندر آ!"

وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اُس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی: "میں سالا اُدھر ممی کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ تمھارا فرینڈ آئے لا ..... میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے ..... سالا اودم تھا سالا منٹو ہے!"

چڈے نے ون کرتسے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی: "اب چپ کر سالے کے ..... تو رم لے آیا ..... بس ٹھیک ہے۔" ون کرتسے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لیے پیگ تیار کیا: "منٹو ..... یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے ..... میں بولا ایک دم پکا ..... سوچا کیا کروں ....."

چڈے نے ایک اور دھپا اُس کے سر پر جمایا: "بیٹھ بے ..... جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہوگا!"

"سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی بوتل کہاں سے آیا ——— تیرے باپ نے دیا مجھ کو؟" ون کرتسے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڈے نے اُس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اُس سے پوچھا: "تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی؟ ——— پورلی تھی؟ ——— مزوبل کب آئے گی؟ ..... اور ہاں ..... وہ پلیٹنم بلونڈ!"

ون کرتسے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڈے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا: "منٹو ——— خدا کی قسم کیا چیز ہے ——— سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹنم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا ——— بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار ..... گریٹ ——— خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ ..... ممی زندہ باد!" پھر اُس نے قہر آلود نگاہوں سے ون کرتسے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا: "ون کرتسے کے بچے ——— نعرہ کیوں نہیں لگاتا ——— ممی زندہ باد!"

چڈے اور ون کرتسے دونوں نے مل کر "ممی زندہ باد" کے کئی نعرے لگائے۔ اس کے بعد ون کرتسے نے چڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اُس نے اُسے خاموش کر دیا: "چھوڑو یار ——— میں جذباتی ہو گیا ہوں ..... اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں جنھیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے ..... مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے ———" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "منٹو ——— بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں ..... چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا ——— معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی ..... کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے ..... فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے ....."

ون کرتسے نے دوسرا پیگ ختم کیا: "اور اُس میں تھوڑی سی عنبری ایکس رم مکس کر دی جائے؟"

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی: "بکواس نہ کر!" پھر اُس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا: "یار ..... میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں ..... ہاں ..... وہ رنگ ..... خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے ..... وہ تم نے دیکھا ہے ..... وہ جو مچھلی کے پیٹ پر ہوتا ہے ..... نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے ..... پومفریٹ مچھلی ..... اُس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟ ..... نہیں نہیں ..... سانپوں کے ..... وہ ننھے ننھے کھپرے ..... ہاں کھپرے ..... بس اُن کا رنگ ..... کھپرے ..... یہ لفظ مجھے ایک ہندوستانی نے بتایا ..... اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام ..... پنجابی میں ہم انھیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چھنچھناہٹ ہے ..... مہکا .....

بالکل دیہاتی لڑکی کے بارے میں ہے ...... تمہیں ننھی ننھی سنہری بالیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں ......" وہ ایک دم اُٹھا، سنہری بالیوں کی ایسی تیسی! میں جذباتی ہو گیا ہوں۔"

ڈون کارٹر نے بڑے بھونڈے انداز میں پوچھا: "وہ کیا ہوتا ہے؟"

چڈے نے جواب دیا: "سنٹی منٹل ...... لیکن تو کیا سمجھے گا، دیا جی بابو راؤ اور نانا فڑنویس کی اولاد ...... "

ڈون کارٹر نے اپنے لئے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے، میں انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹرک کریٹ ہوں ...... سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا ...... اُس نے ...... "

چڈے نے چوٹ کر کہا: "اُس نے تجھے تان سین بنا دیا ...... تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سُر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں ...... بچپن ہی میں اُس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا اور دودھ پینے کے لئے تو میاں کی ٹوڑی میں روتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں ...... اور تو نے پہلی بات چیت دیپک میں کی تھی۔ اور تیرا باپ ...... جگت اُستاد تھا۔ بیجو باورے کے بھی کان کاٹتا تھا ...... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے۔ اس لئے تیرا نام کن کٹّا ہے!" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "منٹو ...... یہ سالا جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے ...... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اُس نے کیا احسان کیا اور اُس نے اسے میٹرک پیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی اے کی ڈگری پھاڑ کے پھینک دوں۔"

ڈون کارٹر نے اس پوچھاڑ کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اُس کو وہیں دبا دیا: "چُپ رہ ...... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی مینٹل ہو گیا ہوں ...... ہاں، وہ رنگ ...... پومفریٹ مچھلی کے ...... نہیں نہیں ...... سانپ کے ننھے ننھے کھپرے ...... بس ایسی کا رنگ ...... ہم نے خدا معلوم اپنی بین پر کونسا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا؟"

ڈون کارٹر سوچنے لگا: "پیلو میں بجاتا ہوں؟"

چڈہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا: "جیتے رہو میٹرک کریٹ کے چاکلیٹ ......" اُس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا: "منٹو، اگر یہ پیلیٹنم بلونڈ ہٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اُونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا ......" اور اُس نے گلاس خالی کر دیا۔

ڈون کارٹر نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی: "منٹو، رنگ ایک دم جانگی ہے ......"

میں نے کہا: "دیکھ لیں گے۔"

"آج ہی ...... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ مہتاجی نے تمہاری وجہ سے وہ اپڈوانس دے دیا، ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی ...... آج کی رات ...... آج کی رات ......" چڈے نے بڑے بھونڈے سُروں میں گانا شروع کر دیا۔

"آج کی رات سازِ دردِ نہ چھیڑ!"

ڈون کارٹر بیچارہ اُس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔ دونوں کے پاس اسکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انھوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے مگر بے تکلف نہیں۔ اس لئے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اُس پلیٹنم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پیگ پئے تھے۔ نشے کے معاملے میں اُن سب کی سطح اب تک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لئے میرے جذبات

معتدل سلفہ ہی میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بُری طرح فریفتہ تھے۔ جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فولس تھا۔ پونے میں کوئی ہیرڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اُس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اُس پر گرم تھا کہ وہ حیدرآباد میں اپنے حصے کی جائیداد بیچ کر بھی اس کے پاؤں پر لگانے کے لئے تیار تھا۔ چڈھے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا، اپنا قبول صورت چہرہ ... اوّل ترپ کے نازوگرم خود یہ خیال تھا کہ اُس کی پینیس کسے وہ پر ضرور شیشے میں اُتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا ...... لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھئے ممی کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس طیلیم بلونڈ فولس کو وہ عورت جسے میں نے چڈھے کے ساتھ تانگے میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

فولس کی باتیں کرتے کرتے چڈھے نے ایک دم اپنی گھڑی دیکھی، اور مجھ سے کہا: جہنم میں جائے یہ ٹڈیا ۔۔۔ چلو یار ... بھابی وہاں کباب ہو رہی ہوگی ۔۔۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنتی مینٹل نہ ہو جاؤں .. خیر ۔۔۔ تم مجھے سنبھال لینا" اپنے گلاس کے چند آخری قطرے منہ میں ٹپکا کر اُس نے زور کی آواز دی: "غیور سے ملک مصر کے شہزادے!"

ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا، جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کر باہر نکالا ہے۔ چڈھے نے اُس کے چہرے پر زور کے چھینٹے مارے اور کہا: "دو عدد تانگے لاؤ ... جو مصر کے پہلے شہزادے معلوم ہوں۔"

تانگے آگئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے ۔۔۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس قدر دراز جگہ پر بھی اُس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈھے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا، چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیض و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اُس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کے نفسیات کا ماہر تھا۔ بڑی پُرلطف باتیں کیں، اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اُس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اُس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا: "کوئی گانا فلمارہے ہیں آپ؟"

ہریش نے جواب دیا: "جی نہیں ۔۔۔ وہ کل کا پروگرام ہے ... میرا خیال ہے آپ کل چلئے گا۔"

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر سادہ مکھا مکھا کر عاجز آ گئی ہوئی تھی۔ اُس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا: "ہاں کل ٹھیک رہے گا ۔۔۔ آج تو ہمیں سفر کی تھکن بھی ہے۔"

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پُرلطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا: "چلو یار ۔۔۔ تم چلو میرے ساتھ" اور میری بیوی کی طرف دیکھا: "ان کو چھوڑو .... سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔"

میں نے بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا: "ان سے اجازت لے لو۔"

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا: "میں نے بمبئی سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈاکیومنٹ کیس ساتھ لے چلئے، انہوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں ۔۔۔ اب یہ کہانی کیا سنائیں گے؟"

ہریش نے کہا: "زبانی سنا دے گا۔" پھر اُس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا: "ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔"

چڈھے نے اس فیصلے میں تکمیل کا رنگ بھر دیا: "تو بس ہم چلتے ہیں۔" اور وہ تینوں اُٹھ کر سلام نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے ۔۔۔ پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈھے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا: "راجہ ہریش چندر زندہ باد ......"

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اُس کو اپنی ایک بہن سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک سنگلا بنچ تھی۔ شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی۔ مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتہ چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہوگا، مگر اُس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے۔ لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اُس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی، تو میں نے سوچا کہ گردوپیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہوگئی ہے اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں ——— اُن کی جو عمر تھی، وہ وہیں کی وہیں رکی ہے۔۔

لیکن جب میں نے اُس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی پیچھے رہ کر ان کے ماحول کی طرح سنجیدہ و متین طور پر جوان ہو جائے۔

چڈے نے اُس سے میرا تعارف کرایا، جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اُس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا: ”یہ ممی ہے ۔۔۔۔۔ دی گریٹ ممی ۔۔۔“

ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی، اور میری طرف دیکھ کر اُس نے چڈے سے انگریزی میں کہا: ”تم نے چائے منگوائی تھی حسبِ معمول نہایت افراتفری میں ——— معلوم نہیں انہیں پسند بھی آئی ہوگی یا نہیں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: ”مسٹر منٹو، میں بہت شرمندہ ہوں ۔۔۔ اصل میں سارا قصور تمہارے دوست چڈے کا ہے ——— جو بڑا نا قابلِ اصلاح لڑکا ہے۔“

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔ ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا: ”رات کا کھانا تیار ہے ۔۔۔ میں نے اس لئے کیا کہ تم عین وقت پر میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے ۔۔۔۔“

چڈے نے ممی کو گلے سے لگا لیا: ”تم آہ ——— جیول ممی ۔۔۔۔ یہ کھانا اب ہم کھائیں گے!“

ممی نے چونک کر پوچھا: ”کیا؟ ۔۔۔ نہیں، ہرگز نہیں!“

چڈے نے اُسے بتایا: ”مسز منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں۔“

ممی چلائی: ”خدا تمہیں غارت کرے ——— یہ تم نے کیا کیا ———“

چڈہ کھلکھلا کر ہنسا: ”آج پارٹی جو ہونے والی تھی!“

”وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔“ ممی نے اپنا سگرٹ سلگایا۔

چڈے کا دل ڈوب گیا: ”خدا اب تمہیں غارت کرے ۔۔۔ اور یہ سب پلین ہم نے صرف اس پارٹی کے لئے بنایا تھا۔“ وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے کے ہر ذرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ”لو سارے خواب ملیا میٹ ہو گئے ۔۔۔ پلیٹی نم بلونڈ ۔۔۔ اور ننھے ساچ کے ننھے ننھے کھمبوں جیسے رنگ والے بال ۔۔۔“ ایک دم اُس نے اُٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا: ”کینسل کی تھی ——— اپنے دل میں کینسل کی تھی نا ۔۔۔۔ لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں۔“ اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور بآوازِ بلند پکارا: ”ہرے ———!“

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اُس نے بڑی شفقت سے اُس کے گال تھپتھپائے اور کہا: ”تم فکر نہ کرو ۔۔۔ میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چڈے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور وَن کترے سے کہا: ”جنرل وَن کترے ——— جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری توپیں لے آؤ۔“

وَن کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اُس

ہنسے کا ذکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا: "آؤ آؤ ___ میرے کوہ قاف کے شہزادے . . . وہ ___ وہ سانپ کے
ان جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا کہی ہے . . . . . تم بھی قسمت آزمائی کرنا۔"

رحمت کار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ [illegible] کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس میں شک کہ انہوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسب عادت اپنی بانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا۔ [illegible] بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے [illegible] گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ [illegible] مطمئن ہے کہ [illegible] اچھا کھلونا [illegible] کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے . . . شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ . . . اس کا تصور ایک چھوٹی گڑیا کی مانند دماغ میں آتا تھا ___ ہر فضا اور ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے . . . اس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اس کا کوئی سُر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابلِ فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری حالت [illegible] جس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی ممتا کی توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے، غریب نواز اور رنگ کرتے کے لئے موجود ہے . . . اور خدا معلوم اور کس کس کے لئے۔

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا: "یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟"

"اس لئے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے . . . تمہارے اور میرے جیسے الو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں۔ جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور . . . اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے . . . ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں۔ الو کے پٹھے ہیں۔ میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں . . . بیساکھی کا میلہ تھا . . . تمہارے امرت سر میں . . . رام باغ کے اس بازار میں جہاں کنچنیاں رہتی ہیں . . . . جاٹ گزر رہے تھے . . . ایک صحت مند جوان نے . . . خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے۔ جس کی ہر چیز اس کی لاٹھی پر [illegible] کر رہی تھی اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا جس کی [illegible] میں چپڑی ہوئی [illegible] اس کے ماتھے پر بڑے بد نما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹھوکا دے کر کہا . . . اوئے لہنا سنگھاں . . . ویکھ اوئے اوپر ویکھ . . . اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای . . . آخری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا۔ حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا: "اس جاٹ کے لئے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ قاف کی پری تھی . . . اور اس کے گاؤں کی حسین و جمیل مٹیاریں بے ڈول بھینسیں . . . ہم سب چڈے ہیں . . . درمیانے درجے کے . . . اس لئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اول درجے کی نہیں . . . تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی . . . لیکن . . . لیکن وہ . . . خاص الخاص درجے کی چیز ہے . . . وہ سانپ کے کپڑوں . . . . . ."

وان کرتے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا: "کپڑے . . . تمہارا سٹک پھر گیا ہے!"

چڈے نے ملتے ہوئے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیئے اور وان کرتے سے کہا: "لے اب سنا . . . تیرا باپ سالا مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا . . . . . . میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے؟"

وان کرتے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا: "بائی گاڈ . . . . . . وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا . . . . . . میں [illegible] لڑکا تھا کہ اس نے میری

چڈھہ زور سے ہنسا "تمہیں کار ٹون بنا دیا اُس سالے نے ... بنگال سے شوٹنگ میں کیسری کی بیٹی سے کہ وہاں مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری شادی کے لئے کوئی خوبصورت چھوکری ڈھونڈتا ہے"

"تمہاری فیملی کی ایسی تیسی ...... فی لس کی بات کرو ...... اُس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا" چڈھے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے "بگو، پاؤڈر پلوٹ کے بانو ...... سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی ——— میدان چڈھے کے ہاتھ رہے گا ...... کیوں ویلز کے شہزادے ؟"

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈھے نے قہقہہ لگایا اور آخری آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔ غریب نواز اور رنجیت کمار ایک مدت سے فی لس کے بارے میں کھل کے باتیں کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ علیحدہ بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے، کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈھہ مجھ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈھے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط والوں کی۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھیلما اور وہ ایجرٹا لڑکا ...... اس کو چڈھہ سِسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈھے کے ساتھ۔ اُس کا ایک بازو اس مٹیم بلونڈ کی پتلی کمر میں حمائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیت کمار کا ردِ عمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈھے کی یہ نمائشی فتحمندانہ حرکت پسند نہ آئی تھی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی برسی کہ کوئی کٹرے میٹرک کے امتحان میں کئی بار فیل ہوا، مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اُس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اُس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ اِدھر دھانی ناکت اور تا تھئی تھئی کی رٹ، تہری بنا بنا کر اُس کو توڑے بتا رہا تھا۔ اُدھر چڈھہ باقی لڑکیوں کے جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے جوک سنا رہا تھا، جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے ——— ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی ——— رنجیت کمار سگرٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اُس سے لے لے۔

وسکی کا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اُس نے اپنے ریشمی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چڈھے نے بددلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لئے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا "بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ"

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈھہ خوش ہو گیا۔ اور اُس نے اسی خوشی میں بیس پچیس اور جوک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے ——— میں نے سوچا، عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہو گی، یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اُکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردِ عمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل یک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لئے نجات مل جاتی ہے ......

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چڈھے کے ننگے ننگے جوک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی ——— اُس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں ...... میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فرار کو برا سمجھتے ہیں ...... وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اُس کا ظاہر گو بدنما تھا، لیکن باطن اُس کا بے حد خوبصورت تھا ...... اُس پر کوئی بناؤ سنگھار، کوئی غازہ، کوئی اُبٹنا نہیں تھا۔

پھولی تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرالی ہے۔ وہ ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بیکار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو چکے تھے ——— اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو تین ڈریس ہوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اُسے فلم کمپنی سے اپنے لیے یکمشت ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض مع مزید ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسبِ معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کئے جا رہا تھا۔ تھیلما، ون گُترے سے ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون گُترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اُس کے پیر کبھی اُن کے بول ادا نہیں کر سکیں گے، مگر وہ اس کو بتلائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون گُترے کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کٹی دونوں پیئے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آئرش کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں اُن دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔ اور چڈہ فی لس کے سانپ کی کینچلی ایسے رنگ کے بالوں کو تکتے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ فی لس کا بہروپیہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اُس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی، کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی ..... اُس کی نگاہ سب پر تھی۔ اُس بلی کی طرح، جو بظاہر آنکھیں بند کئے سستاتی ہے، مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟ ..... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غالب کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ——— اس نجات کے لئے کون ملک الموت کا انتظار کرے ..... کیوں آدمی چند لمحات کے لئے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اُس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں اُن سب کے لئے ممتا تھی ——— میں نے سوچا، شاید اس لئے اُس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اُس کی اصلیت معلوم نہ ہو ..... اُس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی ..... اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لئے چند آدمی چن لئے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چڈہ ایک تگڑا پیگ فی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے نہیں، سب کے سامنے، مگر ممی اُس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی ..... فی لس نشے میں تھی، ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اُس کے پالش کئے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ون گُترے، تھیلما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کا باپ سالا اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈ میں اُس نے اُس کی شادی بنا دی تھی۔ اُس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے ..... اور غریب نواز، ڈولی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار، پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں ——— تپائی کے اردگرد، فی لس، اُس کا بہروپیا سا ساتھی اور ممی بیٹھے تھے۔ چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اُس کے پہلو میں بیٹھی تھی، جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا ——— اُس کو

حاصل کرنے کا عزم اُس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد پولی کا ہیجڑہ نما دوست اُٹھ کر صوفے پر دراز ہوگیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا ——— غریب نواز اور آلیا اُٹھ کر کہیں چلے گئے۔ اِنیا اور کٹّو نے آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں۔۔۔۔ وِن کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور پولی کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر تھیلما کی طرف جو اُس کے پاس بیٹھی تھی اور اُس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لئے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہُوا کہ چڈّے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہوگئیں۔ چڈّے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچّے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ پولی نے دونوں میں مصالحت کی نہیں نہیں کوشش کی مگر چڈّہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ پولی کو اپنے ساتھ سعید کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اِس ارادے سے باز آئے، مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا "تم دیوانی ہوگئی ہو ۔۔۔ بوڑھی دلاّلہ ۔۔۔ پولی میری ہے ——— پوچھ لو اس سے"

ممی نے بہت دیر تک اُس کی گالیاں سُنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اُس سے کہا "چڈّہ۔ مائی سن ۔۔۔ تم کیوں نہیں سمجھتے ۔۔۔ شی از ینگ ——— شی از ویری ینگ!"

اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی، ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈّہ بالکل نہ سمجھا۔ اُس وقت اس کے پیشِ نظر صرف پولی اور اُس کا حصول تھا۔ میں نے پولی کی طرف دیکھا، اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدّت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ مشکل پندرہ برس کی ۔۔۔ اُس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھِرا ہُوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

چڈّے نے اُس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ——— ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی "چڈّہ ۔۔۔ چھوڑ دو ۔۔۔ فور گاڈز سیک ۔۔۔ چھوڑ دو اسے!"

جب چڈّے نے پولی کو اپنے چوڑے سینے سے جُدا نہ کیا تو ممی نے اُس کے مُنہ پر ایک چانٹا مارا "گٹ آؤٹ ۔۔۔ گٹ آؤٹ!"

چڈّہ بھونچکا رہ گیا۔ پولی کو جدا کر کے اُس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر رخصت لی اور چڈّے کے پیچھے چلا گیا۔

سعید کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون قمیص اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اُٹھا۔ گھڑی میں دس بج چکے تھے۔ چڈّہ صبح ہی صبح اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اُس کی آواز سنی جو گراج سے باہر آ رہی تھی۔ میں رُک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "وہ لاجواب عورت ہے ——— خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے ۔۔۔ دعا کرو کہ اُس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔"

اُس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی ——— معلوم نہیں اس کا رُخ اُس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اُس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا ——— میں نے زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اس کا انتظار کیا جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہوگیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا ——— ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے اُس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونے میں کافی تفریح ہوگئی تھی۔ اس لئے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ اُس نے ہمیں روکنا چاہا مگر ہم سعید کاٹیج

پہلے سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لئے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے ——

ہم چل دیئے ..... راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہُوا تھا۔ میں نے اُس کو من و عن سُنا دیا۔ اُس کا ردِعمل یہ تھا کہ فلس اُس کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ یا وہ اُسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جبھی اُس نے چڈے سے لڑائی کی ..... میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گزر جانے پر چڈے کا خط آیا، جس میں اُس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا۔ اور اُس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا: میں اُس روز حیوان ہو گیا تھا —— لعنت ہو مجھ پر!

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پُونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اُس وقت ملاقات ہوئی، جب وہ گراج سے باہر نکل کر شیری کے خورد سال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کمار آگیا، کچھوے کی چال چلتا اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اُس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڈہ اُس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فلس کو اُس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا۔ وہ اُس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی۔ رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونے میں رہتی تو وہ ضرور اُسے لے اُڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا۔ اُسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڈے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے ..... بخار رہتا ہے، مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا —— سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا، اس کا رُخ گراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گراج والی شیری کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ وَن کُٹرے سخت گھبرایا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ چڈے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے تانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بیہوش ہو گیا ..... میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ تانگے والے نے بیہوش چڈے کو سنبھالا ہُوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اُٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہوگا۔

مَیں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیئے۔ اس نے وَن کُٹرے سے مشورہ کیا۔ وہ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا "کیا ہُوا میرے بیٹے کو؟"

وَن کُٹرے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصّے کے ساتھ کہا "تم کیسے لوگ ہو —— مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور وَن کُٹرے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کے پاؤں سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے تحمّل سے کام لیا اور ڈاکٹر بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہُوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو وَن کُٹرے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا، اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سُن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دُور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے، جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے —— میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، وان گرزے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا "ممی، یو آر گریٹ!"

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈہ کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا "میرے بیٹے ... میرے غریب بیٹے!"

چڈہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا "نہیں ——— تمہارا بیٹا اول درجے کا اسکاؤنڈرل ہے ...... جاؤ، اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پہ داغ دو!"

ممی نے چڈہ کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا "فضول بکواس نہ کرو۔" پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا "لڑکو ——— چڈہ بیمار ہے، اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے ——— سمجھے؟"

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈہ کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ ایسی کونسی آفت آ گئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں، ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا ——— ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے، یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی، اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈہ کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈہ کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے سے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈہ کا ایک خط دیا جس میں صرف یہ لکھا تھا "عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔"

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا "ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں۔"

میں نے چڈہ کو دو تین خط لکھے، جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں مشکل سے ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونے پہنچا اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا، مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا، اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈہ کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے کیونکہ انہیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر آ گیا تھا۔ اس کا

فلم سٹین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے چلا آیا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور بے حد منکسر المزاج تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر تو ناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سٹین کے کمرے میں چونکہ جگہ خالی تھی، اس لئے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا تھا اور اس سے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائرکیٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یکمشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا "میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو نیگ میں مبتلا ہو جاؤ ——— ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے میرا تو خیال ہے، یہی بہتر ہے۔"

غریب نواز تازہ تازہ حیدرآباد سے واپس آیا تھا۔ اس لئے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونے میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پنجابی مسٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا "کچھ پروا نہ کرو اس سالے کی . . . جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے ——— بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔"

ہرتیش ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چند گالیاں پنجابی کے مخصوص لب و لہجے میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسب معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما تھیلما وغیرہ سب آتی تھیں۔ وِن کرتے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈو ناچ کی تاتھئی، اور دھالی ناکٹ کی دن دھا، ٹھمری بتا بتا کر بتاتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پرخلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا اور رنجیت کمار، جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا، ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا ——— چڈے کے ننگے ننگے لطیفے سن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے . . . . ایک صرف وہ نہیں تھی . . . وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لئے صحیح تشبیہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا "چڈہ ——— یو آر اے ڈیمڈ بروٹ!"

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرا دیتی تھی، جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے "ڈونٹ ٹاک روٹ"

وِن کرتے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آکر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بڑے بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا۔ اور اپنا میٹرکیولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

ممی، وہی ممی تھی ——— پولی کی ممی، ڈولی کی ممی، چڈے کی ممی، رنجیت کمار کی ممی ——— سوڈے کی بوتلوں، گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے سازوسامان کے انتظام میں وہ اسی پرشفقت انہماک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح سے کم شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ڈر کر، سمٹ کر، وہ دور دوڑ گئے تھے . . . . چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا . . . . ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھیں۔

رتی کمار کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ شکیلا جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مادھاڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی، اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا۔ اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی، اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ شکیلا کا علاج کرائیں۔ کسی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا، تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے، کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا "تم اس وقت سے لے دو ——— بعد میں لیتی رہنا" اور مجھ سے اس نے پندرہ روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا، اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائرکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی "ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو۔" چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ "مجھے یہ آدمی ادھورا ادھورا سا معلوم ہوتا ہے ——— ٹھیک نہیں بیٹھتا میری نظروں میں۔" یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی سے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رنڈی تھی، بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کدھب، بے ہنگم اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائرکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونے ٹیلیفون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتے کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و حواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آ گئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا۔ اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا، مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا "بھاپا جی ——— مر گیا؟"

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا "مجھے چھوڑ دیجئے، میں بھاگوں گا نہیں۔"

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتا دو" ——— اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیئے تھے کہ سین نے

اس کو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو تو دبی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا اور شبین بڑا اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آکر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا، مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے شبین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہ بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں۔ جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے۔ مگر ایک بڑی نحس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سیٹھ کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی، بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کئے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا "اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے ——— اور اس کا سہرہ میری بڈھی ممی کے سر ہے!"

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایلی برادرز شکیل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لئے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمائے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لئے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انھوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا "اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے۔"

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں وَن کرتے نے شراب پی کر خلافِ معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے گھر کی فوری ضروریات کے پیشِ نظر اس کو دو سو روپے قرض دیئے، اور رنجیت کمار نے اس سے کہا تھا "تم ان بیچاری لڑکیوں کو وہاں پھانسنے نہ دیا کرو . . . ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو، مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی . . . کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔"

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا، اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لئے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا ——— شیریں نے سفر کے لئے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزارہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پر کر دیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا، شیریں بیٹ رہی تھی۔ شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ وَن کرتے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لئے کہیں سے دو پیدا کئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لئے لایا تھا۔ چڈے نے آخری دو نڈ و اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا "تو گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے ——— بڑا کمال کیا ہے تو نے . . . اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا، ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔"

وَن کرتے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا "سالے، میں اب کوئی پئے لا ہوں . . . وہ تو دارو بولا کرتی ہے . . . . دیسے بائی گاڈ . . . میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے . . . . . . "

چڈے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ وَن کرتے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے سے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لئے لکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ

لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ چلئے پیدائش بھی سعید کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولود مسعود ہے۔ اس لئے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ ہے۔ جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سعید کے قتل کی ٹریجیڈی؟ معلوم نہیں کیا وجہ تھی۔ لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے، بولتے تھے، مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا اس دوران میں چڈے نے مخل اندازی کیوں نہیں کی۔ رونق کترے بھی کہیں غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا تھا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو۔ اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں اس کے ترو پڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "اس الو کے کام نے کچھ وصول کیا ہے؟"

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی ——— "ہاں... دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے!"

"کہاں ہے یہ ہزار؟" یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

"میری جیب میں!"

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا "آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا ——— ایک پارٹی ہے!"

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت ہی کرنے والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا ——— میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا۔ کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اس کی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر ساڑھے سات بجے سعید کاٹیج پہنچا۔ گیراج کے باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے۔ اور نل کے پاس ایلی برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گیراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے ہاں جا رہے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ، رنجیت کمار کٹی اور ایلما کے ساتھ اور رونق کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کود رہا تھا ——— سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور نیم بدیشی آوازوں کا ایک گرد سا پھٹا جس کی گونج دیر تک فضا میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی ——— ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا۔ "کس می ڈیئر!"

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ ایک دم پکارا "بند کرو ——— اب شراب کا دور چلے گا!" پھر اس نے نوکر کو آواز دی "اسکاٹ لینڈ کے شہزادے ——— وسکی کی نئی بوتل لاؤ!" اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا "ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی ——— جانے دو، یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر ایک بوتل میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط سی تقریر شروع کی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین ... آپ سب جہنم میں جائیں ... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ——— وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے ... مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے ... کنوئیں میں اترنے والے ... کنوئیں میں اترنے والے" اس نے ادھر ادھر دیکھا "افسوس کہ یہاں کوئی ہندستوڑ نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو تافتہ کو خافتہ کہتا ہے ... اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی ہو تو کہے گا، پرسوں آپ سے ملا تھا ——— لعنت ہو اس کے نظام حیدر آباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں ... ہاں ... وہ کنوئیں میں اترنے والے ... میں نے کیا کہا تھا کہ سب بکواس ہے ... پنجابی میں جنہیں ٹوبے کہتے ہیں ... وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں ... اسی لئے میں کہتا ہوں ...

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا "یہ سب سازش ہے ——— اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا ... تم سب مردہ باد ... لیکن پہلے میں ... میں ..." وہ جذباتی ہو گیا "میں ... جس نے اس رات اس ... اس سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لئے اپنی ممی کو ناراض کر دیا ... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوآن سمجھتا تھا ... لیکن نہیں ... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم ایک ہی بوسے میں اس پلاٹینم بلونڈ کے کنوار پنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا ... لیکن یہ ایک ... یہ ایک نامناسب حرکت تھی ... وہ کم عمر تھی ... اتنی کم عمر، اتنی کمزور، اتنی کیریکٹرلس ... اتنی ..." اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "بتاؤ یار اسے اردو، فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے ... کیریکٹرلس ... لیڈیز اینڈ جنٹلمین ... وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی، یا اسے قطعاً بھول جاتی ... ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا ... مجھے اس کا دکھ ہوتا ——— اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا ... میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا ... میں ایک پیگ اور پیتا ہوں۔"

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ لوٹنے کے بعد چڈہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا، جیسے کوئی چیز کھونے کے لئے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا "کیا بات ہے چڈے؟"

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "کچھ نہیں ... بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی!"

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

وِن کترے نے شیلا کو اُٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائرکٹر سین کی بات نکلی تو اس نے کہا "مسٹر منٹو ——— وہ ایک دم ہلکٹ آدمی تھا . . . کہتا تھا میں خان صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں . . . جھوٹ بالکل جھوٹ . . . وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا . . ."

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جھٹ ٹک سن لیا۔ گنی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر وِن کترے کے گنجے سر پہ دھپا مار کر کہا "بس بند رہے . . . اُٹھ . . . اور کچھ گا . . . لیکن خبردار اگر تو نے کوئی بیکار راگ گایا!"

وِن کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی۔ مُرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے بس سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گاتا تھا، پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکونس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی۔ ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظر کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے . . . غریب نواز اس قدر متأثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا "حیدرآباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے . . . موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے۔"

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور زابیا کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ وِن کترے نے گراموفون کے توے پر ریکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اُٹھا لیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ ان میراثنوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔

اسی اُچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا "بس، اب ختم!"

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا۔ اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا "چلو منٹو چلیں!"

میں نے اُٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا "آج کوئی الوداع نہیں کہے گا!"

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے وِن کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈے سے کہا "ٹھہرو، دیکھیں کیا بات ہے" مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا "اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے۔"

ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس سے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا "مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اُٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا غریب نواز گیراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "ممی چلی گئی!"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں" یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رُخ کیا۔

چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا "چلی گئی ——— صبح کی گاڑی سے اُسے پونہ چھوڑنا تھا۔"

میں نے پوچھا "مگر کیوں؟"

چڈے کے لہجے میں تلخی آ گئی "حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں ——— اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابلِ اعتراض تھیں۔ اس لئے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی . . . وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے . . . . ."

ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیرِ تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو تڑی پار کر دیا . . . شہر بدر کر دیا . . . وہ گرفتہ تھی۔ دلّال تھی ——— اس کا وجود سوسائٹی کے لئے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیئے تھا ——— پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اور جہاں چاہو ڈیرہ ہو سکتی ہو۔" چاچڑے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا: "مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور غلیظ ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا ——— لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ——— وہ پونے سے چلی گئی . . . مجھ جیسے جوانوں میں ایسی غلیظ اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی . . . میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں ——— زندہ باد ممی . . . زندہ باد! ——— چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہو گی ——— ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ——— وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔"

میں نے دیکھا، چاچڑے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔

Gifted by Colonel K.L. Sharma, SC, AC, MID, MSC of the Parachute Regiment

Allam
19 Dec 94

بابو گوپی ناتھ

("چغد" میں سے)

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔

"منٹو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔"

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ "بابو گوپی ناتھ، تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے، لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نا اینٹی کی پینٹی پو؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی، دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اُس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبے تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔"

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا۔ "نمبر ون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجیے کہ بڑے انٹی فلو جسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔"

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا۔ "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔" پھر سینڈو سے پوچھا۔ "کیوں سینڈو، کیا آپ کچھ اُس کا شغل کرتے ہیں؟"

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے

اس لئے کہ مفت ملتی ہے "

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھا دیا۔ چنانچہ میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو ——"

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان۔ کسرتی بدن۔ منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹ نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لئے مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی۔ میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکئے میں بات چیت کرتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے۔ جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ——— دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا "جناب یہ ہے ٹِین پٹوٹی۔ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ——— آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا "بکواس نہ کر۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا "بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا ——— بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا: "او گوڈ ـــــ او میرے رب العالمین ـــــ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ـــ جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا: "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ـــــ جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔"

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا: "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑا: "جی میں ـــ میں ـــ کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ـــــ اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔"

سینڈو نے کہا: "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں ـــــ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کشتی نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا: "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نٹنی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ تھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پیئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی؟ اس کا پتہ مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے، وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: "بڑا نیک خیال ہے۔"

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا: "منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جان من مکان بنوا دوں؟

جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ —— کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے —— منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی؟"

میں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا: "کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب —— آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ۔ زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئے میں موٹر ہونی ہی چاہئے۔"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں —— لیکن آپ مجھے بتائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا۔ مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا —— بہت گنہگار آدمی ہوں —— وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟"

میں نے کہا: "نہیں نہیں —— بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ "اور پیجئے منٹو صاحب،" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دئیے۔ "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑا ہو گا یا ...."

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا "جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انہیں عقلمند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا الو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکئے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا: "رنڈی کے کوٹھے اور تکئے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اُس نے جواب دیا " اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اُس کے لئے اس سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے "

میں نے ایک اور سوال کیا " آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا " بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری سے کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ——— منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اُسے لینے کے لئے ایک ادا سے اُٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اُڑس لیا۔ اس نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے "

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اُڑانا شروع کر دی بمبئے آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اُس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا۔ لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی۔ لیکن اُسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (اور یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے۔ خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثیوں کے مزاح کی جھلک تھی، بہت ہی جاذبِ نظر تھی۔ وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ اُن دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔ جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا " ادب اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی ادھر

وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا: "تشریف لے آئیے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ!"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور ہی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی جسارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے کھلاڑی اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا، اس کے علاوہ ـــــ کچھ یوں کہئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا۔ لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آئیے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا: "منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں ـ میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو، جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی۔ تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ـــــ منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی ـــــ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟"

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے ——— کیوں زینو جانی ——— پسند ہے نہیں؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹرس بنانے کے لئے۔ اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے۔ لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیوں کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آجکل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے ——— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہارنبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار۔" یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یٰسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔

بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں زینت اور یٰسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے۔ ——— مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی مس موریل سے یٰسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یٰسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: ”منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی میاں اگر تم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ——— میں کیا کروں منٹو صاحب۔ بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیئے!“

یٰسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہیئے سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا: ”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

اُس نے بڑے الھڑپن سے کہا: ”مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔“

جی چاہتا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں سینڈو اور سردار اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ۔ بے اُمنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگرٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے، حتیٰ کہ اُس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا۔ ”سینڈو!“

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا: ”دھڑن تختہ!“

بابو گوپی ناتھ نے اُس سے کہا: ”آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو“ لیکن سینڈو نے کہا: ”ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ

باتیں کرتی ہیں۔"

ٹیکسی ایک طرف ٹھہرا دی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا۔ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا: "واپس لے چلو۔"

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: "منٹو صاحب۔ زینو کی شادی ہونے والی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا: "حیدرآباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آپہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ـــــ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدرآباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ حقیقتاً حیدرآباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدرآباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدرآباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پُرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل ـــ

نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے

گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہوگئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دوگنی ہوگئی۔ مجھ سے اُس نے کہا: "منٹو صاحب خوبصورت، جوان اور بڑا لائق آدمی ہے ـــــ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی ـــــ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

محمد شفیق طوسی، محمد یسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا: "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا: "منٹو صاحب ذرا اندر جائیے اور دیکھیے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سُرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی ـــــ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سُرخی بہت بُری معلوم ہوتی ہے، مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب

کیا تو بہت ہی پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کمرے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: "یہ کیا مسخرہ پن ہے!"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا: "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!" اُس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دُکھ کے ساتھ مجھ سے کہا: "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں ——— زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا: "خدا تمہیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ——— بہت ہی دُکھ بھری ملامت، ——— اور چلا گیا۔

کالی شلوار

("دھواں" میں سے)

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ "دِس لیف ——— ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔"

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آ جاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے۔ تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی "صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی "صاحب تم ایک دم اُلو کا بچہ ہے حرامزادہ ــ ... سمجھا" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی ——— گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ، دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا "بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے۔" جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔" چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔

جب وہ دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ پھر لوٹ آنے لگا تو سلطانہ نے کہا: "لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا، نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ـــ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا: "کیا ہوا؟ ـــــ یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا: "یہ موا پاخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی۔ پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پاخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ

انکار کیسے کرتی جبکہ خدابخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی۔ جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدابخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدابخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا۔ جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا۔ وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدابخش سے کہا "کیا بات ہے خدابخش۔ پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا ـــــ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔" خدابخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں ـــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ...." وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدابخش اور سلطانہ دونوں اس کی آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدابخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا۔ جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ۔ کھانا پینا، کپڑے لتے دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں۔ آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدابخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے چلیں ـــــ یہاں کیا دھرا ہے ـــــ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔"

خدابخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جانِ من، انبالے نہیں جائیں گے یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دیگا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دُکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت بُرا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی۔ کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتے دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ——— نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رُک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا ”دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں“ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ ”جانِ من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا“

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے

ساتھ پہننے کو انوری کالی ململ کا ایک جمپر لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت اداس تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پہ گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا——۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پہ ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا "آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟" وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا "تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔" وہ یہ سن کر پھر مسکرایا "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا "نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں——چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پہ اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا "فرمائیے۔۔۔۔"

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں... میں... میں کچھ بھی نہیں کرتی"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا"

سلطانہ نے جھنجھلا کر کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ——— آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی"

"جھک مارتی ہوں"

"میں بھی جھک مارتا ہوں"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں"

"حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا"

"ہوش کی دوا کرو ——— یہ لنگر خانہ نہیں"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں"

شنکر نے جواب دیا "الو کے پٹھے"

"میں الو کی پٹھی نہیں"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا "تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو"

شنکر مسکرایا "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں"

"جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ——— بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی "تو جاؤ رستہ پکڑو"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا ——— بہت کام کا آدمی ہوں"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں

چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھکن سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "پرانے قلعے کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں ———"

"کچھ انہوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ——— پر سلطانہ میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرّم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو ——— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محرّم سر پہ آگیا ہے۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلّی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کردو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے ——— خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے۔ اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم . . ."

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لادو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے۔ اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لاکر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کردو . . . دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لادو ——— میری بھتّی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو ——— میں کہاں سے لاؤں گا ——— افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لادو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے . . . تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کی دیکھی ہوئی فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی۔ اب شام

ہو رہی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی ——— مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا: ”تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ——— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔“

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: ”نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔“

شنکر اس پر مسکرا دیا: ”تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔“

”کیسی شرطیں؟“ سلطانہ نے ہنس کر کہا، ”کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“

”نکاح اور شادی کیسی؟ ——— نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں ——— چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔“

”بولو کیا بات کروں؟“

”تم عورت ہو ——— کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔“

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی: ”صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”جو دوسرے چاہتے ہیں۔“ شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔“

”تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں، خود سمجھنا چاہئیں۔“

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: ”میں سمجھ گئی۔“

”تو کہو، کیا ارادہ ہے۔“

”تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔“

”تم غلط کہتی ہو ——— اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ——— تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟“

”سلطانہ ہی ہے۔“

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: ”میرا نام شنکر ہے ——— یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔“

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا: ”شنکر میری بات مانو گے؟“

شنکر نے جواباً کہا: ”پہلے بات بتاؤ۔“

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: ”تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر ....“

”کہو کہو ——— رک کیوں گئی ہو۔“

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا: ”بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں ——— یہاں کے سارے دکھ

تو تم مجھ سے سن چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگنے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سن کر کہا: "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا: "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا: "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں؟" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا: "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا: "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا: "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو؟"

"لے لو۔" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا: "ساٹن کی کالی شلوار ہے ——— دیکھ لینا شاید لمبی ہو ——— اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا، اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا: "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے ——— کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا: "آج ہی درزی لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں: "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے؟"

مختار نے جواب دیا: "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

(”پھندنے“ سے)

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیئے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہرحال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیئے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں۔ لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز با قاعدگی کے ساتھ ”زمیندار“ پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا ”مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے“ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا ”ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں“

یہ جواب سُنکر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا ”سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ——— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی“

دوسرا مسکرایا ”مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ——— ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں“

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ

پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائدِ اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے ——— یہ کہاں ہے۔ اس کا محلِ وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا ——— "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں ——— میں اس درخت ہی پر رہوں گا۔"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجینئر میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے ——— اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑے رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔"

لیکن بعد میں "آف دی پاکستان گورنمنٹ" کی جگہ "اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ" نے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا: "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے ان گنت حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح ——— جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو ——— سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا: "یہ تم سے ملنے آیا ہے ——— تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ——— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ——— مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ——— تمہاری بیٹی روپ کور . . . . . ."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا: "بیٹی روپ کور۔"

فضل دین نے رک رک کر کہا: "ہاں . . . وہ . . . وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا: "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ——— اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ——— بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ——— اور بہن امرت کور سے بھی . . . . بھائی بلبیر سے کہنا، فضل دین راضی خوشی ہے ——— دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ——— دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی . . . اور . . . میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں . . . اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا: "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا: "کہاں ہے ——— وہیں ہے جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا: "پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں ——— نہیں نہیں پاکستان میں۔" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ۔"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے ——— کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ——— پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ——— پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا "پاکستان میں"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے ———" اور زور زور سے چلانے لگا "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"۔

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے ——— اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی، اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ——— ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ——— ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

(ریڈیو ڈراما)

اِس منجدھار میں

("پھندنے" میں سے)

کردار

بیگم .... ماں

امجد .... } بیگم کے بیٹے ... شکستہ

مجید .... } ... ثابت وسالم

سعیدہ ...... امجد کی نئی نویلی حسین بیوی

اصغری ...... خادمہ

کریم اور غلام محمد ... نوکر

پہلا منظر

(نگار ولا کا ایک کمرہ ــــ اس کی خوبصورت شیشہ لگی کھڑکیاں پہاڑی کی ڈھلوانوں کی طرف کھلتی ہیں۔ حدِ نظر تک پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں جو آسمان کی خاکستری مائل نیلاہٹوں میں گھل مل گئے ہیں۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا سے ہولے ہولے سرسرا رہے ہیں۔ یہ کمرہ جیسا کہ ساز و سامان سے معلوم ہوتا ہے خوابگاہ عروسی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کو کھڑکیوں کے پاس ساگوان کی مسہری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کونے میں شیشہ کی تپائی جس پر بلور کی صراحی اور گلاس کے علاوہ ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ پیچھے ہٹ کر پیازی غلافوں میں ملبوس صوفہ سیٹ ہے، اس پر مولائم گدیاں سجا رہے ہیں ــــ اس سے دور ہٹ کر ایک نوجوان خادمہ جو معمولی شکل و صورت کی ہے آتشدان پر سجائی ہوئی مختصر چیزوں کو اور زیادہ سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں ایسی دوشیزگی ہے جو ذرا سی جنبش سے منکوحیت میں تبدیل ہو سکتی ہے ــــ باہر سے ٹالوں پر کلڑی کی ننھی ننھی ضربوں کی آواز آتی ہے۔ تینوں خادم ہلکے سے ردِ عمل کے بعد اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں ــــ دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی وجیہہ عورت بیساکھیوں کی مدد سے اندر آتی ہے اور کمرے کا جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے)۔

بیگم صاحب ۔ (بیساکھیوں کی مدد سے کمرے میں اِدھر اُدھر پھر کر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ٹھیک ہے! (وہ ایک بیساکھی کو اپنی بغل سے الگ کر کے صوفے کے بازو کے ساتھ رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے، مگر فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ سہارے کے لئے صوفے کے بازو کی چکنی سطح کے ساتھ چھوا تھا اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔ اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ یہ خود بخود مٹ جانے والا نشان مٹا دیتی ہے اور پھر بیساکھی اپنی بغل میں جما کر (جواں خادمہ سے مخاطب ہوتی ہے) اصغری!

اصغری ۔ (فوراً متوجہ ہو کر) جی!

بیگم صاحب ۔ (ایک دم یہ محسوس کر کے کہ وہ بھول گئی ہے کہ اس نے اصغری سے تخاطب کیوں کیا تھا) میں کیا کہنے والی تھی؟

اصغری ۔ (مسکراتی ہے) آپ یہ کہنے والی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں ہوا ...... میں بھی یہی سمجھتی ہوں بیگم صاحب ——— دولہن بہت خوبصورت ہے۔ اس کمرے کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ (وہ آتشدان کے عین درمیان میں ریشمی ڈوریوں سے آویزاں، دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے)۔

بیگم صاحب ۔ (مسکراتی ہوئی ——— آتشدان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنی بہو کی تصویر کو غور سے دیکھتی ہے ——— خوش ہوتی ہے لیکن ایک دم گھبرا سی جاتی ہے) اصغری!

اصغری ۔ جی!

بیگم صاحب ۔ صبح سے میری طبیعت ——— کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

اصغری ۔ امجد میاں جو آ رہے ہیں اپنی دولہن کے ساتھ۔

بیگم صاحب ۔ (اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی) ہاں ...... بس آنے ہی والا ہے ...... کمال موٹر لے گیا ہے اسٹیشن پر۔

اصغری ۔ اگلے سال مجید میاں کی شادی کر دیجیے ——— گھر میں رونق ہی رونق ہو جائے گی۔

بیگم صاحب ۔ انشاء اللہ ——— وہ بھی انشاء اللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی ...... (زیرِ لب) انشاء اللہ۔

اصغری ۔ (دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوتی ہے) اللہ نظرِ بد سے بچائے۔

بیگم صاحب ۔ (غیر ارادی طور پر قریب قریب چیخ کر) اصغری!

اصغری ۔ (سہم کر) جی!

بیگم صاحب ۔ کچھ نہیں ...... گاڑی کب آتی ہے کراچی سے!

اصغری ۔ معلوم نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب ۔ (ایک خادم سے) دیکھو کریم۔ تم ٹیلیفون کرو اور پوچھو ...... یعنی گاڑی تو کل ہی کی راولپنڈی پہنچ چکی ہے ——— مجید کا تار جو آیا تھا۔

کریم ۔ جی ہاں!

بیگم صاحب ۔ اور میں نے کمال کو کس اسٹیشن پر بھیجا ہے ...... (گھبرا کر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے ...... امجد میاں کو رات ٹھیرنا تھا ...... اپنے دوست سعید کے پاس ...... اور وہ تو میرا خیال ہے اب وہاں سے چل بھی پڑے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد!

غلام محمد ۔ جی!

بیگم صاحب ۔ تم دیکھو کمال کہاں ہے ...... موٹر کہاں لے گیا ہے!

غلام محمد ۔ بہت اچھا! (چلا جاتا ہے)

بیگم صاحب ۔ (اصغری کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے) آج صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں — چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوتی — اس کم بخت فالج نے مجھے ہمیشہ کا روگ دے دیا ورنہ دولہن کو ساتھ لاتی (دور سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے) میرا خیال ہے شاید امجد میاں کے دوست کا ٹیلیفون ہے کہ وہ چل پڑے ہیں، جاؤ اصغری . . . بھاگ کے جاؤ۔ (اصغری دوڑ کر باہر جاتی ہے)

بیگم صاحب ۔ (کریم سے — اپنی افسردگی دور کرنے کی خاطر) بس اب آتے ہی ہوں گے امجد میاں۔

کریم ۔ اللہ خیریت سے لائے۔

بیگم صاحب ۔ (قریب قریب چیخ کر) کیا مطلب تمہارا۔

کریم ۔ (ڈر کر، جھجک کر . . . . . . جی جی)

(اصغری کی چیخیں سنائی دیتی ہیں ۔ بیگم صاحب، بیگم صاحب)

بیگم صاحب ۔ (سراسیمہ ہو کر) کیوں کیا ہوا؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی ہے)

اصغری ۔ بیگم صاحب — بیگم صاحب۔

بیگم صاحب ۔ (بیساکھیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے؟

اصغری ۔ جی . . . . . مجید میاں کا ٹیلیفون آیا ہے کہ گاڑی . . . . گاڑی ٹکرا گئی ہے۔

بیگم صاحب ۔ (بیساکھیوں پر ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے) پھر؟

اصغری ۔ مجید میاں اور ان کی دولہن دونوں زخمی ہوئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بیگم صاحب ۔ (ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے — بیساکھیاں بغل سے گر پڑتی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ یوں کھڑی رہتی ہے جیسے پتھر کا بت — پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے۔ اور وہ دروازے کی جانب بڑھتی ہے) کہاں سے کہو، موٹر نکلے — ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔

(بیگم دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے — غلام محمد اور اصغری دونوں حیرت زدہ ہیں۔
اصغری زور سے چیختی ہے — بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

بیگم صاحب ۔ کیا ہے؟

اصغری ۔ آپ — آپ چل رہی ہیں — چل سکتی ہیں۔

بیگم صاحب ۔ میں؟ (اپنی بغلوں میں بیساکھیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے) میں؟ . . . . . میں کیسے چل سکتی ہوں؟

(ایک دم چکراتی ہے اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

اصغری ۔ (بیگم کے پاس جاتے ہوئے، غلام محمد سے) غلام محمد جاؤ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو۔

(غلام محمد چلا جاتا ہے — اصغری، بیگم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے)

پردہ

دوسرا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو ساز و سامان پہلے پڑا تھا۔ اب اپنا نیا نویلا پن کھو چکا ہے۔ اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی ہے — صبح کا وقت ہے۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی ہلکی ہوا سے سرسرا رہے ہیں — دائیں ہاتھ کی سائیڈ

کی مسہری پہ ململ [illegible] سعیدہ کمبل اوڑھے لیٹی ہے ——— شیشے کی تپائی پہ پڑی ہوئی ننھی ٹائم پیس جس میں نو بجے ہیں الارم شروع کر دیتی ہے ——— ہلکی سی گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے ——— کمبلوں میں جنبش پیدا ہوتی ہے ——— سعیدہ کروٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے۔ جھک کر ننھی ٹائم پیس کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پہ چھائی ہوئی گھنی پلکیں پھڑپھڑاتی ہیں ——— کروٹ بدل کر وہ بستر میں تکیوں کا سہارا لے کر ذرا اوپر اٹھ آتی ہے اور باہر حدِ نظر تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں کا دلکش منظر دیکھ کر بچوں کی سی مسرت محسوس کرتی ہے ——— پھر ایک دم ٹانگیں چلا کر کمبل اوپر سے ہٹاتی ہے اور اچک کر مسہری سے اترتی ہے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیتی ہے ——— کسی خوش الحان پرندے کی آواز سنائی دے رہی ہے ——— سعیدہ اپنے خیالوں میں محو ہے۔ وہ جوان ہے۔ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس میں جو اس کے بدن سے دور دور اپنی حریری دنیا الگ بسائے ہے، اس کے خوبصورت خطوط سے غافل نہیں ..... اور خود سعیدہ کا ادراک بھی ..... اس کا سراپا حسین و جمیل ہے اور اپنے حسن و جمال سے آگاہ ..... اصغری کی کرخت آواز پرندے کی خوش الحانی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ سعیدہ چونکتی ہے)

سعیدہ ۔ (نگاہوں ہی نگاہوں میں "کیا ہے؟" پوچھتی ہے)

اصغری ۔ مجید میاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کہتے تھے، جا کے دیکھو، اب جاگ گئیں یا نہیں؟

سعیدہ ۔ کیا خبر لائے ہیں؟

اصغری ۔ میں انھیں بھیجتی ہوں۔

(اصغری چلی جاتی ہے۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر سنگھار میز کے پاس آتی ہے۔ آئینے میں ایک لحظے کے لئے اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال سرسری طور پر ٹھیک کر کے مسہری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ مسہری کے سرہانے اس کا جارجٹ کا سفید دوپٹہ لٹک رہا ہے۔ اسے اتارتی ہے اور بڑی بے توجہی سے اپنے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے ——— باہر سے بوٹوں کی چرمی آواز آتی ہے خفیف سے ردِ عمل کے ساتھ سعیدہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے ——— مجید ——— سانولے رنگ کا متوسط قد نوجوان، جو مضبوط ہاتھ پاؤں رکھتا ہے اور جس کے چہرے کے خطوط عمر کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور منجھے ہوئے ہیں، اندر داخل ہوتا ہے) ۔

مجید ۔ سلام بھابی جان!

سعیدہ ۔ سلام۔

مجید ۔ (صوفے کے پاس آ کر رکتے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی؟

سعیدہ ۔ (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) سنائیے کیا خبر لائے راولپنڈی سے؟

مجید ۔ (سعیدہ کے سامنے آ کر) کوئی خاص نہیں (آدھی سی آہ بھر کر) بس اب انھیں لے آئیں گے یہاں۔

سعیدہ ۔ کیوں؟

مجید ۔ وہ تنگ آ گئے ہیں (ایک مونڈھا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) ان کی جگہ میں ہوتا تو ..... بہت ممکن ہے میں نے خودکشی کر لی ہوتی۔

سعیدہ ۔ (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے ..... اتنے آدمی مرے ..... میں بھی ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔

مجید ۔ مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا۔

سعیدہ ۔ (کھڑکی سے باہر پہاڑیوں کا منظر دیکھتی ہے) ہاں، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا ——— اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ پر ہلکی سی خراش آنے پر میری ساری زندگی زخموں سے چور چور ہو جائے (آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں ——— سفید دوپٹے سے وہ انھیں پُرنزاکت طریقے سے پونچھتے ہوئے [illegible]

کرتی ہے) اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی کمر ٹوٹ جائے اور میں ساری عمر ہوا میں کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈولتی رہوں۔

(سسکیاں لیتی ہے)

مجید - (اٹھتا ہے) بھابی جان حوصلے سے کام لینا چاہیئے ... کیا پتا ہے وہ ٹھیک ہو جائیں۔

سعیدہ - (سرزنش کے طور پر) مجید، کم از کم تم تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو —— چھ مہینے ہو گئے ہیں انھیں ہسپتال کی چارپائی کے ساتھ لگے ہوئے ... ڈاکٹروں کا جو فیصلہ ہے، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں ... وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے ..... ان کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی ہیں ... لیکن ... لیکن، میں ایک بات مانتی ہوں کہ ان میں بہت حوصلہ ہے ...... میں جب بھی ان کے پاس گئی۔ انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا، سعیدہ، کچھ فکر نہ کرو، میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا ...... اور پھر میں تمھیں ان پہاڑیوں کی سیر کراؤں گا جن کا ذکر تم کراچی میں اتنی بار میرے منہ سے سن چکی ہو ...... مجھے ان پہاڑیوں سے پیار ہے ... اتنا پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اندازہ نہیں کرو گی ... اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگتے کہ سعیدہ دنیا حادثوں کا دوسرا نام ہے ... میں تو خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میری جان نہیں گئی ... ورنہ ... پھر وہ ایسی بات کہتے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

مجید - کیا؟

سعیدہ - (نمناک آنکھوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) کہ تم ... کہ تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی —— (کانپ جاتی ہے) ..... وہ ...

ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید؟

مجید - معلوم نہیں۔

سعیدہ - تمھیں معلوم ہونا چاہیئے (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے —— دوپٹہ ڈھلک آتا ہے —— حریری لباس میں اس کا متلاطم سینہ ریشمی اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے) تم مرد ہو ... تم اس کے بھائی ہو ... اگر اس حادثے کے تم شکار ہوتے ..... تو؟

مجید - میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا جو امجد بھائی سوچتے ہیں؟

سعیدہ - کیوں؟

مجید - ہم دونوں مرد ہیں ... دونوں بھائی ہیں —— مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔

سعیدہ - (بڑبڑاتی ہے) دل ... اور دماغ۔

(اصغری داخل ہوتی ہے)

اصغری - مجید میاں، آپ کو بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔

مجید - چلو، میں آتا ہوں۔

اصغری - انھوں نے کہا ہے جلدی آئیے۔

مجید - اچھا ... (سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں ابھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

اصغری - (فرش پر بچھے ہوئے رگ پر سعیدہ کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں چٹخانا چاہتی ہے)

سعیدہ - (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جانے دو اصغری۔

اصغری - (پاؤں سے قریب قریب لپٹ کر) نہیں دولہن بیگم۔ (انگلیاں چٹخانا شروع کر دیتی ہے) ..... کیا خبر لائے ہیں مجید میاں۔

حمیدہ ۔ کہتے تھے ، وہ یہاں آنا چاہتے ہیں ۔
صغریٰ ۔ یہ تو بڑی خوش خبری کی بات ہے ۔
سعیدہ ۔ (دُکھ کے ساتھ) ہاں !
صغریٰ ۔ پھر بیگم صاحب تو بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ اتنی دیر کیوں لگا دی مجید میاں نے ۔
سعیدہ ۔ کہاں ؟
صغریٰ ۔ یہاں ——— آپ کے پاس ۔
سعیدہ ۔ میرے پاس ؟ ——— کیا کہتی تھیں بیگم صاحب ۔
صغریٰ ۔ کچھ نہیں ——— ان کا مزاج آج کل بہت چڑچڑا سا رہتا ہے ——— انھیں کوئی بات اچھی نہیں لگتی ——— انھیں . . . . ! مجید میاں کا اتنا دکھ نہیں جتنا آپ کا ہے . . . . ہر وقت آپ ہی کے متعلق سوچتی رہتی ہیں ——— تو . . . امجد میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا ؟
سعیدہ ۔ (چونک کر ، اپنا پاؤں ہٹا کر اُٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں ۔

(بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے ۔ اصغری اُٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ ۔ سلام خالہ جان !
بیگم صاحب ۔ سلام بیٹا ——— جیتی رہو (پاس آکر سعیدہ کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتی ہے) تمھیں معلوم ہو گیا مجید سے کہ . . . . .
سعیدہ ۔ جی ہاں !
بیگم صاحب ۔ غریب تنگ آگیا ہے وہاں ہسپتال میں . . . . (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ ۔

(اصغری چلی جاتی ہے)

بیگم صاحب ۔ اس کی . . . اس کی خواہش ہے کہ وہ تمھارے پاس رہے . . . اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہونی چاہیئے . . . .
سعیدہ ۔ (آنکھوں میں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں ۔ بیگم کے گلے سے لگ جاتی ہے)
بیگم صاحب ۔ (آنکھوں سے آنسو رواں ہیں) وہ . . . وہ تم سے بے اندازہ محبت کرتا ہے . . . . لیکن . . . . لیکن اس نے کہا تھا ، تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمھیں اس کے یہاں آکر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ۔

سعیدہ ۔ اعتراض . . . . .
بیگم صاحب ۔ ہاں بیٹا ——— ہو سکتا ہے ، یوں تمھارے دُکھ میں اضافہ ہو سکتا ہے ۔
سعیدہ ۔ وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں ——— خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں ۔
بیگم صاحب ۔ بیٹا ، وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ کا آدمی ہے ——— اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے ۔
سعیدہ ۔ آئیں . . . . کیوں نہ آئیں (لہجے میں چیخ سی پیدا ہو جاتی ہے) وہ ایسی باتیں نہ کیا کریں ۔
بیگم صاحب ۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے ، اگر وہ خوش رہے تو انشاء اللہ ایک دو مہینے میں بیساکھیوں کی مدد سے چل پھر سکے گا . . . . . (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیساکھیاں . . . . جو اس کے کار کے حادثے کی خبر سُن کر میری زندگی سے الگ ہو گئی تھیں . . . . . مجھے معلوم ہوتا کہ یہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو میں ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھتی . . . . مگر بیٹا اس منجدھار میں جسے زندگی کہتے ہیں ، مضبوط سے مضبوط کشتی

سے ڈھونڈتی ہے اور ایک معمولی تنکا ہی کنارے لگا دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹا ، امجد نے مجھ سے ایک اور بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا ؟

سعیدہ - کیا خالہ جان ؟

بیگم صاحب - کیا تم اس سے محبت کرو گی ؟

سعیدہ - (بوکھلا کر) محبت . . . .

بیگم صاحب - (سعیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی . . . .

(چلی جاتی ہے)

سعیدہ - (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) محبت ——— محبت ؟ ——— دل و دماغ (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ، آتشدان کے عین وسط میں ریشمی ڈوریوں سے لٹکی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) بتا ——— کیا تو اس سے محبت کرے گی ؟

(کمرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی آواز آتی ہے ——— اصغری ناشتہ لئے اندر داخل ہوتی ہے اور پھولوں والی تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پر ناشتہ چن دیتی ہے)

اصغری - دولھن بیگم ، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی ؟

سعیدہ - (ایک دم چونکتی ہے) کیا کہا ؟

اصغری - جی کچھ نہیں . . . . ایسے ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی ——— ناشتہ کر لیجئے ۔

سعیدہ - تم جاؤ ۔

اصغری - جی اچھا ۔

(اصغری ، ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی باہر چلی جاتی ہے ۔ سعیدہ ، آہستہ آہستہ سوچ میں مستغرق صوفے کی طرف بڑھتی ہے اور مسہری پر لیٹ جاتی ہے ۔)

سعیدہ - (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دولھن بیگم ، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی ——— (اونچی آواز میں) اور کون کرے گی ؟ ——— اور کون کر سکتی ہے ؟

(پردہ)

تیسرا منظر

(نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ ——— وسط میں پست قد زنتی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان فوارہ ہے جس میں سے پانی کی پھوار دھڑک دھڑک کر باہر نکل رہی ہے ۔ دھوپ کھلی ہے ۔ آسمان نکھرا ہوا ہے ۔ فضا میں عجیب سا کنوارپن ہے ——— بے حجاب ۔ ہر ذرہ نظارے کی دعوت لئے گویا قبولیت کا منتظر ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ ہوا چلتے چلتے ٹھہر سی گئی ہے کہ باغ کی بیلیں پھر سے اپنی زلفیں سنوار لیں ، پھول اپنے گالوں کی سرخی درست کر لیں ، اور بھونرے کو حسین کلیوں کا منہ چومنا ہے بے خوف و خطر چوم لیں ——— اس فضا میں گھاس کے ہموار قالین پر کرسیاں بچھی ہیں ۔ ایک میں سعیدہ گلابی لباس میں ملبوس خود اپنا ہی عکس بنی بیٹھی ہے ۔ دھوپ کی حدت سے اس کے غازے کے ہلکے سے غبار سے اس کی اپنی گلابیاں ، سرخیاں بن بن کر باہر نکل رہی ہیں ۔ دوسری کرسی میں مجید ہے جو ہولے ہولے سگریٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے نیلے نیلے چھلے منہ سے نکال رہا ہے ۔ اس کا چہرہ مطمئن ہے ۔ سامنے ، امجد ہے ——— اپاہجوں کی کرسی میں ——— اس کے چہرے پر اپاہجوں کی کرسی والی کیفیت ہے جو کسی اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی ——— اس کا رنگ بہت زرد ہے مگر اس کی آنکھوں میں چمک ہے جو سعیدہ کے حسن و جمال کی بازگشت ہے) ۔

امجد ۔ (اپنے دائیں بائیں دیکھ کر) آج موسم کتنا دلفریب ہے ۔

سعیدہ ۔ (فوراً متوجہ ہو کر) جی ہاں ۔

امجد ۔ مجید، جاؤ ۔ سعیدہ کو گھما لاؤ ——۔ ان پہاڑیوں کی سیر کرا لاؤ —— (پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے) افسوس ہے، مجھ سے مڑا نہیں جاتا —— مجید ٹھہرو —— میری کرسی گھما کر ادھر کر دو —— یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیئے ۔

(مجید اُٹھتا ہے ۔ لیکن سعیدہ اس سے پہلے اُٹھ کر امجد کی کرسی کا رُخ پھیر دیتی ہے ۔ اب تینوں کا مُنہ پہاڑیوں کی طرف ہے جو دھوپ میں —— حدِ نگاہ تک اپنے مُنہ دھو رہی ہیں)

امجد ۔ (پہاڑیوں کے منظر کو اپنی نگاہوں سے پیتے ہوئے) سعیدہ، یہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھے پیار ہے —— اتنا پیار کہ میں بیان نہیں کر سکتا —— (مجید سے) جاؤ، مجید، سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کی سیر کراؤ (سعیدہ سے) سعیدہ، جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمھاری سانس رُکنے لگے گی تو تمھیں ایسا محسوس ہوگا کہ اس سے بڑھ کر دُنیا میں اور کوئی لذت نہیں ۔ میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جاتا تھا مگر یہ ایک چڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا —— مجھ سے کہتا تھا، بھائی جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں —— یہ کیا کہ آدمی بیکار میں ہانپ ہانپ کر بیہوش ہو جائے (ہنستا ہے) پہاڑیوں اور ان کو سر کرنے کا حسن اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا ۔ کیوں سعیدہ ؟

سعیدہ ۔ (مسکرا کر) جی ہاں ۔

امجد ۔ (مجید سے) جاؤ یار —— سعیدہ کو لے جاؤ —— کبھی کام بھی کیا کرو ۔

مجید ۔ (سعیدہ سے) چلئے بھابی جان —— مگر میں شرط لگاتا ہوں، آج تو یہ چلی جائیں گی ۔ لیکن پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کریں گی ۔

سعیدہ ۔ نہیں، نہیں —— یہ آپ کیونکر کہتے ہیں ؟

امجد ۔ اس لئے کہ یہ اور دل و دماغ کا آدمی ہے ۔

سعیدہ ۔ دل و دماغ ؟ —— یہ کیا بلا ہے دل و دماغ ؟

مجید ۔ آپ کو ایک ہی پہاڑی پر چڑھنے سے معلوم ہو جائے گا ۔

امجد ۔ (ہنستا ہے) تم بکتے ہو مجید —— سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پہاڑ ہے —— اگر یہ ایک معمولی سی پہاڑی کی چڑھائی ہی سے اُکتا گئی تو ......

سعیدہ ۔ چلئے مجید میاں ۔

مجید ۔ چلئے ۔

(دونوں چلے جاتے ہیں —— امجد مسکراتا ہے —— اصغری داخل ہوتی ہے —— اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے جس میں چھلے اور کٹے ہوئے سیب ہیں ۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجید اور سعیدہ کو دیکھتی امجد کی جانب آتی ہے اور اس سے مخاطب ہوتی ہے)

اصغری ۔ تھوڑے سیب کھا لیجئے ۔

امجد ۔ (جو سعیدہ اور مجید کو ڈھلوانوں میں اُترتے دیکھ رہا ہے) کھا لوں گا ۔

اصغری ۔ (انہی کی طرف دیکھ کر) آج دلھن بیگم کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں ۔

امجد ۔ (ایک دم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں ؟

اصغری ۔ (خفیف سی بوکھلاہٹ کے ساتھ) جی —— جی ہاں !

امجد ۔ (پھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے) خوبصورت ہے ۔ خوبصورت دکھائی نہیں دیتی —— ہونے اور دکھائی دینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اصغری ۔

اصغری - جی ہاں — یہ تو ہے۔

امجد - لاؤ سیب۔

اصغری - (پلیٹ بڑھاتے ہوئے) حاضر ہیں — پر چھلے ہوئے ہیں۔

امجد - تمہارا مطلب؟

اصغری - چھلی ہوئی چیز سے تو ہی بھی دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر) اس کے سرخ سرخ گال تو چھری سے اُتر چکے ہیں۔

امجد - (ہنستا ہے) اصغری! — تم اب بہت شیطان ہو گئی ہو۔

اصغری - (سنجیدگی سے) شیطان؟ — امجد میاں — آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا سب سے بڑا فرشتہ تھا جس نے آدم — یعنی مٹی کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امجد - ہاں ہاں۔

اصغری - اور فرشتوں کے اس ہیڈ ماسٹر کو اس کی سزا دی گئی تھی۔ . .

امجد - درست ہے

اصغری - تو یہ بھی درست ہے۔

امجد - کیا؟

اصغری - کچھ بھی نہیں — درست آخر ہوتا کیا ہے؟ — وہی جسے آپ درست سمجھیں یا درست سمجھنے کی کوشش کریں یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ اس لئے کرلیں کہ آئندہ وہ درست ہوتی رہے گی۔ یا وہ درستی جسے آپ غلطی میں تبدیل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں — لیکن یہ سب بکواس ہے — میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں امجد میاں۔

امجد - تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟

اصغری - میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں — لیکن ایک عورت ہوں امجد میاں۔

امجد - میں کچھ نہیں سمجھا۔

اصغری - (سیب کی ایک قاش اٹھاتی ہے اور امجد کے منہ کے پاس لے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

امجد - (سیب کی قاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

اصغری - آج موسم ہی کچھ ایسا دلفریب ہے۔

امجد - کیا نہیں ہے؟

اصغری - (سیب کی دوسری قاش اٹھا کر) کیوں نہیں۔ . . یہ لیجئے ایک اور قاش . . . .

(دوسری قاش امجد کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالتی ہے)

امجد - (سیب کھاتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) اصغری!

اصغری - (جو پہاڑیوں کا منظر دیکھنے میں محو تھی۔ چونک کر) جی؟

امجد - تمہاری شادی کر دیں؟

اصغری - شادی؟

امجد۔ ہاں ——— اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔

اصغری۔ کیوں امجد میاں؟

امجد۔ شادی بڑی اچھی چیز ہے ——— دنیا میں ہر شخص کی شادی ہو جانی چاہیئے ——— زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ——— بھائی جان سے کہوں گا کہ اصغری کی جلدی شادی کر دیجئے۔

اصغری۔ نہ امجد میاں!

امجد۔ کیوں؟

اصغری۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

امجد۔ کس سے؟

اصغری۔ (سہرے پر بیٹھ جاتی ہے۔ لہجہ فکرمند ہوتا ہے) شادی سے۔

امجد۔ (ہنستا ہے) پگلی!

اصغری۔ سچ کہتی ہوں امجد میاں ——— مجھے واقعی ڈر لگتا ہے ——— اوّل تو ایک نوکرانی کی شادی ہی کیا ہے۔ ہوئی ہوئی، نہ ہوئی نہ ہوئی ——— کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ گاڑی پٹڑی سے اتر جائے اور

امجد۔ (دکھ کے ساتھ) اصغری!

اصغری۔ (رکے جاتی ہے) گاڑی پٹڑی سے اتر جائے اور اصغری قیمہ قیمہ ہونے سے بچ جائے ——— ایک ٹانگ سے لنگڑی، ایک بازو سے لولی اور ایک آنکھ سے اندھی ہو جائے ——— آدھی اصغری غائب ہو جائے ——— آدھی بچ جائے ——— نا امجد میاں ——— میری شادی کا نام نہ لیجئے ——— شادی تو ایک سالم چیز ہے ——— آدھی یا چوتھائی چیز کو شادی نہیں کہتے۔

امجد۔ (سوچتے ہوئے) اصغری!

اصغری۔ (گھٹی گھٹی آواز میں) جی!

امجد۔ تم ٹھیک کہتی ہو (آواز میں تھوڑا سا درد پیدا ہو جاتا ہے) لیکن دیکھو مجھے رنجیدہ نہ کرو ... میں خوش رہنا چاہتا ہوں ——— اپنی ان دو شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں ——— مجھے نہ چھیڑو ——— میرے دل میں درد ہوتا ہے ———

اصغری۔ (امجد کے پاؤں پکڑ لیتی ہے) مجھے معاف کر دیجئے امجد میاں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) جانے میں کیا بک گئی ——— آپ خوش رہیں ——— خدا آپ کو خوش رکھے۔

امجد۔ (بہادری کے ساتھ) خدا کا نام نہ لو ——— اگر اس کو مجھے خوش رکھنا ہوتا تو مجھے اس حادثے کا شکار ہی کیوں کرتا ——— کیا تھا تو مار کر اپنے شکاری تھیلے میں کیوں نہ ڈال لیتا ... اس کا نام نہ لو ——— میری اس کی دشمنی ختم ہو چکی ہے ——— مجھے اگر خوش رہنا ہے تو اپنے لٹے ہوئے وجود ہی کے سہارے خوش رہنا ہے ——— انہی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں پر چند تنکے چن کر مجھے اپنی خوشی کے آشیانے بنانا ہیں۔

اصغری۔ صرف اپنی خوشی کے؟

امجد۔ (بہت زیادہ دکھ کے ساتھ) اصغری خدا کے لئے ——— تم اتنی کیوں ظالم ہو گئی ہو ——— تمہارے منہ میں اگر زبان پیدا ہوئی ہے تو کیا اسی لئے کہ تم میرے دکھ میں اضافہ کرو ... میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو ——— ایک اپاہج کی مدد کرو کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی کے چند دن ——— صرف چند دن گزار لے۔

اصغری ۔ آپ درخواست نہ کیجئے امجد میاں —— میرا کلیجہ پھٹتا ہے —— آپ مالک ہیں، حکم دے سکتے ہیں —— میری زندگی حاضر ہے۔

(اس کے موٹے موٹے آنسو امجد کے سلیپروں پر گرتے ہیں —— اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف چلی جاتی ہے)

امجد ۔ (سر درد جھکا کر اپنے سلیپروں کی طرف دیکھتا ہے جن پر سے اصغری کے آنسو ڈھلک جاتے ہیں —— گردن اٹھا کر اصغری کو دیکھتا ہے جو کہ جا رہی ہے)

(کوٹھی کی جانب سے بیگم نمودار ہوتی ہے۔ شال اوڑھے ہاتھ میں زیورات کے ڈبے لئے وہ امجد کے پاس آتی ہے)

بیگم صاحب ۔ امجد بیٹا۔

امجد ۔ (جلدی سے اپنے پاؤں کمبل سے چھپا کر) جی!

بیگم صاحب ۔ سعیدہ کے لئے جو زیورات تم نے پسند کئے ہیں تیار ہو کر آگئے ہیں۔ لو

(ڈبے امجد کی گود میں رکھ دیتی ہے)

امجد ۔ (بچوں کے سے اشتیاق سے ہر ڈبہ کھول کر سامنے زیورات دیکھتا ہے اور اپنی دلی خوشی کا اظہار کرتا ہے) بہت اچھے ہیں —— بہت عمدہ ہیں —— بہت حسین ہیں —— لیکن اتنے نہیں جتنی سعیدہ ہے ... اصغری —— اصغری! —— ادھر آؤ۔

(اصغری جو ایک سرو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ امجد کے پاس آتی ہے۔ امجد اسے تمام زیورات دکھاتا ہے)

امجد ۔ کہو کیسے ہیں؟

اصغری ۔ آپ خود کہہ چکے ہیں —— حسین ہیں لیکن اتنے نہیں جتنی دلہن بیگم ہیں۔

امجد ۔ (ماں سے) امی جان۔ کپڑے کب آئیں گے۔

اصغری ۔ کل تک آجائیں گے۔

امجد ۔ اور وہ بائیسکوپ مشین —— کیوں نہیں آئی ابھی تک۔

بیگم صاحب ۔ بیٹا —— مجیب آرڈر دے آیا تھا۔ ایک دو روز میں آجائے گی۔

امجد ۔ اچھا (رک کر) امی جان!

بیگم صاحب ۔ جی بیٹا۔

امجد ۔ کچھ اور بھی منگوانا چاہئیے سعیدہ کے لئے —— میں اسے ایک لحظے کے لئے بھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا —— ہر روز اس کیلئے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضروری ہونی چاہیئے۔

بیگم صاحب ۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ جو چاہو کرو۔

امجد ۔ اختیار؟ (رک کر) ہاں ... تو ... امی جان۔

بیگم صاحب ۔ جی!

امجد ۔ کمال کو بھیجئے —— اسپورٹس کی دکان میں جائے —— جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے ... سعیدہ اور مجیب کھیلا کریں گے اور میں دیکھا کروں گا ... اور دیکھئے ...... اس سے کہیئے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے جو میں ... میں بھی سعیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحب ۔ (بے حد متاثر ہو کر امجد کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر) میرے بچے!

(امجد بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے —— اصغری ضبط نہیں کر سکتی اور چیختی ہوئی ایک طرف دوڑ جاتی ہے —— بیگم کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں ہیں)

پردہ

چوتھا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے —— رات کا وقت۔ فضا بالکل خاموش ہے۔ بڑے بے ڈھنگے طریق پر مسہری پر سعیدہ تین چار گدگدے تکیوں میں اپنا نیم سنہرے بالوں والا سر دبائے کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے۔ نظریں کتاب کے حروف کے بجائے اس نے اپنے دل کی جانب معلوم ہوتی ہیں۔ سینے کے مقام پر کمبل کی سلوٹیں چھلیاں لگا رہی ہیں اور ننھے سے تالاب میں جزر کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے —— بائیں طرف لمبے کی ہسپتالوں جیسی چارپائی بچھی ہے —— اس کے ساتھ ہی پایوں والی کرسی میں امجد بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے۔ وہ اسے یوں پکڑے ہے جیسے کوئی شیشے کی چیز ہے۔ اس کی نظریں پریشان ہیں۔ کتاب کے حروف سے اٹھ کر کبھی وہ سعیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی ہیں، کبھی اس کے سنہرے بالوں والے سر پر جو تکیوں میں دھنسا ہے —— آخر اس سے نہیں رہا جاتا —— کتاب بند کر کے اپنی گود میں رکھتا ہے اور بڑی آہستگی کے ساتھ سعیدہ سے مخاطب ہوتا ہے)

امجد۔ سعیدہ!

سعیدہ۔ (چونک کر) جی؟

امجد۔ میرا خیال ہے اب سو جاؤ۔

سعیدہ۔ (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتے ہوئے) آپ سونا چاہتے ہیں تو میں غلام محمد اور کریم کو بلاؤں کہ وہ آپ کو لٹا دیں۔

امجد۔ (کھوکھلی آواز میں) لٹا دیں۔ نہیں سعیدہ —— میں لیٹ لیٹ کے تھک گیا ہوں —— آج یہیں کرسی پر سو جاؤں گا —— تمہیں تکلیف نہ ہو تو اٹھ کے یہ بتی بجھا دو اور سبز بتی روشن کر دو۔

سعیدہ۔ (اٹھتی ہے) آپ بار بار میری تکلیف کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔

امجد۔ میں خود جو تکلیف میں ہوں۔

سعیدہ۔ (چڑ کر) مجھے اس کا احساس ہے امجد صاحب —— مگر بتائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ مجھ سے جو ہو سکتا ہے میں کرنے کے لئے تیار ہوں —— مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کو ہر وقت میری تکلیف کی پڑی رہتی ہے —— مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

امجد۔ سعیدہ، تم بہت اچھی ہو۔

(سعیدہ بتی اوف کرتی ہے —— چند لمحات کیلئے اندھیرا چھا جاتا ہے —— پھر کمرے کی ہر چیز ہلکی ہلکی سبز روشنی میں نہانا شروع کر دیتی ہے)

سعیدہ۔ کاش میں اچھی ہوتی —— اچھی ہو سکتی (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے —— سینے سے اس کا اضطراب ظاہر ہے)

امجد۔ اس سے زیادہ تم اور کیا اچھی ہو سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ۔ (تیزی سے) جی نہیں —— آپ نہیں جانتے۔

امجد۔ (بہت ہی ملائم آواز میں) اگر کسی وجہ سے میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔

سعیدہ۔ (امجد کی طرف دیکھتی ہے —— اٹھتی ہے اور مسکراتی ہوئی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے امجد کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے) سچ تو یہ ہے امجد صاحب کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں۔

امجد۔ (سعیدہ کا ہاتھ پکڑ کر) . . . . . یہ تمہارے دل کی اچھائی ہے اگر تم ایسا سمجھتی ہو، ورنہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

سعیدہ۔ (بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے) سو جائیے —— کئی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں —— بلکہ جب سے یہاں آئے ہیں، ایک لحظے کے لئے بھی آپ کی آنکھ نہیں لگی۔

امجد ۔ مجھے نیند نہیں آتی سعیدہ ۔

سعیدہ ۔ کیوں ؟

امجد ۔ معلوم نہیں کیوں —— بس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آئی تھی نہ آئے گی ۔ ۔ ۔ میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا ہوں جب سویا کرتا تھا ۔

سعیدہ ۔ کاش ! میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی ۔

امجد ۔ نہیں سعیدہ —— میں اتنی عزیز چیز تم سے نہیں چھیننا چاہتا —— یہ تمہاری آنکھوں ہی کے لئے سلامت رہے جو نیند میں اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں —— جاؤ ، اب سو جاؤ ۔

سعیدہ ۔ میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی ۔

امجد ۔ ایسا نہ کہو —— خدا تمہارے بخت بلند کرے ۔ جاؤ سو جاؤ ۔

سعیدہ ۔ (چڑ کر) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں ۔ ۔ امجد صاحب ، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے —— خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی ، یہ حلیمی ، یہ انکسار ، ایک دن مجھے پاگل بنا دے گا ۔

(جھنجھلائی ہوئی تیزی سے مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے)

امجد ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں ، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں ۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے ۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے —— امجد اپنی گود میں سے کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے —— سکوت کا عالم ہے ۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں یہ سکوت اور بھی زیادہ مخیف ہو گیا ہے —— کافی لمبا عرصہ خاموشی میں گزرتا ہے ، بڑی بیزار سی خاموشی میں —— امجد کے چہرے پر روشنی قند و ن کے سبز غلاف کی طرح چڑھی ہے —— اس کی نگاہیں کتاب سے ہٹ کر بار بار سعیدہ کی جانب اٹھتی ہیں ، اور شرمسار ہو کر دبے پاؤں لوٹ آتی ہیں —— تھوڑی دیر کے بعد امجد بہت زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے) ۔

امجد ۔ سعیدہ !

سعیدہ ۔ جی !

امجد ۔ میں —— میں تم سے ایک درخواست کرنی چاہتا ہوں ۔

سعیدہ ۔ (کروٹ نہ بدلتے ہوئے) کیا ؟

امجد ۔ کیا ۔ ۔ کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

سعیدہ ۔ (بستر میں لرز سی جاتی ہے)

امجد ۔ وہ رات —— جو ابھی تک نہیں آئی ۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے)

وقفہ

امجد ۔ سعیدہ ۔

سعیدہ ۔ جی !

امجد ۔ کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو ؟

سعیدہ - (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتی ہے۔ ۔ ۔ اس کی آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے) کہئے امجد صاحب :

امجد - جھوٹ موٹ۔۔ محض میرے بہلاوے کے لئے۔ تم یہ فرض کر لو کہ میں تمہارے پہلو میں بیٹھا ہوں۔۔ میں یہاں فرض کر لوں گا کہ تم میرے پہلو میں بیٹھی ہو۔۔ میں تم سے وہی باتیں شروع کر دوں گا جو پہلی رات کو مجھے تم سے کہنا تھیں۔۔ تم اسی طرح جواب دینا جس طرح تمہیں دینا تھا۔ میرے لئے۔ کیا میرے لئے تم یہ جھوٹ موٹ کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ۔

سعیدہ - (آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش رک جاتی ہے۔ ہم کے آنسو تیرتے ہیں) میں حاضر ہوں امجد صاحب۔

امجد - شکریہ۔

(طویل وقفہ)

امجد - آج ہماری پہلی رات ہے سعیدہ۔ وہ رات جس میں جوانیاں ارضی جنت کی طرف پہلا قدم اٹھاتی ہیں ـــ وہ رات جس کی تمام پہنائیوں میں دو جی غوطہ لگاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں۔ شرماؤ نہیں۔ یہ رات تو وہ ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں کے گھونگھٹ اٹھنے کے لئے بیتاب ہونے ہیں۔ ہلکی سی سرگوشی، نرم سی آہ، ایک چھوٹا سا لمس، بے بس سانس کا نتھا سا بلکہ ابھی ان گھونگھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے ۔ ۔ ۔ اس قدر آہستہ کہ بے معنی سی سرسراہٹ تک بھی نہیں ہوتی اور آدمی، دیدار ـــ پورے دیدار کے تمام مراحل طے کر جاتا ہے ـــ یہ وہ رات ہے جب نگاہیں ٹکرا کر تارے جھڑتی ہیں اور یہ افشاں دونوں زندگیوں کے ایک ماتھے پر چُنی جاتی ہے۔ یہ وہ رات ہے ـــ پہلی رات، سب سے پہلی رات جب آدم کی پسلیاں چیر کر حوا نکالی گئی تھی ـــ یہ وہ رات ہے جس کی درازی عمر کے لئے شاعر دعائیں مانگ مانگ کر ابھی تک نہیں تھکا ـــ یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لئے جوانی کی جائے نماز بچھا کر زندگی اکثر سجدہ ریز رہی ہے ۔ ۔ ۔ یہ وہ رات ہے جس میں حجاب کی تمام گرہیں فطرت کے ناخن خود کھولتے ہیں ـــ یہ وہ رات ہے جب قدرت کے تمام کارخانے صرف ایک ہی پرزہ ڈھال رہے ہوتے ہیں ـــ وہ پرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشی تھی ـــ یہ وہ رات ہے جب تمام آدرش دلہنیں اپنے مزاجوں میں چلی جاتی ہیں کہ اس آوارہ تاملوں انتہائی آرام وسکون سے گذر جائے۔ جس میں کن کی گونج ہے ۔ ۔ ۔ یہ وہ رات ہے جس کا ہر پردہ اجالے سے بنا ہے ـــ یہ وہ رات ہے، ہر آنے والی رات جس کے حضور دامن پھیلائے بھیک کی منتظر کھڑی ہے ۔ ۔ یہ وہ رات ہے جب بدن کا رواں رواں منہ کھول کے بولتا ہے اور کان کھول کے سنتا ہے۔ بڑے بڑے ان کہے راز ـــ بڑے بڑے ان گائے راگ ۔ ۔ (ایک دم چیخ کر) ڈھانپ لو۔ ڈھانپ لو۔ ۔ سعیدہ اپنا بدن ڈھانپ لو۔ ۔ یہ مجھے ڈس رہا ہے ـــ اس کا ایک ایک خط تلوار کی دھار سے مانند میری نوکی خواہشوں پر پھیر رہا ہے۔ ۔ ڈھانپ لو ـــ خدا کے لئے اپنا جسم ڈھانپ لو۔

سعیدہ - (ہلکی ہلکی سبز روشنی میں گھاس کی نرم نرم پتیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند لیٹی ہے۔ اس کا بدن لرز رہا ہے ـــ ایک ایک انگ کانپ رہا ہے) جی!

امجد - (بلک بلک کر رونے لگتا ہے) اپنا بدن ڈھانپ لو۔

(سعیدہ اپنا لرزتا ہوا بدن کمبل سے ڈھانپ لیتی ہے۔ امجد آنکھوں کے سامنے ہاتھ رکھے روتا رہتا ہے)

پردہ

پانچواں منظر

(منظر — ولایت علی کا باغیچہ ـــ شام کا وقت۔ فوارے کا پانی کھل کھیل رہا ہے۔ سائے گہرے ہو چکے ہیں۔ پس منظر میں ناشپاتی پہاڑیاں

شام کے دھندلکوں میں رنگینی اختیار کر گئی ہیں۔ آسمان نے ایسا لگتا ہے اپنے بدن پر بھبوت مل لی ہے۔ تختوں کے سینے پر سبزہ خاموش لیٹا ہے۔ کرسیاں خالی ہیں ——— ساری فضا خالی ہے۔ اس فریم کی طرح جس میں تصویر جڑی جانے والی ہے ——— مجید اور سعیدہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے ——— چند لمحات کے بعد دونوں ہنستے، بڑی مشکل سے اپنی تھکاوٹ، بوجھ اٹھاتے داخل ہوتے ہیں ——— سعیدہ نڈھال ہو کر خود کو کرسی پر گرا دیتی ہے۔ مجید اس کے پاس کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ ۔ (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) اُف ——— ف!

مجید ۔ (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں ——— دبا دوں آپ کو؟

سعیدہ ۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں ——— اصغری کو بھیج دیجئے ——— مجھ سے تو اب دو قدم بھی چلنا دشوار ہے۔

مجید ۔ (مسکراتا ہے) بہتر ——— (آگے بڑھ کر سعیدہ کے چہرے پر بکھرے بالوں کی آوارہ لٹ انگلیوں سے اٹھا کر ایک طرف کر دیتا ہے)

سعیدہ ۔ (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر ——— (اٹھنے لگتی ہے)

مجید ۔ (ایک طرف دیکھ کر) لو، وہ اصغری خود ہی آ گئی ——— آؤ اصغری ——— بھابی جان کے پاؤں دبا دو۔

(اصغری داخل ہوتی ہے ——— اس کے ہونٹوں سے اختلاج لینے لگا رہے ہیں جیسے کچھ کہنے کے لئے تڑپ رہے ہیں ——— پاس آ جاتی ہے)

اصغری ۔ (سعیدہ سے) دولہن بیگم بہت تھک گئیں آج؟

سعیدہ ۔ (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) ہاں!

اصغری ۔ (کرسی پر بیٹھ کر سعیدہ کی ایک پنڈلی دبانا شروع کرتی ہے۔ خطاب مجید سے ہے) یہ سب مجید میاں کا قصور ہے ——— اتنی بڑی سیر اور اتنی جلدی ——— (لہجے میں تلخی آ جاتی ہے) ہر چیز دھیرے دھیرے ہونی چاہئے (ہولے ہولے دباتی ہے) اس طرح ——— ہولے ہولے (سعیدہ سے) کیوں دولہن بیگم ——— کچھ آرام محسوس ہوا آپ کو؟

سعیدہ ۔ (دوسری ٹانگ جو اصغری کی گرفت سے آزاد ہے، اضطراب کا شدید اظہار کرتی ہے) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!

اصغری ۔ (مجید سے) مجید میاں، آپ جائیں ——— منہ ہاتھ دھو آئیں ——— گرد و غبار سے آپ کا چہرہ [illegible] ہو گیا ہے۔

مجید ۔ (تیزی سے) تم بہت گستاخ ہو گئی ہو ——— یہ سب

اصغری ۔ (مجید کی بات کاٹ کر) دولہن بیگم کا قصور جنھوں نے مجھ کو منہ لگا لیا ہے (سعیدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر) ایسا خوبصورت منہ! (مجید نگاہوں ہی نگاہوں میں غصہ برساتا چلا جاتا ہے)

اصغری ۔ (ہنستی ہے) مجید میاں کی شکل و صورت یوں تو ماشاءاللہ بڑی اچھی ہے ——— مگر غصے میں ہمیشہ بگڑ جاتی ہے ——— آپ کا کیا خیال ہے۔

سعیدہ ۔ تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو (اٹھنا چاہتی ہے مگر اصغری کی مضبوط گرفت کے باعث نہیں اٹھ سکتی) چھوڑ دو مجھے۔

اصغری ۔ (دہلتے ہوئے) میں اس خدمت سے خود کو چھڑانا نہیں چاہتی (سعیدہ کے پاؤں سے سینڈل اتارتی ہے) مجید میاں کہتے تھے، میں گستاخ ہو گئی ہوں ——— کیا یہ درست ہے دولہن بیگم۔

سعیدہ ۔ بالکل درست ہے۔

اصغری ۔ (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے پاؤں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) تو یہ بہت بری بات ہے ——— نوکرانی کو گستاخ کبھی نہیں ہونا چاہئے ——— آپ میرے کان کھینچئے۔

سعیدہ ۔ خاموش رہو!

اصغری - یہ ظلم ہے ــــ زبان بندی بہت بڑا ظلم ہے، دولھن بیگم ــــ میں نے ایسی کونسی بات کی جو آپ کو ناگوار گذری -

سعیدہ - (اضطراب کے ساتھ) تمہاری سب باتیں مجھے ناگوار گذرتی ہیں -

اصغری - اصغری بے چاری اب کیا کہے - (توقف کے بعد) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ جیسی لکھی پڑھی بیگم کی نوکری میں اس ایک برس کے اندر اندر ہی مجھے سب کچھ آ گیا ہے ... پر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط سمجھی تھی ــــ میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا؟ ــــ لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا؟

سعیدہ - (اپنی دونوں ٹانگیں ایک طرف سمیٹتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں) تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

اصغری (مصنوعی حیرت سے) میں؟

سعیدہ - ہاں تم ــــ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

اصغری - (سوچتے ہوئے) کہنے کو تو میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں ــــ

سعیدہ - (اٹھ کر ننگے پاؤں گھاس پر چلتے ہوئے) تو کہہ ڈالو آج ــــ مجھے تمہاری ہر روز کی مبہم مبہم چٹکیاں پسند نہیں ــــ جو تم کہنا چاہتی ہو، میں سننے کے لئے تیار ہوں -

اصغری - آپ بڑی ہمت والی ہیں دولھن بیگم -

سعیدہ - میں ہمت والی ہوں یا بزدل ہوں، تم اسے چھوڑ دو - جو کہنا چاہتی ہو آج اگل ڈالو -

اصغری - یہ آپ کو اور مجھے دونوں کو تکلیف دے گی -

سعیدہ - میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو ــــ میں برداشت کر لوں گی -

اصغری - (سوچتے ہوئے) میں سمجھتی تھی، میرے دانتوں تلے دبی ہوئی تاریں دیکھ کر آپ ڈر جائیں گی - پر اب ایسا لگتا ہے کہ آپ جلتی ہوئی ایسی جگہ پہنچ گئی ہیں جہاں زخموں کی کوئی پروا نہیں رہتی ــــ اب تو مجھے خوف آنے لگا ہے آپ سے -

سعیدہ - (اضطراب میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) اصغری!

اصغری - (چونک کر) جی؟

سعیدہ - تم مجھے یہ بتاؤ ــــ اگر امجد میاں کار کے حادثے میں مر جاتے تو میں کیا کرتی؟

اصغری - آپ! ــــ مجھے معلوم نہیں آپ کیا کرتیں -

سعیدہ - میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں ــــ میرے سینے میں ایسے ہزاروں ارمان ہیں جو میں سترہ برس تک اپنے خیالوں کا شہد پلا پلا کر پالتی پوستی رہی ہوں .... میں ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ــــ میں نے بہت کوشش کی ہے اصغری ــــ میرا خدا جانتا ہے، میں نے بہت کوشش کی ہے، لیکن میں اپنے ہاتھوں کو اس قتل پہ آمادہ نہیں کر سکی ــــ تم مجھے کمزور کہہ لو ــــ بزدل کہہ لو ــــ اخلاق باختہ کہہ لو .... تم ایک نوکرانی ہو ــــ میں تمہارے سامنے اعتراف کرتی ہوں کہ میں اپنی جوانی کا باغ، جس کے پتے پتے، بوٹے بوٹے میں میرے کنوارے ارمانوں کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہے اپنے ہاتھوں سے نہیں اجاڑ سکتی ... ویسے میں کسی کو بھی اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ میری آنکھیں بند کر کے ــــ نہیں ــــ میرے تمام حواس میں تالے لگا کر بڑھاپے اور رنڈاپے کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتار دے ــــ یا ایک ہی بار دھکا دے کر مجھے اپنے ارمانوں کی لرزتی ہوئی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے نیچے گرا دے، جن پہ میں اس وقت تک دامن سمیٹے تند ہواؤں کا مقابلہ کرتی رہی ہوں ــــ میں تم کو بھی اس کی اجازت دیتی ہوں -

اصغری ۔ (شکست خوردہ اُٹھتی ہے) بس دولہن بیگم ۔

سعیدہ ۔ میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں اصغری، جہاں زمین میرے قدموں کے نیچے گھوم رہی ہے ۔ میں جس راستے کی طرف منہ کرتی ہوں وہی مجھ سے منہ موڑ لیتا ہے ۔ — میں جو ارادہ کرتی ہوں، مجھ سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا ہے ۔ میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوں —— اندھادھند دوڑتی ہوں اور جب اسے پکڑ لیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا بنا تھا ۔ میرے پلٹتے پکڑتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے —— اصغری تم نہیں جانتی ہو میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر لوٹ رہی ہوں ۔ بجھانے کے لئے میں ان پر پانی ڈالتی ہوں تو بھاپ کے ایسے بگولے اُٹھتے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ اونچائیوں میں لے جاتے ہیں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ایک دم نیچے دے پٹکتے ہیں —— میری ہڈی ہڈی، پسلی پسلی چور ہو چکی ہے اصغری کیا ہی اچھا ہوتا اگر امجد صاحب کے بدلے میں اپاہج ہوئی ہوتی ۔

(طویل وقفہ —— اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے —— سعیدہ اضطراب میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہے)

سعیدہ ۔ بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔

اصغری ۔ (محویت کے عالم سے بیدار ہوتی ہے) کیا کرنا چاہیئے ؟ —— آپ کو —— آپ کو امجد میاں کی موت کا انتظار کرنا چاہیئے ۔

سعیدہ ۔ (کچھ دیر سوچ کر) تم مجھے انتہا درجے کی سنگدل کہو گی —— لیکن میں پوچھتی ہوں —— انھیں کب موت آئے گی ۔

اصغری ۔ جب اللہ میاں کو منظور ہوگا (بڑبڑاتی ہے) لیکن امجد میاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے ۔

سعیدہ ۔ کیا کہا ؟

اصغری ۔ جی، کچھ نہیں ۔

(اکھڑے اکھڑے قدم اُٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے —— سعیدہ ننگے پاؤں گھاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اضطراب کی حالت میں ٹہلتی رہتی ہے)

پردہ

چھٹا منظر

(نگار ولا —— ڈرائینگ روم —— وسیع و عریض کمرہ جو پُرانی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے ۔ ہر چیز وزنی اور پائدار ہے —— دیواروں پر آئل پینٹنگز آویزاں ہیں ۔ جو خاندان کے مختلف افراد کی ہیں ۔ ایک پینٹنگ بیگم کی ہے ۔ جب کہ وہ جوان تھی ۔ اس پینٹنگ کے نیچے بیگم ایک صوفے پر بیٹھی تقابل پیش کر رہی ہے ۔ تصویر میں وہ بے فکر ہے مگر صوفے میں سخت فکرمند ۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کا مجموعہ ہے کوئی اُونی چیز بُن رہی ہے اگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کے اُلجھے ہوئے دھاگے کبھی لپیٹتی ہے کبھی کھولتی ہے —— اصغری داخل ہوتی ہے)

بیگم صاحب ۔ مجید میاں ملے ؟

اصغری ۔ جی ہاں !

بیگم صاحب ۔ کہاں تھے ؟

اصغری ۔ باغیچے میں ۔

بیگم صاحب ۔ کیا کر رہے تھے ؟

اصغری۔ جی! — (ڈر کر) جی کہیے بیٹھے تھے۔
بیگم صاحب۔ (اصغری کی طرف دیکھ کر نگاہیں نیچی کر کے) آ رہے ہیں۔
اصغری۔ جی ہاں!
بیگم صاحب۔ تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے — مجید اس کی طرف دیکھتا اندر داخل ہوتا ہے)

مجید۔ کیا بات ہے امی جان!
بیگم صاحب۔ کچھ نہیں — بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پہ بیٹھ جاتا ہے) یہاں سردی ہے۔
بیگم صاحب۔ ہاں — یہاں سردی ہے۔

(وقفہ)

مجید۔ (بے چینی محسوس کرتے ہوئے) میرا خیال ہے — آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لئے بلایا ہے۔
بیگم صاحب۔ ہاں!
مجید۔ فرمائیے!
بیگم صاحب۔ میں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں۔
مجید۔ مجھے؟ (اٹھ کر) کہاں؟
بیگم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) یہ کہیے۔
بیگم صاحب۔ میں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی۔
مجید۔ (پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کون سی۔
بیگم صاحب۔ یہی تمہیں یہاں سے بھیجنے کی۔
مجید۔ لیکن آپ مجھے یہاں سے کیوں بھیج رہی ہیں۔ ... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے یا
بیگم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) کوئی خاص کام ہے؟
بیگم صاحب۔ نہیں۔
مجید۔ تو پھر مجھے یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے۔
بیگم صاحب۔ کہ میں اسی میں بہتری سمجھتی ہوں۔
مجید۔ بہتری؟ — کس کی بہتری؟
بیگم صاحب۔ ہم سب کی — اس گھر کی۔
مجید۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں امی جان۔

بیگم صاحب ۔ مجید تم میرے لڑکے ہو، میں تمہاری ماں ہوں ــــ میرے تمہارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہونی چاہیئے جو اس مقدس رشتے پر ذرہ سی بھی کالک لگائے ــــ میں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کراچی چلے جاؤ اور جب تک میں کہوں وہیں رہو۔

مجید ۔ لیکن امی جان ــــ

بیگم صاحب ۔ (بات کاٹ کر) تمہارے وہاں بے شمار دوست موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے، تم ان کی مدد سے، یا خود اپنی ہمت سے اس منجدھار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں اپنی کشتی صحیح وسلامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید ۔ (کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا اور بیٹھ جاتا ہے) بہت بہتر ــــ میں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحب ۔ تمہارا فیصلہ ۔ ۔ ۔ ۔ (ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)۔

(کمرے میں امجد اپاہجوں والی کرسی میں داخل ہوتا ہے جسے کریم چلا رہا ہے)

امجد ۔ (مجید سے) یار مجید، تم بھی عجیب آدمی ہو ــــ میں وہاں کمرے میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں گے ــــ لیکن تم یہاں بیٹھے ہو (بیگم صاحب سے) امی جان ــــ آپ نے کیا سوچا ــــ کیسا تحفہ ہونا چاہیئے ــــ میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحب ۔ تم سعیدہ سے کیوں نہیں پوچھتے۔

امجد ۔ لو اور سنو (ہنستا ہے) حد کر دی آپ نے امی جان ــــ اس سے مشورہ لیا تو تحفے کا مزا کیا خاک آئے گا (مجید سے) کیوں مجید؟

(مجید خاموش رہتا ہے)

امجد ۔ بولو یار۔

مجید ۔ (اُٹھ کر) آپ امی جان سے پوچھئے ــــ میں تو جا رہا ہوں۔

امجد ۔ (حیرت سے) جا رہے ہو؟ ــــ کہاں جا رہے ہو؟

مجید ۔ کراچی!

امجد ۔ یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ــــ کیا کرنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید ۔ کیا کرنے جا رہا ہوں (پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) منجدھار میں سے اپنی کشتی نکالنے۔

امجد ۔ (بیگم سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یار ــــ پرسوں اس کی سالگرہ ہے ــــ ابھی ابھی فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔

مجید ۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

امجد ۔ کیا؟

مجید ۔ کہ میں کراچی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

امجد ۔ کیا بکتے ہو (بیگم سے) امی جان، یہ قصہ کیا ہے؟

بیگم صاحب ۔ کچھ نہیں ــــ ماں بیٹے میں لڑائی ہو گئی کسی بات پر۔

امجد ۔ کس بات پر؟

بیگم صاحب ۔ تم نہیں پوچھ سکتے۔

امجد ۔ صد دل لگی تو ہوتی ہے ــــ لیکن مجید میرا بھائی ہے ــــ آپ کے اور اس کے درمیان اگر کوئی رنجش یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اسے دور کرنا

میرا فرض ہے ——— مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں ——— اس سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ جو آزار کا موجب ہو ———

(مجید سے) ادھر آؤ مجید۔

مجید۔ بھائی جان، مجھے اپنا اسباب بندھوانا ہے۔

امجد۔ لاحول ولا ——— یہ سب کیا ہے ——— (بیگم سے) امی جان ——— خدا کے لئے اسے روکئے ——— میرے لئے نہیں تو سعیدہ کے لئے روکئے ——— اس گھر میں ایک صرف یہی ہے جس نے ابھی تک اسے آدا س نہیں ہونے دیا ——— میری خاطر اتنی زحمت برداشت کرتا ہے ——— اگر آپ نے اسے جانے دیا تو امی جان، میں نہیں جانتا میرا کیا حال ہوگا ——— سعیدہ کو سیر کے لئے لے جاتا ہے تو میں تصور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے میں اس کے ہمراہ ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا ہے تو وہ خواہش بہت حد تک پورا ہو جاتا ہے جو قدرت کے بے رحم ہاتھوں نے میری زندگی میں پیدا کر رکھا ہے ——— میں نے کئی بار سوچا ہوں امجد، اگر تیرا بھائی مجید نہ ہوتا تو کیا تیری شکستہ زندگی کا ملبہ تو اس قابل نہیں تھا کہ گھر سے پرے پڑا ہوتا ——— امی جان اسے روکئے ——— یہ تو میرا بازو ہے ——— کیوں آپ اس کو مجھ سے جدا کر رہی ہیں ——— اللہ میاں کی جگہ نہ لیجئے امی جان

(رونے لگتا ہے)

مجید۔ میں جا رہا ہوں امی جان۔

بیگم صاحب۔ ٹھہرو!

مجید۔ (رک جاتا ہے)

بیگم صاحب (اٹھتی ہے اور امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا ——— روؤ نہیں جان مادر ——— مجید نہیں جائے گا ——— جو چیز جہاں ہے وہیں رہے گی ——— اس لئے کہ اسے یہی منظور ہے ——— (مجید سے) مجید ——— بھائی کے پاس بیٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سوچو (چلی جاتی ہے)

(مجید کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے)

مجید۔ (آہستہ) بھائی جان، آپ مجھے جانے دیں۔

امجد۔ (جھکا ہوا سر اٹھا کر) جانے دوں! ——— کہاں جانے دوں؟ ——— پاگل مت بنو۔

مجید۔ آپ نہیں سمجھتے بھائی جان۔

امجد۔ میں سب سمجھتا ہوں ——— اپنا رومال نکالو اور ذرا میرے یہ آنسو پونچھ دو۔

مجید۔ (تھوڑے توقف کے بعد اپنا رومال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے ——— جلدی جلدی)

امجد۔ کیا کرتے ہو یار ——— تمہیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا ——— (مسکراتا ہے) اتنا معمولی سا کام ہے۔

مجید۔ یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد۔ (مسکرا کر) اچھا بھائی بڑا جان جوکھوں کا کام ہے ——— آؤ ادھر بیٹھو ——— سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں۔ بیٹھو۔

مجید۔ (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) سوچئے۔

امجد۔ (آہ بھر کر) سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں ——— سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے۔ لیکن ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں)

پردہ

ساتواں منظر

(نگار دولت [illegible] ــــ شام کا وقت۔ فوارے کا پانی بند ہے جیسے وہ اُبل اُبل کر عاجز آچکا ہے۔ پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں دھندلکوں میں اپنی سلوٹیں جیسے چھپا رہی ہیں۔ فرش پر سبزہ روندا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ دائیں طرف، فوارے سے دور ہٹ کر کچھ جھاڑیاں جن کے عقب میں امجد، پایوں والی کرسی میں بیٹھا ہے۔ پشت پر اصغری کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے ــــ وہ اسے چلانے لگتی ہے)

امجد۔ نہیں اصغری ـــ کچھ دیر ٹھہرو۔

اصغری۔ اندھیرا ہو جاتی ہے، لیکن امجد میاں ۔

امجد۔ میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھانا چاہتا ہوں۔

اصغری۔ یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصور ہی میں کھا سکتے ہیں ـــ لیکن [illegible] یہ زخم تو آپ کے لگ چکا ہے [illegible] اسے دوبارہ کیوں کھلوانا چاہتے ہیں آپ ؟

امجد۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میری حالت میں جو آدمی ہو اس کے بدھونے کی کوئی حد نہیں رہتی ـــ اپنے زخموں کے ٹانکے کھول کھول کر دیکھتا ہے۔ انگوروں کی زبانی ٹیپوں کی داستانیں سنتا ہے اور خود کو بہت بڑا شہید سمجھتا ہے [illegible] (ہنستا ہے) اصغری تمہاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں، اس لئے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں جانتی ہو جو عجز کی انتہا کو پہنچ کر شکست و ریخت میں بلند بام عمارتیں بناتے ہیں۔

اصغری۔ (مسکراتی ہے) میں تو ان حدود سے بھی آگے نکل گئی ہوں امجد میاں ـــ بڑی اونچی اونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا چکی ہوں ـــ ایسا کرنے کرنے تو میرے دل میں بھی گٹے پڑ چکے ہیں۔

امجد۔ (کانپ جاتا ہے) اصغری ـــ تم بڑی خوفناک ہو۔

اصغری۔ (ہنستی ہے) ہر اجاڑ خوفناک ہوتی ہے ـــ حالانکہ بیچاری کیا خوفناک ہو سکتی ہے۔ اسے اپنے ماتم سے اتنی مہلت ہی کہاں ملتی ہے جو دوسروں کو ڈرائے ـــ وہ تو خود دبکی ہوئی سہمی ہوئی ہوتی ہے۔

امجد۔ تمہاری زندگی بھی کسی حادثے سے دوچار ہوئی ؟

اصغری۔ جی نہیں ـــ اس جی کی زندگی کسی حادثے سے کیا دوچار ہو گی جو کہ خود ایک حادثہ ہے۔

امجد۔ تمہاری باتوں سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔

اصغری۔ اس لئے کہ اب آپ کی سونگھنے کی حس جاگی ہوئی ہے۔

امجد۔ پہلے سو رہی تھی۔

اصغری۔ جی ہاں ـــ بہت گہری نیند۔

امجد۔ اسے جگایا کس نے ہے ؟

اصغری۔ اس گاڑی نے جو پٹڑی سے اُتر گئی۔

امجد۔ (بڑبڑاتا ہے) اس گاڑی نے ـــ جو پٹڑی سے اُتر گئی [illegible] (ذرا بلند آواز میں) کیا یہ پھر پٹڑی سے اُترے گی ؟

اصغری۔ جو اللہ میاں کو منظور ہے وہی ہو گا۔

امجد - اللہ میاں کا نام مت لو ——— میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے -

اصغری - نہیں امجد میاں، اس شخص سے ہم انسوں کی دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی ——— ٹوٹ ٹوٹ کے آپ جڑتی رہتی ہے -

امجد - یہ سب بکواس ہے -

(دونوں ایک دم چونکتے ہیں - قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے ——— مجید اور سعیدہ ہانپتے ہانپتے مڑ داخل ہوتے ہیں ——— سعیدہ جو بہت تھکی ہوئی ہے - برآمدے کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے - مجید کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ - آج تو میں بہت تھک گئی ہوں -

مجید - حالانکہ ہم زیادہ دور نہیں گئے -

سعیدہ - ہاں !

(وقفہ)

مجید - کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا -

سعیدہ - اچھا ہی ہوتا -

مجید - میری جان عجیب مشکل میں پھنس گئی ہے ——— میں کراچی چلا جاتا ... لیکن سوال ہے کیا میں اس منجدھار میں سے اپنی کشتی کیسے کر کنارے لے جاتا ؟ ——— نہیں ——— میں ضرور ناکام رہتا -

سعیدہ - مجھے معلوم ہے -

مجید - تمہیں معلوم ہے ——— مجھے معلوم ہے ——— سوائے بھائی جان کے اور سب کو معلوم ہے اور یہی انسانی کا سب سے المناک حصہ ہے -

سعیدہ - میں نے کئی بار سوچا ہے کہ ان سے کہہ دوں، لیکن (آنکھ کھڑی ہوتی ہے) مجھے ڈر ہے، وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکیں گے -

مجید - مجھے خود اسی بات کا ڈر ہے ——— ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک برس اور زندہ رہیں گے ... غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ چھیننا ظلم ہے -

(جھاڑیوں کے عقب میں امجد اپنے دانت بھینچ لیتا ہے ——— اصغری مضبوطی سے اس کا کندھا پکڑ لیتی ہے)

سعیدہ - ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک وہ زندہ رہیں خوش رہیں - ان کے احساسات کے نازک آبگینوں کو ہلکی سی ٹھیس بھی نہ لگے ......

مجید - اور اگر ہمارا کوئی چھالا رگڑ کھا کے پھوٹ پڑا تو ...

سعیدہ - (قریب قریب چیخ کر) تو قیامت آ جائے گی -

مجید - اسی لئے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں ...... جب تک بھائی جان

سعیدہ - (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجید ——— اتنے ظالم مت بنو -

(امجد، ذرا ہجوں کی کرسی میں لرز جاتا ہے، اصغری اس کا دوسرا کندھا بھی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے)

مجید - محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے سعیدہ ——— کم بخت دوسروں کی موت پر ناچنے کی خواہش کرنے ہوئے بھی نہیں شرماتی -

سعیدہ - ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہئیں -

مجید - ٹھیک ہے ——— لیکن آ جائیں تو کیا کریں -

سعیدہ - کیا کر سکتے ہیں ——— چلو -

(سعیدہ، کونے کی جانب چلتی ہے ——— مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہے ——— جھاڑیوں کے عقب میں اپاہجوں والی کرسی میں امجد کا سر جھکا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے اصغری بُت بنی کھڑی ہے)

اصغری۔ چلیں ؟

امجد۔ (اسی طرح سر جھکائے) نہیں ——— ابھی نہیں ——— میں سوچ رہا ہوں۔

اصغری۔ کیا ؟

امجد۔ معلوم نہیں ——— شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیئے۔

اصغری۔ ایسی سوچ بچار بالکل فضول ہوتی ہے۔

امجد۔ (سر اُٹھا کر) فضول تو ہوتی ہے ——— مگر پھر کیا کروں ——— (وقفے کے بعد) وہ اتنے ظالم نہیں ہیں جتنی تم ہو ——— تم تو مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو ——— تم بڑی ظالم ہو اصغری !

اصغری۔ (مسکرا کر) محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے امجد میاں ——— کم بخت اپنی موت پر بھی ناچنے سے باز نہیں آتی۔

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری امجد کے سامنے آتی ہے۔ امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے ——— کچھ سوچتا ہے اور بڑبڑاتا ہے)

امجد۔ یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

اصغری۔ کہیں ردی کی ٹوکری میں ..... اپنی صحیح جگہ !

امجد۔ چلو ——— مجھے لے چلو۔

(اصغری کرسی کھینچتی ہے اور کونے کی جانب چلتی ہے)

پردہ

آٹھواں منظر

(وہی کمرہ جو پہلے، دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے۔ رات کا وقت ——— چھت سے سبز روشنی کی پھوار گر رہی ہے ——— ہر شے کا اصلی رنگ بدلا ہوا ہے۔ جیسے اعصاب زدہ مریضوں کا ——— مسہری خالی ہے۔ کچھ اس طور پر خالی جیسے وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی ——— اصغری، امجد کو اپاہجوں والی کرسی میں اندر لاتی ہے)

اصغری۔ دلہن بیگم، بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں چلی گئیں ؟

امجد۔ ڈرتی تھی۔

اصغری۔ آپ سے ؟

امجد۔ (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ڈرے گا ——— وہ اپنے آپ سے ڈرتی تھی۔

اصغری۔ وہ اتنی کمزور نہیں ہیں امجد میاں۔

امجد۔ وقت بڑے بڑے پہاڑ کھوکھلے کر دیتا ہے ——— وہ تو ایک جوان لڑکی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب ؟

امجد - سونا؛ ...... (ہنستا ہے) میرا مذاق مت اُڑاؤ اصغری —— میرے جلتے ہوئے زخموں کی توہین ہوتی ہے۔

اصغری - (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے محبت ہے؟

امجد - نہیں۔

اصغری - تو پھر یہ جلتے ہوئے زخم کیسے!

امجد - مجھے سوچنے دو ...... یعنی اجازت دیتی ہو سوچنے کی؟

اصغری - آپ سوچئے۔

(طویل وقفہ جس میں امجد سوچ میں غرق رہتا ہے)

امجد - مجھے سعیدہ سے محبت نہیں ہے —— جس طرح مارکٹ سے آدمی اچھی چیز چن کے لاتا ہے ...... اسی طرح میں نے سینکڑوں لڑکیوں میں سے اسے انتخاب کر کے اپنی بیوی بنایا تھا —— مجھے اپنے اس انتخاب پہ ناز تھا اور بجا ناز تھا —— سعیدہ مبالغے کی حد تک خوبصورت ہے —— اس پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ میں نے اُسے چنا اور اپنی رفیقۂ حیات بنایا —— اس حیات کا جو اب گھُلی ہوئی اسی کرسی میں ڈھیر ہے —— جو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہل نہیں سکتی ...... ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لئے دیا ہے ...... سمجھ میں نہیں آتا میں کیوں اس عرصے تک اس کو ایسی زنجیروں میں باندھ کے رکھنا چاہتا ہوں، جن کا ہر حلقہ میری اپنی زندگی کی طرح غیر یقینی ہے ...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا ...... (سوچتے ہوئے) اس کی جوان خوبصورتی ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے (ایک دم چونک کر) یہی یہی —— یہی وجہ ہے اور کوئی نہیں ...... (تکلیف محسوس کرتا ہے) وہ —— وہ ...... وہ نظارہ —— وہ نظارہ ...... مجھے بھول سکتا ہے۔ کبھی وہ نظارہ ...... اس مسہری میں جوان خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ لیٹی دُنیا کی حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر رہی تھی ...... یہ نظارہ میرے ساتھ چمٹ گیا ہے —— نہیں، میں اس کے ساتھ چمٹ گیا ہوں ...... (وقفے کے بعد) اصغری!

اصغری - (چونک کر) جی!

امجد - کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے جو یہ چمٹ کر رہ جانے والی چیز میرے وجود سے علیحدہ ہو جائے۔

اصغری - ہر مشکل کی جڑ میں اس کو آسان کرنے کی ترکیب چھپی ہوتی ہے۔

امجد - تو ڈھونڈنی چاہیئے ...... لیکن ...... لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے۔

اصغری - معلوم نہیں کیوں —— یہ مشکل، آپ ہی کی مشکل ہے۔ اس کے لئے آپ کا ہاتھ کسی نامحرم کا ہاتھ نہیں ہوگا۔

امجد - جانتا ہوں ...... میں اپنے دل کی ان تمام ناخلف نسوں سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں —— لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اصغری - کس کا؟

امجد - میرے سامنے آؤ۔

(اصغری امجد کے سامنے آجاتی ہے)

امجد - جاؤ، مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری - (ہچکچا کر) امجد میاں —— مجھ میں وہ جوان خوبصورتی نہیں ہے۔ جس کی رعنائیاں دُنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر سکیں —— میری جوانی تو کھردرے ٹاٹ کی شرمندۂ احسان ہونا چاہتی ہے۔

امجد۔ مسہری میں لیٹ جاؤ اصغری۔

اصغری۔ (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں ——— مسہری کو تکلیف ہوگی ——— یہ دولھن بیگم کے نرم و نازک بدن کی عادی ہے۔

امجد۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔

اصغری۔ (سر جھکا کر) آپ مالک ہیں (مسہری میں لیٹ جاتی ہے ——— آنکھیں چھت میں گڑ جاتی ہیں)۔

امجد۔ جانتی ہو آج کون سی رات ہے؟ .... وہ رات ہے۔ جب ایک تڑپتی مچلتی جوانی امنڈ یا وہ تڑپ تڑپ کر سالمیت اختیار کرنے والی ہے ——— یہ قیامت کی رات ہے! فنا کی رات ——— اس کے اندھیاروں میں وجود، عدم کی جھلیوں میں چھن کر ایک غیر فانی قالب اختیار کرے گا ...... یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی، اس کی اندھی آنکھوں میں ایسے کاجل سے تحریریں ہوں گی جو انہیں ہمیشہ کے لئے روشن کر دیں گی ——— یہ وہ رات ہے، جب موت کے بچھڑے ہوئے تھنوں سے زندگی کے آخری قطرے ٹپک کر خود بخود ہی باہر آ جائیں گے ——— یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی کوکھ سے سربلند ایوانوں کو جنم دے گی ——— ایسے سربلند ایوان جن کے کنگروں کو عرش کی بلند ترین اونچائیوں سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ یہ وہ رات ہے، جب زمزم کا سارا پانی رینگ رینگ کر زمین کی تہوں میں چھپ جائے گا۔ اس کے بدلے خاک اڑے گی۔ جس سے پاکیزہ روحیں تیمم کریں گی ——— یہ وہ رات ہے۔ جب کاتب تقدیر اپنا قلمدان اوندھا کر کے عرش کے کسی کونے میں منہ دے کر روئے گا...... یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دنیا کی تمام خوبصورتیوں کو تین دفعہ طلاق دے دیتا ہے اور ایک بدصورتی کو اپنے رشتہ مناکحت میں لاتا ہے...... (ایک دم چیختا ہے) اصغری ——— اصغری!

(اس دوران میں اصغری مسہری پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول چکی ہے
اور اس کی سل پر کھڑی ہو کر نیچے گہرائیوں میں دیکھ رہی ہے)

امجد۔ (چیخ کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغری؟

اصغری۔ (کھڑکی کی سل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے) ایجاب و قبول ضروری ہے میرے مالک!

(نیچے کود جاتی ہے)

امجد۔ (دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر) اصغری! .... (ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھلی کھڑکی کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا ہے جو سبز دیوار میں تاریک زخم کے مانند منہ کھولے ہے) ایجاب و قبول! ..... (بڑبڑاتا ہے) ایجاب و قبول واقعی ضروری ہے (زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کرسی آگے کو کھینچتا ہے ——— بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے) ...... مجھے مشکل کو آسان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا..... مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت تھی......

(کھڑکی کی سل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپاہج جسم
بڑی دقتوں سے اوپر اٹھاتا ہے اور دوسری طرف لٹکنا شروع کر دیتا ہے)

امجد۔ میری پہاڑیاں ——— میری پیاری پہاڑیاں ——— میری پیاری اصغری!

(اگلا دھڑ نیچے پھسلتا ہے اور ایک دم اس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے)

(پردہ)

نیا قانون

("منٹو کے افسانے" میں سے)

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اُس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی۔ تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا گاما چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اُس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُستاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وُہ اڈے میں آیا تو اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہُوا تھا۔ حقّے کا دَور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اُتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:-

"یہ کسی پیر کی بد دُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دُکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بد دُعا دی تھی، جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ـــــ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر

یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بد دعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اُس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اُن کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُن کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اُس "گورے" کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"۔۔۔۔۔۔" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم اُن کے باوا کے نوکر ہیں۔۔۔۔"

اس پر بھی اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اُس کا کوئی ساتھی اُس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو تم اُس کی۔۔۔۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے ——— بالکل مُردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی۔ کہ ملعون کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"۔۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز اُستاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور اُن کی گفتگو سے اُسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سُنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ——— کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے

بڑی صفائی کے ساتھ اُدھیڑ کر گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا۔ چل بیٹا ۔۔۔ ذرا ہوا سے باتیں کرکے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اُسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہوگیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ۔۔۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کرکے غور و فکر کر رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اُس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اُس نے اُن مارواڑیوں کو گالی دی" ۔۔۔ غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ۔۔۔ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اُس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ۔۔۔ سفید چوہوں (وہ اُن کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا: "لا ہاتھ ادھر ۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ۔۔۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے ۔۔۔ مزے لے لیکر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرکے رہے گا۔"

اُستاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اُسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اُس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ "انہیں" روس والے بادشاہ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ اُستاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:۔

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

اُن بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے اُستاد منگو صرف اُوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اُس نے خیال کیا۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اُس نے کئی مرتبہ اُن دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے"!

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اُس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعہ کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اُس نے اُن تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا۔

"نئے آئین نے میری اُمیدیں بڑھا دی ہیں اگر.......صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی"!

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے"۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں"!

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن میں کچھ تو کمی ہو گی"۔

اس گفتگو نے اُستاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون"!... وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ یعنی کوئی نئی چیز! اور ہر بار اُس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اُس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اُس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اُس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ اُن سے اُس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخرکار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے اُستاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اُسے ہر چیز پُرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پُرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پہ جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اُس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی! ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن اُستاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اُسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا: "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اُس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر اُستاد منگو کو نہ جانے اُن کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کُن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر اُستاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اُس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔ اُس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اُس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یُوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے بچہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دئی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی: "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اُسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ اُن کے جلوس کے ہنگاموں اور اُن کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اُس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اُسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اُس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا:۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ——— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر اُستاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو اُنگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ——— جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے

یہ فقرہ کہا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا: "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:-

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدہم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگرٹ سلگا رہا تھا۔ مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا: "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے"۔ اس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی

سرخ تھی۔ اُسے طوطا کہہ تو بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اُس کے پُرزے اُڑا دیئے ہوتے۔ وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا: "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا: "ہیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا۔" اُستاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلّایا: "پانچ روپے۔ کیا تم ——— ؟"

"ہاں، ہاں، پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا: "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اُس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر اُستاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اُس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے اُستاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ——— اب ہمارا راج ہے بچہ!"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ اُستاد منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے ——— اب نیا قانون ہے میاں ——— نیا قانون!"

اور بیچارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کے مانند کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلّاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پُرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

شہید ساز

(’نمرود کی خدائی‘ میں سے)

میں گجرات کاٹھیاواڑ کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان کا ٹنٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا۔ معاف کیجیے گا میں نے لفظ ٹنٹا استعمال کیا۔ مگر اس کا کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں۔ چاہے وہ گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں، میں بالکل بیکار تھا۔ لیکن کوکین کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا۔ جس سے کچھ آمدن کی صورت ہو ہی جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور ادھر کے آدمی ادھر اور ادھر کے ادھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلو پاکستان چلیں۔ کوکین کا نہ سہی کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کاروبار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا اور الاٹمنٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کرا لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندا کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ کسی کے مسکہ لگایا۔ کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت دی۔ کسی کو ناچ رنگ کی۔ غرضیکہ بے شمار بکھیڑے تھے۔ دن بھر خاک چھانتا، بڑی بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شہر کا چپہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاش کرتا جس کے الاٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔

انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لئے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی — معاف کیجیے گا۔ میں کاٹھیاواڑ گجرات کا روزمرہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی واندہ نہیں۔ اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں — جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چاکر، پیکارڈ موٹر، بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ — یہ سب کچھ تھا۔ لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اڑ گیا۔ یوں تو کوکین کا دھندا کرتے ہوئے

میں دل پر کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہئیے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟

آدمی ذہین ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے (حالانکہ دل کا کچھ پتا ہی نہیں تھا) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑ بڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے؟

عورت؟ ... ہو سکتی ہے۔ میری ایک تو کوئی تھی نہیں۔ جو تھی وہ کاٹھیاواڑ گجرات ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ لیکن دوسروں کی عورتیں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اپنے مالی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ سچ پوچھئیے تو عورت جوان ہونی چاہیئے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی لکھی ہو، ڈانس کرنا جانتی ہو۔ اپن کو تو ساری جوان عورتیں چلتی ہیں (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اُردو میں نعم البدل موجود نہیں)

عورت کا تو سوال ہی اُٹھ گیا اور دولت کا بیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بندہ زیادہ لالچی نہیں جو کچھ ہے اسی پر قناعت ہے۔ لیکن پھر یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔

آدمی ذہین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آ جائے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل رہے تھے۔ دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے ایک تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دل کی گڑ بڑ صرف اس لئے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاٹھیاواڑ گجرات میں تو میں نے بیسیوں نیک کام کئے تھے۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈورنگ مر گیا تو میں نے اس کی رانڈ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دو برس تک اس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا۔ وناٹک کی لکڑی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پہ اُٹھ گئے تھے۔ جمنا بائی کو گرمی ہو گئی سالی کو (معاف کیجئے گا) کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کراتا رہا ... لیکن پاکستان آ کر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑ بڑ کی یہی وجہ تھی۔ ورنہ اور سب ٹھیک تھا۔

میں نے سوچا۔ کیا کروں؟ ـــــ خیرات دینے کا خیال آیا۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی بھوکا ہے کوئی ننگا۔ کس کس کا پیٹ بھروں، کس کس کا انگ ڈھانکوں؟ ـــــ سوچا ایک لنگر خانہ کھول دوں۔ لیکن ایک لنگر خانے سے کیا ہوتا اور پھر اناج کہاں سے لاتا؟ بلیک مارکٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کارِ ثواب کا مطلب ہی کیا ہے؟

گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دُکھ درد سُنے۔ سچ پوچھئے تو ہر شخص دُکھی تھا۔ وہ بھی جو دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اُونچی اُونچی حویلیوں میں رہتے ہیں۔ پیدل چلنے والے کو یہ دُکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جوتا نہیں۔ موٹر میں بیٹھنے والے کو یہ دُکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی۔

میں نے غالب کی ایک غزل اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتلے کر سے سُنی تھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ـــ

کس کی حاجت روا کرے کوئی

معاف کیجئے گا یہ اس کا دوسرا مصرع ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو۔

جی ہاں، میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو ہی حاجتمند تھے۔ میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن میں نے مہاجرین کے کیمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ جُگا ہو رہی ہے (معاف کیجئے گا جُگا کا مطلب

ہے جو (مثنی قمار بازی) لگا لیاں بک رہے ہیں اور نوگٹ میں مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں ۔ چنانچہ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ بھیک دینا ہرگز ہرگز نیکی کا کام نہیں ۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لئے اور کون سا رستہ ہے ؟

کیمپوں میں دھڑا دھڑ آدمی مر رہے تھے ۔ کبھی ہیضہ پھوٹتا تھا کبھی پلیگ ۔ ہسپتالوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی ۔ مجھے بہت ترس آیا ۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بنوا دوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا ۔ پوری اسکیم تیار کر چکا تھا ۔ عمارت کے لئے ٹنڈر طلب کرنا ۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا ۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اس کے نام نکال دیتا ۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا ۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی ۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ جو زائد آبادی ہے وہ کیسے کم ہو گی ۔

غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے ۔ لفڑا کا مطلب ہے جھگڑا ، وہ جھگڑا جس میں فضیحتا بھی ہو ۔ لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا ۔

جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی اس فالتو آبادی کا باعث ہے ۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی ۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا ۔ بارشیں زیادہ ہوں گی ، اناج زیادہ اُگے گا ۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ـــــ کہ ہسپتال بنانا ہرگز ہرگز نیک کام نہیں ۔

پھر سوچا مسجد بنوا دوں ۔ لیکن اللہ بخشے شولا پور کی اینہ بائی چنبلے کر کا گایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا

منظور کو منجور اور فیض کو فیج کہا کرتی تھی ۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا ۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا ۔

کس کم بخت کو نام و نمود کی خواہش ہے ۔ وہ جو نام اچھالنے کے لئے پل بناتے ہیں نیکی کا کیا کام کرتے ہیں ؟ خاک ! ۔ میں نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے ۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کہ عوام بٹ جاتے ہیں ۔

تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا ۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا ۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بدنظمی پھیل گئی ۔ اتنی بھگدڑ مچی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے ۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے ۔

میں نے سوچنا شروع کیا ۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا ۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں ۔ انہیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں ۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کی بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے ۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل اکارت جاتی ہے ۔ اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات تھی ۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا ۔

چاروں طرف جدھر دیکھو خستہ حال انسان تھے ۔ چہرے زرد ، فکر و تردد اور غم روزگار کے بوجھ تلے پسے ہوئے ۔ دھنسی ہوئی آنکھیں بے جان چال ۔ کپڑے تار تار ۔ ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں ۔ یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں کیوں جی رہے ہیں ۔ کس کے لئے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں ۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں ۔ کوئی وبا پھیلی ۔ ہزاروں مر گئے اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل کر مرے ۔ سردیوں میں اکڑ گئے ۔ گرمیوں میں سوکھ گئے ۔ کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہا دیئے ۔ اکثریت کی موت خشک ہی رہی ۔

زندگی سمجھ میں نہ آئی، ٹھیک ہے۔ اس سے حظ نہ اٹھایا، یہ بھی ٹھیک ہے۔ ۔ ۔ ۔ وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتلے کر کیا درد بھری آواز میں گایا کرتی تھی ؎

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سدھری تو لعنت ہے سسری پر۔

میں نے سوچا کیوں نہ یہ بیچارے، یہ قسمت کے مارے، درو کے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دنیا میں ہر اچھی چیز کے لئے ترستے ہیں۔ اس دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طرف نگاہ اٹھانا پسند نہیں کرتے وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عام موت نہ مریں بلکہ شہید ہوں۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لئے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا، کیوں نہیں۔ وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی تو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی یہ رتبہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت ناامیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل سے آدمی سے پوچھا: "کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟" تو اس نے جواب دیا: "نہیں"۔

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو بڑے میاں زیادہ سے زیادہ، زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے۔ چلنے کی تم میں سکت نہیں۔ کھانستے کھانستے غوطے میں چلے جاتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا۔ پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں۔ زندگی بھر تم نے سکھ نہیں دیکھا، مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اور جی کر کیا کرو گے۔ فوج میں تم بھرتی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے محاذ پر اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کرکے یہیں بازار میں یا ڈیرے میں جہاں تم رات کو سوتے ہو، اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔ اس نے پوچھا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "یہ سامنے کیلے کا چھلکا پڑا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔" پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہنے لگا: "میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا ـــ کیا مجھے اپنی جان عزیز نہیں"ـــ اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ جھریوں کی گٹھڑی!!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے سنا کہ وہ کمبخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا، خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چارپائی پر کھانستا کھنکارتا مر گیا۔

ایک بڑھیا تھی منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفلسی اور رنج و غم میں گزری تھی۔ میں اسے اٹھا کر ریل کے پاٹے پر لے گیا۔ معاف کیجئے گا۔ ہمارے یہاں پٹڑی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جونہی اس نے ٹرین کی آواز سنی ہوش میں آ گئی اور کوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھ کر بھاگ گئی۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا تھا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سو اکاون چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگا لیا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیئے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں اور سات سو آدمی جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے۔ شہید

ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پہ بوجھ بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انھیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا ——— ادھر کا پلڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسبِ توفیق دو تین آدمیوں کو جامِ شہادت پلا دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتیلے کر ایک شعر گایا کرتی تھی۔ لیکن معاف کیجئے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پہ ایک آدمی کو جس کا وجود جھگڑے کے پانچویں پہیئے کی طرح بے معنی اور بیکار تھا۔ جامِ شہادت پلانے کے لئے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھر پر فرش پہ کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہوا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمہ بھی کرا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑا اڑا دھڑام گر پڑے گی کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے۔ جس کی شہادت اللہ تبارک تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔

بڑا نامور افسانہ نگار تھا

۴۷۳۱ء

مختصر حالات

پیدائش	۱۱ مئی ۱۹۱۲ء
مقام پیدائش	سمبرالہ ضلع لدھیانہ
اولاد	نگہت، نزہت اور نصرت
تعلیم	امرتسر اور علی گڑھ میں
قیام	امرتسر، علی گڑھ، لاہور، دلی اور بمبئی
انتقال	۸ جنوری ۱۹۵۵ء بمقام لاہور میانی صاحب

○

پہلی کہانی	تماشہ
آخری کہانی	کبوتر اور کبوتری

○

جن کہانیوں پر مقدمے چلے

کالی شلوار	دھواں
بو	کھول دو
ٹھنڈا گوشت	اوپر نیچے اور درمیان

○

افسانوں کا پہلا مجموعہ 'منٹو کے افسانے' ہے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا

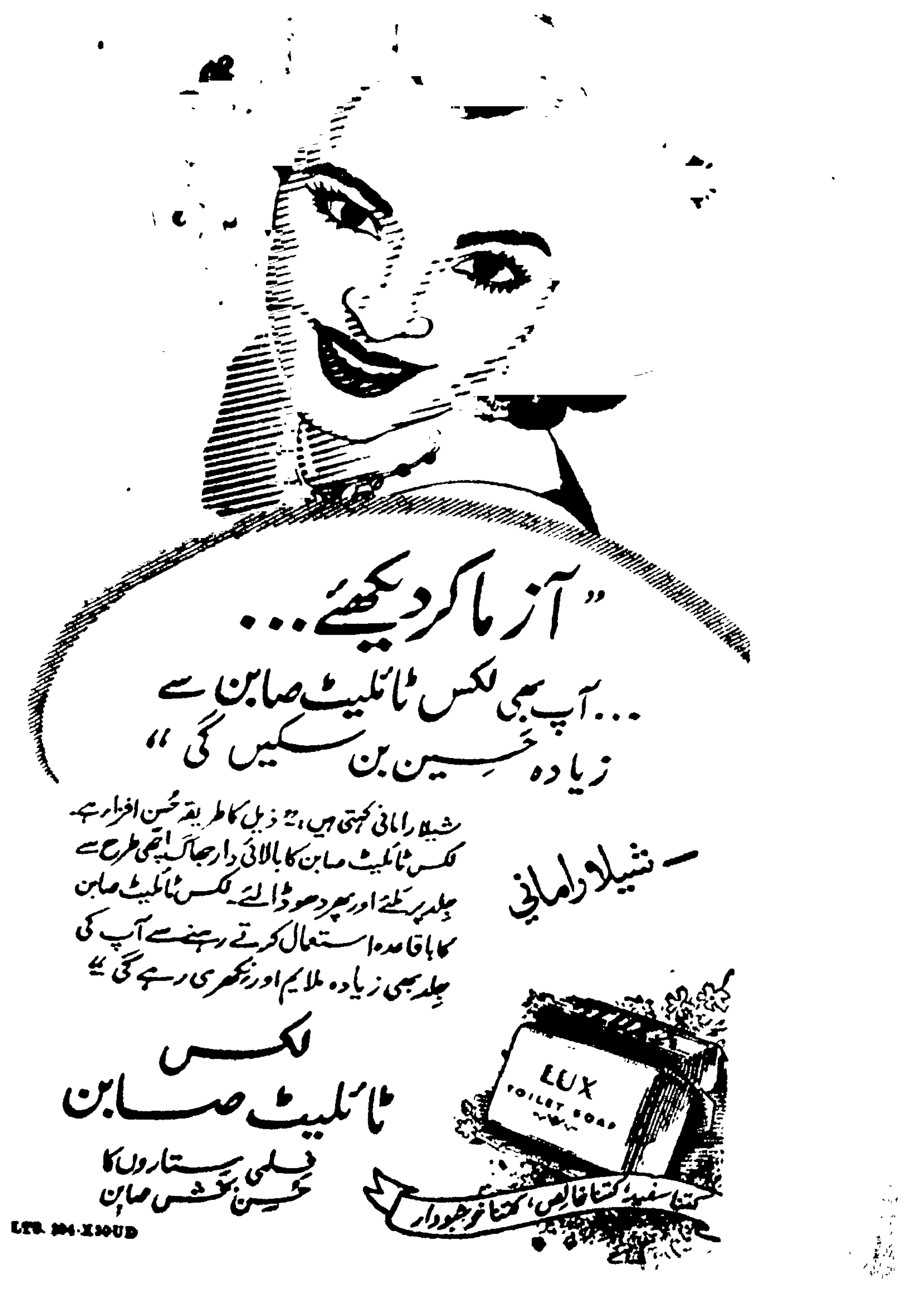
تصانیف

منٹو کے افسانے	منٹو کے ڈرامے
افسانے اور ڈرامے	دھواں
چغد	لذتِ سنگ
یزید	ٹھنڈا گوشت
نمرود کی خدائی	سیاہ حاشیے
خالی بوتلیں، خالی ڈبے	تلخ ترش شیریں
سڑک کے کنارے	گنجے فرشتے
بادشاہت کا خاتمہ	اوپر نیچے اور درمیان
سرکنڈوں کے پیچھے	پھندنے
برقعے	شکاری عورتیں
منٹو کے مضامین	آؤ
جنازے	تین عورتیں
کروٹ	عصمت چغتائی
نورجہاں سرورِ جان	سرگذشتِ اسیر (ترجمہ)
ویرا (ترجمہ)	گورکی کے افسانے (ترجمہ)

○

ان کے علاوہ منٹو کی سات آٹھ کتابیں زیرِ طبع ہیں


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
آپ کے لئے بھی رکسونا کا کیڈل
رکسونا کے کیڈل سے مالا مال
جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملئے
اور پھر دھو ڈالئے۔ پھر دیکھئے آپ کی جلد
دن بدن نرم اور ملائم ہوتی جائے گی جس سے
آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
رکسونا
* کیڈل آمیز واحد صابن
* جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے۔
Rexona
Rexona
BLENDED WITH CADYL


"آزما کر دیکھئے...
...آپ بھی لکس ٹائلیٹ صابن سے
زیادہ حسین بن سکیں گی"
— شیلا رامانی
شیلا رامانی کہتی ہیں، "یہ ذیل کا طریقہ حسن افزا ہے۔
لکس ٹائلیٹ صابن کا بالائی دار جھاگ اچھی طرح سے
جلد پر ملئے اور پھر دھو ڈالئے۔ لکس ٹائلیٹ صابن
کا باقاعدہ استعمال کرتے رہنے سے آپ کی
جلد بھی زیادہ ملایم اور نکھری رہے گی"
لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسین نقش صابن
LUX
TOILET SOAP
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار
LTS. 304-X30UD

(۳)

منٹو کے فن اور شخصیّت پر مضامین

(جن میں منٹو بھی ہے اور سعادت حسن بھی)

فن پر لکھنے والے

ممتاز شیریں
وقار عظیم
محمد حسن عسکری
عابد علی عابد
ابو اللیث صدیقی
عبادت بریلوی
ممتاز حسین

شخصیت پر لکھنے والے

عصمت چغتائی
اوپندر ناتھ اشک
احمد ندیم قاسمی
ہاجرہ مسرور
ابو سعید قریشی
حامد جلال
غلام عباس
محمد طفیل

منٹو کی فنی تکمیل

ممتاز شیریں

منٹو کے آخری دَور کی دو تحریریں، میری نظر میں، منٹو کی ادبی تکمیل کی مظہر ہیں۔ ڈرامہ "اس منجدھار میں" اور افسانہ "سڑک کے کنارے"۔

"بابو گوپی ناتھ" ایک بڑا اہم موڑ تھا جس سے منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس میں منٹو نے خلافِ معمول بڑا بھرپور، پیچیدہ اور مکمل کردار پیش کیا تھا اور اس کردار کو پیش کرتے ہوئے منٹو کا رویہ بھی ایک سچے فن کار کا رویہ تھا۔ ایک مکمل کردار کے ساتھ اس افسانے میں ایک مکمل اور بھرپور تجربہ بھی تھا۔ جیسا کہ عسکری صاحب نے کہا ہے منٹو عموماً چھوٹے چھوٹے انفرادی تجربوں کو فوراً رقم کرکے افسانہ کی گرفت میں لے آتا تھا اس سے پہلے کہ یہ چھوٹے چھوٹے تجربے آپس میں مل کر اور وقت گزرنے پر فن کار کے ذہن میں ڈھل کر ایک مکمل اور بڑے تجربے کی تشکیل پائیں۔ البتہ "بابو گوپی ناتھ" میں ایک بڑے تجربے اور اس تکمیل کا احساس پایا جاتا تھا۔

منٹو کے فن کے اس تدریجی ارتقا کی تکمیل آخری دَور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ جن میں ایک تکمیل، ایک وسعت، ایک کائناتی گہرائی کا احساس ہے۔ زندگی اور وجود کا ایک فلسفہ ہے۔ سماج اور زندگی کی حقیقتوں کو بڑی بے رحم صداقت اور بے باکی سے بیان کرنے میں منٹو کے قلم کی قوت منفی اور تخریبی تھی۔ بعد میں منٹو میں اثباتی اقدار تو پیدا ہو ہی چلے تھے۔ لیکن آخر میں منٹو اس درجہ تک پہنچ چکا تھا جس میں کہ ایک فن کار میں زندگی اور وجود کا ایک مثبت فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی "اس منجدھار میں" کی گہرائیوں کو سمجھ سکے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر NEGATIVE ELEMENTS کو جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طرف جاتے ہوئے دکھایا ہے۔ اور اُن اثباتی عناصر POSITIVE ELEMENTS کو آپس میں ملایا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔

یوں تو پہلی نظر میں "اس منجدھار میں" کا موضوع وہی نظر آتا ہے جو ڈی۔ایچ۔ لارنس کے LADY CHALLERLEY'S LOVER کا ہے۔ کردار بھی تقریباً وہی ہیں، ایک شوہر جو شادی کے فوراً بعد مفلوج ہو جاتا ہے، اس کی حسین، جوان صحت مند بیوی، ایک نوجوان صحت مند مرد جو اس کی بیوی کو زندگی کی قوت دے سکتا ہو۔ اور ایک خادمہ جو اس مفلوج شوہر سے ہمدردی اور لگاؤ رکھتی ہے۔ لیکن لارنس کی اس موضوع پر پیش کش سے

منٹو کی پیش کش کبھی اچھی اور فنکارانہ ہے، اس سے قطع نظر کہ ایک ناول ہے، دوسرا ڈرامہ۔ اس میں ایک فلسفہ ہے، لارنس سے مختلف، حالانکہ لارنس کا بھی ایک فلسفہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لارنس نے جنس ہی کا ایک فلسفہ بنا لیا تھا۔

منٹو کی اس تحریر میں ("اس منجدھار میں") ایک جمالیاتی (AESTHETIC) احساس ہے اور ایک جمالیاتی رویہ (AESTHETIC APPROACH) یوں تو زندگی کی قوت کو منٹو نے بھی لارنس کے معنی میں لیا ہے، یعنی جنس، لیکن یہاں منٹو نے حسن کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور ان دوسرے اثباتی عناصر کو بھی جو حسن اور زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔

حسن ایک اثباتی عنصر ہے، حسن، جوانی، صحت، لطیف جذبات، محبت کی قوت یہ سب اثباتی عناصر ہیں جو بیوی میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور کم و بیش اس کے شوہر کے چھوٹے بھائی میں بھی موجود ہیں۔ لیکن شوہر، جب وہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس طرح مفلوج ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کی قوت مفقود ہو جاتی ہے، ایک منفی عنصر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ منٹو کے ہاں اس مفلوج شوہر کو پیش کرتے ہوئے وہ ہلکی سی تحقیر نہیں پائی جاتی جو لارنس کے لہجہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف منٹو کو اس کردار سے پوری ہمدردی ہے، بلکہ منٹو نے اس بے پناہ ذہنی کرب و اذیت اور کشمکش کو ڈرامہ کا اہم حصہ بنایا ہے۔ اس میں یہ محسوس کرنے کی صلاحیت ہے کہ آخر اس کی حسین اور نوجوان بیوی کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ اس کے بھائی کی طرف متوجہ ہو جس سے اسے صحیح معنوں میں مثبت قوت مل سکتی ہے، اور ان دونوں کی آپس میں بے اختیار کشش ایک فطری امر ہے۔ وہ خود تو اپنے مفلوج جسم، نفسیاتی کمزوری اور احساس کمتری کے ساتھ ایک منفی عنصر بن چکا ہے، جس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے، محبت نہیں۔ محبت اسے اپنی خادمہ سے ملتی ہے جو خود محبت کے قابل نہیں جو بدصورت ہے، اور بدصورتی بجائے خود ایک منفی عنصر ہے۔ یہ دونوں منفی عناصر (یعنی مفلوج شوہر اور خادمہ) ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں، لیکن ان کی قربت اور آپس میں ملاپ کوئی اثباتی قوت پیدا نہیں کر سکتے، لہٰذا وہ زندگی کی بجائے موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، ایک ساتھ خودکشی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ منفی عناصر فنا کی طرف جاتے ہیں۔

دوسری طرف مثبت عناصر بے اختیار ایک دوسرے کی طرف کھنچ جاتے ہیں، آزاد، کھلی فضاؤں میں، قدرت کے رنگین نظاروں میں ان کی محبت پروان چڑھتی ہے اور جب مثبت عناصر آپس میں ملتے ہیں تو زندگی پر بہار آ جاتی ہے۔

منٹو، یوں تو ایک فطری فن کار ہے لیکن اپنی چند ایک تحریروں میں چنانچہ "بو"، "ٹھنڈا گوشت" (منٹو نے خود "ٹھنڈا گوشت" پر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے) "سڑک کے کنارے" اور "اس منجدھار میں" وغیرہ میں وہ بڑا ہی شعوری فن کار (CONSCIOUS ARTIST) نظر آتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو منٹو کے آخری دور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے اور منٹو کی ادبی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ وژن کی وسعت ہے۔ ان دونوں تحریروں میں ایک کائناتی وژن (COSMIC VISION) ہے۔ یہاں منٹو کے وژن میں وہ وسعت پیدا ہو چکی ہے جو انفرادی اور خصوصی (PARTICULAR) کو آفاقی اور کائناتی (UNIVERSAL AND COSMIC) میں تحلیل کر دے۔

ایک خاص واقعہ، ایک خاص تجربہ، ایک خاص، انوکھا، انفرادی کردار پیش کرنا منٹو کی ایک خصوصیت تھی۔ "سڑک کے کنارے" میں بھی ایک خاص واقعہ ہی ہے لیکن یہاں خصوصیت، آفاقیت میں حلول ہو گئی ہے۔ افسانے کے سارے جزئیات میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مرد کی نیلی آنکھیں۔ لیکن ان نیلی آنکھوں سے آسمان کی نیلاہٹ کی تشبیہہ (آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا) اس خصوصیت میں بھی وہی وسیع کائناتی وژن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

یہاں ہم زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی تخصیص بھی بھول جاتے ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی خاص عورت اور خاص مرد سے وابستہ تھا، وہاں ازلی عورت اور ازلی مرد ہے، ان کا ملاپ، وجود کی تکمیل، وہ ازلی بنیادی گناہ، اور اس بنیادی گناہ کا کفارہ جو صرف عورت ادا کرتی ہے۔

" دو بدنوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا، اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا، دو روحوں کا سمٹ کر اس نقطے پر پہنچنا جہاں سے نئے جہاں کی کائنات بنتا ہے "

یہاں منٹو کا جنس کا تصور بھی کتنا مختلف اور کتنا بلند ہے۔ گو منٹو کا نظریہ جنس کے متعلق ہمیشہ صحت مند رہا ہے اور وہ اسے ایک ازلی فطری صحت مند جذبہ سمجھتا رہا ہے۔ لیکن پہلے منٹو کے ہاں جنس کا تصور محض جسمانی تھا۔ لیکن یہاں منٹو کا یہ تصور اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے 'وجود کی تکمیل' اور 'روحوں کے ملاپ' سے تعبیر کیا ہے۔

'وجود کی تکمیل' اور 'روحوں کے ملاپ'، کے اس تصور کے ساتھ ہی یہاں بنیادی گناہ کا تصور بھی شامل ہے اور "مرک کے کنارے" میں بنیادی گناہ کا تصور اتنا گہرا ہے جتنا کہ ہمیں ہاتھورن کے ہاں ملتا ہے۔

اس گناہ کا نشان عورت کے سینے پر داغ دیا گیا ہے۔ اور عورت اپنے سینے پر اس دہکتے ہوئے انگارہ کو دیکھ کر اپنے آپ سے یہ پوچھتی ہے "کیا یہ واقعی گناہ تھا؟ اور کیا یہ صرف میرا گناہ تھا؟

" میں نے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی، اس کے وجود کی تکمیل کی تھی، اور اس کے وجود کے ذرّوں سے اپنی ہستی کی تعمیر و تکمیل کی تھی . . .

یہ اس کی شخصیت کی تکمیل تھی کہ وہ ماں بن رہی تھی، ایک موتی اس کی کوکھ کی سیپ میں تشکیل پا رہا تھا۔ ماتا کی گرمی اس کی ساری رگوں میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی دودھ بھری چھاتیوں کی گولائیوں میں مسجد کے اجلے پاکیزہ میناروں کی سی تقدیس آ رہی تھی۔ وہ ماں بن رہی تھی، اس کی تکمیل تو آج ہوئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اس کی تکمیل ہو گئی تھی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا . . . . .

" اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی کیوں گھایل چھوڑ دی جاتی ہے"؟

عورت یوں محسوس کرتی ہے جیسے وہ ہاتھورن کی ہیسٹر کی طرح ایک چوراہے پر کھڑی ہے "یہ دنیا ایک چوراہا ہے، یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی" اور جب اس کی کوکھ کا موتی سیپ سے باہر نکلے گا تو گناہ کی زندہ علامت بن جائے گا۔ ہاتھورن کے SCARLET LETTER میں بھی موتی گناہ کی زندہ علامت ہے۔ موتی (PEARL) ہیسٹر کی ناجائز بچی کا نام ہے اور اس نام میں بھی گویا ایک رمزی معنویت SYMBOLIC-SIGNIFICANCE ہے۔

" انگلیاں اٹھیں گی سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی . . . یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی . . . . .

اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی، زندگی موت سے بدتر ہو گی، اس کی بھی اور بچی کی بھی! اس سے بہتر ہے کہ اس ننھی زندگی کو آغاز ہی میں ختم کر دیا جائے۔

اور جب ایک 'ماں' اپنے سارے جذبات اور احساسات کو کچل کر، اپنی ماتا کا آپ گلا گھونٹ کر جب اس زندگی کو ختم کرنے لگتی ہے، جو اس کی اپنی زندگی کا ایک حصہ تھی، اس کے اپنے خون سے بنی تھی، اس کی کوکھ میں تشکیل پائی تھی، وہ ماں کس بے پناہ ذہنی و روحانی کرب سے گزرتی ہو گی؟ اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے!

اور اخبار میں چھپی ہوئی وہ چند سطریں، چند سرد منجمد سطریں اس المیہ کو کہاں پا سکتی ہیں؟ لیکن فن کار منٹو اخبار کی ان چند سطروں میں وہ گہرا المیہ تلاش کر لیتا ہے، جو عورت اور ماں کا المیہ ہے۔

اس المیہ کو اپنی ساری گہرائیوں اور ساری PIOGNANCY کے ساتھ پیش کر چکنے کے بعد جب منٹو اچانک اپنا افسانہ اس اخباری رپورٹ

پر ختم کرتا ہے تو ہم گویا ایک دھچکے کے ساتھ بہت بلندیوں پر سے سطح زمین پر آگرتے ہیں یا وسیع گہرائیوں سے اچانک باہر نکل آتے ہیں، زمینی سطح پر۔

اور کائناتی وسعت اور گیرائی سمٹ کر ایک خصوصی نقطہ پر آجاتی ہے۔

افسانہ کے اختتام پر یہ اخباری رپورٹ، پہلی نظر میں، کچھ غیر ضروری معلوم ہوتی ہے، اور غیر فن کارانہ بھی، جس سے افسانے کے ٹیمپو، ٹون اور کیفیت کو ایک دھچکا سا لگتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اختتام ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اور اس اختتام میں بھی جو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، منٹو نے ایک معنویت ایک خاص SIGNIFICANCE پیدا کی ہے۔

اس افسانے میں جو سارا ذہنی کیفیات سے مرتب ہے، واقعاتی طور پر یہ بتانا کہ عورت آخر میں بچی کو مارنے کی کوشش کرتی ہے بالکل مناسب اور موزوں نہ تھا، منٹو نے اس بات کا انکشاف اخباری رپورٹ کے ذریعہ کر دیا ہے، یہ زیادہ بہتر صورت ہے۔ علاوہ بریں اس رپورٹ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچی زندہ رہ جاتی ہے۔ اور اس دوسرے انکشاف پر کئی اور سوال ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ یہ بچی زندہ رہ کر سماج کے ہاتھوں کیا کیا دکھ اٹھائے گی، وہ عورت بن کر شاید وہی گناہ کرے گی، (یا گناہ پر مجبور کی جائے گی) جو اس کی ماں نے کیا تھا، شاید وہ بھی ماں بنے گی اور اپنے مرتی اپنے گناہ کے پھل کو اپنے ہاتھوں۔

کیا یہ داستان پھر دہرائی جائے گی؟ اور کہانی ایک دائرہ میں گھوم کر اسی نقطہ پر آجائے گی؟ بچی کا زندہ رہنا بھی گویا IRONY OF FATE ہے۔

اور پھر اس اختتام سے ایک تضاد کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ آفاقیت (UNIVERSAL) اور انفرادیت PARTICULAR کا تضاد، ——

ازلی مرد اور ازلی عورت، دو روحوں کا ملاپ، وجود کی تکمیل، پہلا بنیادی گناہ اور اس گناہ کا کفارہ . . . . اور پھر اختتام پر اچانک یہ احساس کہ یہ محض ایک عام واقعہ تھا، ان بیسیوں وارداتوں میں سے ایک جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ کائناتی وسعت اور گیرائی سمٹ کر ایک خصوصی نقطہ پر آجاتی ہے۔

اور حقیقت کے دو پہلوؤں حقیقت کی دو سطحوں کا تضاد! . . .

ایک خارجی، واقعاتی، سطحی حقیقت جو اخبار کی چند سطروں میں سمو دی گئی ہے . . . . "ایک نوزائیدہ بچی سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پائی گئی، کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو کپڑے میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے"

اور سنگدل کے لفظ پر ہم چونکتے ہیں۔

سنگدل کون تھا؟

وہ ماں جس نے اپنی رگوں میں سرایت کرتی ہوئی ممتا کا خون کر کے بچی کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا؟

یا وہ مرد (بچی کا باپ) جو عورت سے سب کچھ حاصل کرنے کے بعد اسے دھوکا دے کر اور اس نازک حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟

یا وہ سماج جس کے خوف نے عورت کو یہ غیر فطری حرکت کرنے پر مجبور کیا تھا، وہ سماج جو عورت کے سب سے اہم وجود 'ماں' کا بھی گلا گھونٹ دیتی ہے؟

ایک خارجی، واقعاتی حقیقت جو صرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عورت نے گناہ کیا تھا اور اپنی نوزائیدہ بچی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔

اور دوسری گہری باطنی حقیقت جو سارے افسانے میں عورت کی ذہنی کیفیات اور محسوسات کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔ عورت کی مضطرب ذہنی کیفیتوں جذباتی ہلچل (DISTURBED EMOTIONS) کے ذریعہ، جب وہ ماں بن رہی ہوتی ہے۔

یکے بعد دیگرے وہ ساری کیفیات ـــــ جب عورت نے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح مرد کے حوالے کر دی تھی، اور محسوس کیا تھا کہ دو روحیں سمٹ کر ایک ہو گئی ہیں، اس نے مرد کے وجود کی تکمیل کی ہے، اور اس کی اپنی تکمیل اب ہوئی ہے جب وہ ماں بننے والی ہے۔

عورت کے ماں بننے کی کیفیت جب وہ ایک بلند و برتر اور مقدس ہستی بن جاتی ہے۔ جب ممتا کا گرم گرم خون اس کی رگوں میں بہتا ہے اور اس کے سینے کی دودھ بھری گولائیوں میں مسجد کے پاکیزہ میناروں کی تقدیس اور طہارت آجاتی ہے

پھر وہ اذیت ناک احساس ـــــ نہیں یہ تقدیس اور طہارت کچھ بھی نہیں ... وہ تو دنیا کی نگاہوں کے سامنے ایک چور ہے پکڑا گیا ہے۔ اس کے سینے پہ گناہ کی علامت ایک سرخ نشان دہک رہا ہے، انگلیاں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں، یہ سب لوگ اسے سنگسار کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں مگر اس پر پتھر اٹھانے کا ان میں سے کوئی بھی مجاز نہیں۔

اور پھر وہ ہلچل، وہ جذباتی طوفان، وہ کرب و اضطراب، وہ کشمکش، اذیت وہ کشمکش، اور مجبوری اور بے بسی کی وہ آخری چیخ! "مت چھینو، اسے مت چھینو، میری روح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو!"

خارجی حقیقت کا پردہ چاک کر کے جب منٹو ہمیں یہ باطنی حقیقت دکھاتا ہے تو وہاں صرف ایک روح نظر آتی ہے۔ ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی روح!

منٹو کا فن

وقار عظیم

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دوربین و دوررس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مطعون کیا گیا ہے اور اس داد و تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی، اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے، منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولین بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے بس حسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو نہ "محض" اچھا ہے اور نہ "محض" برا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دوررس اور دوربیں نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں ——— کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت برے۔

ان اچھے، برے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت برے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بیشمار موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے ——— کلرک، مزدور، طوائف، رندِ خرابات اور زاہدِ پاک باز، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کوچوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز آشکارا کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کہنے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کوچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی

بات کا ہو بہو کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں ـــــــ جہاں تک ان گوناگوں موضوعات کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے، بہت سوں کی بُرائی مول لی ہے اور بہت سوں کی گالیاں سُنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انہیں گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لئے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے اس لئے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کی بھی اہمیت ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں، وہ اس کا فن ہے۔ اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا صیں ہیں، شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطۂ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا کیا مفہوم ہوتا ہے ـــــ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ معیارات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامانویس اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرضِ اوّلین جانتا ہے۔ ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انہیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک، اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقِ دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لئے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو، اس کی روایت کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کئے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے جو فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات اور اظہار و ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر رکھی جائیں تو فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے

وہ اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے ان پہلوؤں کا نیکھاپن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انہماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جس سے اظہار کے وسائل کو نیاپن اور بلندی ملتی ہے، اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کا رنگ بھی پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ان حقائق کو پیش نظر رکھے بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں انحطاط پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے، اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی ابھرتے اور اندھیرے میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، کہانی —— ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ، اس قصے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص انداز فکر و نظر، یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔ اس افسانے، ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور تصور کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی یہ امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے —— ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو 'ایک' ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہئے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انہیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں —— یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کئے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لئے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے 'نیا قانون'، 'خوشیا'، 'نعرہ' اور 'نیا سال' پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجربۂ حیات

کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسبِ موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے، لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں ——— یہ چیز 'نیا قانون'، 'خوشیا'، 'نعرہ' اور 'نیا سال' کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی رنگا رنگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ 'منترا' اور 'میرا اور اس کا انتقام' اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے، لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ ہے ——— ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک ملا جلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے اسی طرح 'ہتک' ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر 'ہتک' کی ہیروئن 'سوگندی' کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر سوگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود 'سوگندی' ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غالب آ کر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف 'سوگندی' کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گذری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہئے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے، اپنے افسانہ کا ایک ڈھانچا بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح ختم ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کر دے، دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں جنہیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے

افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لئے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہو گی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔ منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور برے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لئے ہیں، لیکن کام خواہ کچھ بھی رہا ہو قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لئے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔

'نیا قانون' اس طرح شروع ہوتا ہے:

> "منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی سکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"

اسی طرح "بلاؤز" کی تمہید یہ ہے:

> "کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے:

> "گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین ننھے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لئے بلبلا رہے ہیں، تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لئے بے سُری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں، نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔"

"میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دُور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا، دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔
دور، بہت دور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گہرے رنگ کا قالین ہے جسے اُدھر سے اِدھر سمیٹا جا رہا ہے۔"

پہلی تمہید "شوشو" کی ہے اور دوسری "بانجھ" کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کیلئے ایک فضا تیار کی ہے اور اس فضا میں دونوں مرقعوں میں اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے پڑھتا ہے۔

"پھاہا" کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔"

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا —— یہی افسانہ نگار کی جیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر سنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھیے:

"ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔"

یہ تمہید "پہچان" کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے، نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے۔ بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ "آؤ، اگر تم بھی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ" —— اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور دیکھیے:

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

یہ "نعرہ" کی تمہید ہے اور اس میں افسانے کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چُور، گھر کو واپس گیا تھا —— وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا، مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد

پرلیم کستی تھی۔

یہ تمہید "ٹھنک" کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں' اس لئے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک ہار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا مجرب دارو نہ صفائی آگے چل کر کیا گل کھلاتے ہیں' افسانہ کے منجدھار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے' جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے' کردار کو متعارف کرنے کا' ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا' ایک پھڑکتی ہوئی خبر سنانے کا' کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا' آنے والے واقعات کے لئے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا' لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمے لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کرے' اس کے دل میں گدگدی پیدا کرکے یا اس کے من میں آگے پڑھنے کی خواہش پیدا کرکے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کرے۔ منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لئے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جماتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لئے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے بالآخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے اس منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے' جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں طے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خلش کو گوارا اور آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لئے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لئے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لئے قابلِ قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی' ذرا سی تن آسانی' ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور تکلف اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لئے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہے ——— منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کرکے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی اس خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:

> استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے ——— راستے میں اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون' نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔
>
> "نیا قانون' نیا قانون کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پرانا!"
>
> اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"پھاہا" کا انجام یہ ہے:

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلا اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اس ننھے سے اُبھار پر جما دیا۔

"شہ نشین پر" کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے زندہ رہنا ہوگا۔"

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس نکھری ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

"ہتک" کی ہیروئن "سوگندھی" ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے:

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

"...... اس کے حلق سے ایک نعرہ ...... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا ——— ہت تیری ...... !

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے، ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کئے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا "یہ پگلا ہے!"

(نعرہ)

"...... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا ——

سیواجی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔" (میرا اور اس کا انتقام)

"اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں ——— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر اٹکا رہے گا۔"

(نامکمل تحریر)

"جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے" میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بگو کی یادگار! "ان کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے"۔ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لئے دفتر چلا گیا۔"

(بگو)

وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا ـــ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجتمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر بتدریج زیادہ منظم بنتا رہا تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

"نیا قانون" کے خاتمہ میں استاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ "پھاہا" کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ "شہ نشین پر" کا انجام جذباتی کھنچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فنکارانہ حل کی تصویر ہے۔ "ہتک" کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندی کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "بگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گذار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، اور ہر پڑھنے والا صرف

ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچا۔ "ناکمل تحریر" میں آخری جملہ میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابلِ فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سجدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، اپنے فن کے لئے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لئے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتِ بیان اور اس کے اندازِ فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگیٔ بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانے کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت، اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ افسانہ اتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے ——— بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی۔ اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عناں و ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام ——— ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لئے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ شروع ہو کر بڑی دھیمی لیکن تلی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس دھیمی اور تلی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے ——— ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لئے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لئے اس ربط میں ایک خوش گوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنہوں نے دی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ منٹو کے فن کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔ منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

"نیا قانون" کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سُن کر خوشی سے پھُولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصّوں کو اس طرح پُر کرنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لئے حد درجہ کرب انگیز بن جائے، منٹو کے فنی احساس اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا مظہر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوئی تھی اس کے بعد نئے قانون کے نافذ ہونے کی تاریخ تک منٹو نے کئی ایسے موقعے پیدا کئے جن پر منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسرت آہستہ آہستہ وارفتگی اور دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ روزِ سعید آ پہنچتا ہے تو اس کی مسرت وارفتگی اور دیوانگی شوقِ آزادی کو مجسّم دیکھنے کے لئے بیتاب نظر آنے لگتی ہے اور عین اس وقت جب اس وارفتگیٔ شوق کو بظاہر اپنی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اسے حوالات میں داخل ہونا پڑتا ہے ——— اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو متعدد نازک مرحلے طے کئے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرقِ استعجاب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی ٹریجڈی کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود حد درجہ تڑپا دینے والی ہے۔

"نیا قانون" منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لئے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی اتار چڑھاؤ، یہ نازک اونچ نیچ، اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو فن کے نقطۂ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔ اس اندازے کے لئے منٹو کی چند اور کہانیوں پہ ایک سرسری سی نظر ڈالئے۔

"منتر" اور "میرا اور اس کا انتقام" موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انہیں پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ اس نے ایک ہلکی پھلکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں سب پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوئی ہیں۔

"پھاہا" "بلاؤز" اور "کالی شلوار" ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنہیں منٹو کے محبوب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے قریبی تعلق نے منٹو کو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ "پھاہا" اور "بلاؤز" میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرنے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لئے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی فضا تیار کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انہماک کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انہماک اور غور و فکر نے دو سیدھے سادے افسانوں کو ایک علمی حیثیت دے دی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت "کالی شلوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ 'کالی شلوار' طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع

سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منٹو کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آئے گی منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، ان واقعات کے پیچ اور الجھاؤ، اس اتار چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطۂ عروج اور اس کا خاتمہ۔ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے، اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لئے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو بڑا اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی (منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں۔ گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لئے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لئے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتے اور استعمال کئے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب و نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو، اس کے لئے کسی خاص محل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور انہیں صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لئے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لئے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نا اہم ہے یہ تمام منٹو کے انداز اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

(۱) سب سے پہلی مثال 'نیا قانون' کی ہے۔ استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے اتنے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے۔ منگو بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:

"ہاتھ لا ادھر، ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے —— تیری اس گنجی کھوپری پر بال اُگ آئیں۔"

(۲) 'پھاہا' میں بازارِ حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے —— "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں —— آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔"

(۳) 'پھاہا' ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے — "مرونڈیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مرونڈیاں اس کے آنسو ہیں۔"

(۴) 'پھاہا' میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دوکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پوری تول نہیں تولے گی:

(۵) "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے —— "شوشو ...شوشو...... ارے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپرمنٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔

(۶) "شوشو" ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے۔ "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔"

(۷) "خوشیا" میں کانتا کا ننگا سمہ روم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔"

(۸) "آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔" (بانجھ)

(۹) ......"محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے" (بانجھ)

(۱۰) "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے۔" (نعرہ)

(۱۱) جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ (بلاؤز)

(۱۲) "نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں۔" (اس کا پتی)

(۱۳) "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو —— اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا ہے۔ اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے"۔ (ہتک)

(۱۴) "فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔" (دھواں)

(۱۵) "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی —— میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے الجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

(۱۶) "اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔" (نیا سال)

(۱۷) "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔" (رقص)

۱۱۔ زندگی کیا ہے؟ ——— میں سمجھتا ہوں کہ ایک اُونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔ (مصری کی ڈلی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے اندازِ بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبر ا میں منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبر سُناؤں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی۔ لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور رنگینیٔ تصور کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لئے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ "آپ مجھے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں" تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے، بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بےنقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے، لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مروڑیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لئے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اکثر لکھنے والوں کو بحرِ فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہر آبدار نکالنے کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لئے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جملے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرتِ بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ——— ادنیٰ اس لئے کہ یہ کرشمہ کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرین ہے ——— لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبۂ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آجاتی ہے۔ منٹو نے اپنے انداز کو ہمیشہ عمومیت سے بچایا اور سادگیٔ بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۵ تاثر انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پپر منٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لئے بھی شوشو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے اندازِ بیان کی ندرت اور قدرتِ کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ مجسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کئے ہیں۔ 'بانجھ' اور 'اسقاط' کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے

اس لئے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے یا اس کا اسقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور تکدر کی ایک ملی جلی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لئے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے لیکن منٹو کی چابک دستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے، بلکہ پڑھنے والے کے لئے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دئے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے ——— یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے لے کر پندرھویں مثال تک ہر جملہ تھوڑے سے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوبِ نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتیں جہاں منٹو نے انہیں کامیابی سے برتا ہے، اور کبھی بہت سی ملی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے ——— دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو میں یہ ہوں، مجھے اچھی طرح پہچان لو۔ اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناقابلِ فراموش بن جاتی ہے۔

سولھویں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سُنا کر فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے آئینہ کی طرح روشن اور سورج کی طرح تاباں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمیں ایک خبر یہ کہہ کر سُنائی کہ محبت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لئے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک بات معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ کوئی سُننے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں یہاں بھی سادگیٔ بیان اور اہم ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کارفرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج ہے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور مؤثر ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے، ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حیثیت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور مؤثر سے مؤثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور معمولیت کو تصور آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لئے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکشِ فن کے بڑے

سیدھے تیر بھی ——— ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے دیکھئے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے:

"ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔" (نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور رہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لئے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی تکمیل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے ——— اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے ——— وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں، وہ جذباتی طور پر پوری طرح اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے ——— استاد منگو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل کہلوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ "نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا" منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب استاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منٹو کا دُور رس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

"وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے" (پہچان)

"اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے" (ٹھنڈا گوشت)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانتا برہنہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ "کیا ہرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے" یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار زاویوں میں سے ایک یہ ہے:

"خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے" (خوشیا)

'بانجھ' میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:

کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے 'ہوں' کی ہے۔ (بانجھ)

یہ تشبیہہ بھی غیر معمولی نہ سہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

"گالی ——— یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا" (نعرہ)

"بار بار یہ دو گالیاں، جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں" (نعرہ)

"دو گالیاں، جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر پھینک دئے ہیں" (نعرہ)

"دو گالیاں ——— اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے" (نعرہ)

ایک گالی یا دو گالیاں ——— میرے اور آپ کے لئے روشنی سنائی بے حقیقت باتیں ہیں جنہیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا ہے۔ لیکن کیشولال کے دل پر ان گالیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام لیا ہے اس سے عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے، سطحیت میں گہرائی آئی ہے۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چند اور تصویریں دیکھئے۔ پہلی دو تصویریں 'دھواں' کی ہیں:

"موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے" (دھواں)

"ایک کبوترا اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے" (مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے:

"یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹرائل پی رہا ہے" (سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو ترجمے ہی خام

انداز میں ٹھنایا گیا ہو۔" (سجدہ)

"وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔" (سجدہ)

"اس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔" (سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا ـــــ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدِ مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔" (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ نکھرا اور ہر نقش واضح ہے۔ منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابک دستی اس طرح برمحل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منٹو کا اسلوبِ اظہار جس میں الفاظ، فقروں اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے۔ مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل ہے ـــــ اور وہ ہے 'تکرار'

'تکرار' مشرقی اسلوبِ اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً 'تکرار' کو ایک لفظی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترنم اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترنم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقروں کی تکرار خاصی عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جابجا اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے خوشیا، نعرہ، بلاؤز، ہتک، نیا قانون، اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں اُلّو کا پٹھا، اور قبض اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

دو تین افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھیے کہ اس تکرار سے منٹو نے کیا کیا کام لئے ہیں۔

'نعرہ' میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالاخانے سے نیچے اترا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں:

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

اس لئے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سُنئے:

.... مالک مکان نے غصے میں آکر اسے گالی دی ـــــ گالی ..... یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا.......

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھرّیاں پڑے چہرے پر قے کر دے

مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے ......

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی ——— اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے ......

ایک نہیں دو گالیاں ——— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا، اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے...... گالی ... گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا ——— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو ——— پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔

گالیاں ... گالیاں ... کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پہ دے مارے۔

اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے ——— دو مہینے کا کرایہ، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا ——— سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور ...... یہ موٹی گالی ...... پھر دوسری ...... اور اس کی خاموشی ...... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔

'نعرہ' میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشولال کے ذہنی اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے اور اس تکرار لود بڑھتے ہوئے ہیجان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لئے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشولال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا جس سے کیشولال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ "پگلا ہے"۔
منٹو اپنے فن میں افسانہ کی تمہید، اس کی اُٹھان، اس کے نقطۂ عروج اور اس سے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ 'نعرہ' میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔ تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے، تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جاکر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطۂ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

'بلاؤز' شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن کو:

"شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا...... یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔"

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لئے بنے ہوئے نئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو......

"رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور یہ پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہوگیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے ساٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے...

"حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا ـــــ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔"

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آکر بلاؤز کو دیکھتا تو......

"اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔"

اور بالآخر ایک رات کو:

"جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ـــــ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر

> اس سے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا ——— یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا ——— پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے ——— بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آ گئی اور موسن کی روئی پی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا ——— پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا ——— ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے ......

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقا، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کیے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے، لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص عمل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس عمل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ 'نعرہ' اور 'بلاؤز' کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے 'ہتک'، 'خوشیا'، 'الو کا پٹھا' اور 'قبض' جیسے افسانوں میں بھی اجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے 'تکرار' کی طرح 'تضاد' کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے ——— ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف طبقوں میں اونچ نیچ اور معاشرتی اور معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوبِ ادا سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزا مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

پہلا اقتباس 'نعرہ' کا ہے جس میں کیشو لال کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اونچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے:

> "اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کمونٹیوں پر لٹک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے، جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔"

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل 'بلاؤز' میں اس طرح دکھائی دیتی ہے:

> "...... نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے؛ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

وہ کردار ایک ہی صورتِ حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار 'ہتک' میں کئی جگہ مادھو اور سوگندھی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کئی تصویروں میں سے ایک یہ ہے:

"ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے 'اونہہ' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دئے۔

دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا "اچھا کیا ــــ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُرفریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے ــــ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھئے:

"۔۔۔۔۔ مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی: "خبردار ــــ پڑی رہنے دے وہیں ــــ تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔"

سوگندھی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ آکر جمع ہو گئے ہیں ــــ ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندھی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورتِ حال میں تصادم بن کر رونما ہوا ہے۔

'ہتک' کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فن کارانہ تصویر ہے:

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری لفظی اور معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لئے اب تک جو بہت سی مثالیں پیش کی گئیں ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ چمکتے دکھائی دیتے ہیں ــــ مثلاً 'نعرہ' کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جنہیں ہم تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یہ افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں ــــ فرق

نہیں ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد اندازِ فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نقطۂ نظر منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نقوش کی وضاحت کیلئے جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے، جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منٹو جس طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے تاثرات کی وضاحت کے لئے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں، اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انہوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شوخ اور نکھارا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں دیکھئے

"مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوسنے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا: "ہت تیری ایسی کی تیسی"

یہ استاد منگو ہیں "نیا قانون" میں ——— اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں:

چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔

———

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:

"صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔

———

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔

"پھاہا" میں گوپال کے پتا جی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:

"اس کو اپنے پتا جی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی ۔۔۔ اس کے پتا جی لالہ پرشوتم داس نہانے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔"

———

"دیہاتن" میں کچھ نیم زندہ داروں نے جن کروں کا بندوبست کیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:

"کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا تھا جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔

———

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصّے کثرتِ استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور ریشے باہر نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دھلائی کی مار تھی۔"

(بابو گوپی ناتھ)

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔

(بلاؤز)

وہ سا گوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت اُبھرا ہوا تھا، جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔

(ہتک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی تصویر کشی کرنے، کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بتانے کے لئے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو فن کار تھا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی ——— دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں، بشرطیکہ فن کار انہیں صحیح انداز سے اور برمحل برتنے پر قادر ہو۔ اور یہ قدرت منٹو میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انہیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انہیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزا کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں۔ یعنی تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے، اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے ——— ان سب باتوں میں اس کے جدّت پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بنائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے

کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حد اہم کام کا بیڑا اٹھانا بجائے خود ایک مہم ہے لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص فطرت نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں ——— ہر ناانصافی کرنے والا، سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے فریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رسوا کرتا ہے۔ اس لئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہئے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لئے سینہ سپر رہے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرأت اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے ——— اچھا بھی اور برا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے کہ چوٹ کھانے والا تلملا کر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور برا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناسوروں کی نائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ——— اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس برے پہلو کا ایک اچھا پہلو بھی ہے اور اس کی اچھی تاویل یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا، اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں، جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کئے ہیں سیاسی ماحول کے معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح انتشار، کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جوانمردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لئے فتح کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان انتشار اور کشمکشوں کی ٹکر اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لئے کسی آبِ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آئی ہے اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور بھی نمایاں ہوئی ہے ——— لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ ہی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیاتِ فن کے ہر دور میں کسی نہ کسی طرح جاری رہی ہے لیکن ان کے فن کا آخری دور اس تصادم اور کشمکش کا سخت ترین دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو نے اس دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے توازن کی جھلک نمایاں ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا، کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے، اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعے ٹھنڈا گوشت کے سب افسانے رسالے ٹھنڈا گوشت کے ۲۳ اور ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء

کے درمیان لکھے گئے، بادشاہت کا خاتمہ، مجموعہ کے سب افسانے یکم جون ۵۰ء اور ۱۴ جون ۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح یزید مجموعہ کے سب افسانے ۴ اکتوبر اور ۱۵ نومبر ۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت ہیں منٹو کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے ——— ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کمتر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے اس نے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنہیں ہم مجموعی حیثیت سے اس کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا بجا منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی، ان کی شوخیٔ طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منٹو کی نادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں۔ اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے ——— بہت اچھے اور بُرے سب افسانے ——— پڑھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو فطرت نے ایک قصّہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے فطری محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصّہ گو کی حیثیت سے کئی گُر کی باتیں معلوم تھیں اور قصّہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گُر کی باتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے ——— لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے، اور بظاہر بہت معمولی معلوم ہونے کے باوجود یہ شرط قصّہ گوئی کے لئے بڑی اہم ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا جانتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سُننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سُننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصّہ گو اسے اپنا ہمراز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا، وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سُننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے کہانی کہنے والے کی بڑی جیت ہے۔ منٹو قصّہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو، اس کے پُر فریب تخیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصوّر کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا افسانہ 'چوہے دان' ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزا پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے اس کا اندازہ 'چند'، 'مس ٹین والا'، 'میرا نام رادھا ہے'، 'ٹوٹو'، 'ننگی آوازیں'، 'حامد کا بچہ'، 'رحمتِ خداوندی کے پھول'، 'خورشید'، 'ٹیٹوال کا کتا'، 'جرا'، 'رتی' اور 'والد صاحب' جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابلِ اظہار خیال افسانوں میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابک دستی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں یہ 'بیرن'، 'صاحبِ کرامات'، 'بادشاہت کا خاتمہ'، 'کتے کی دعا' اور 'عورت کے لئے' جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منٹو اپنے قریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا تھا، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی ——— لیکن

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ منٹو کہانی کہنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دورِ انحطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا۔ اسی لئے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو مل جل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی۔ پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لئے وہ اگر چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا، وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو کچوکے دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجربہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے احتراز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فن کار ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا —— اس لئے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں غیر معمولی قوت و توانائی —— وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے۔ اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی —— منٹو مر گیا — لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا

———

منٹو کا مقام

محمد حسن عسکری

جس دن منٹو مرا تھا اُس دن بھی میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو اُس کی زندگی اور موت دونوں کے معنی متعین کرنے چاہئیں۔ منٹو تو اُن لوگوں میں سے تھا جو صرف ایک فرد یا ایک ادیب سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اب تو جذبات پرستی کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے، اور ہمارے لئے یہ سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ اُردو ادب میں، یا کم سے کم پچھلے بیس سال کے اُردو ادب میں منٹو کی جگہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں منٹو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ منٹو چاہے موپاساں وغیرہ کی صف میں نہ آ سکے، لیکن یورپ کے اچھے خاصے افسانہ نگاروں سے اُس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے متفق ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر منٹو موپاساں کے برابر نہیں پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اُس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا۔ جس بات میں منٹو موپاساں سے پیچھے رہ جاتا ہے وہ موپاساں کی نثر ہے۔ اور موپاساں کو جس قسم کی نثر درکار تھی وہ فرانس میں اور کچھ نہیں تو کوئی دو سو سال سے نشوونما پا رہی تھی۔ موپاساں کے پیچھے روشفوکو تھا، والتیر تھا، استاں دال تھا، فلوبیر تھا۔ منٹو کے پیچھے کون ہے؟ میری بات کا وہ مطلب نہ سمجھیے جو اُردو کے ایم اے سمجھیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو نثر بالکل فضول ہے۔ اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن منٹو کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اُردو نثر کی روایت میں موجود نہ تھیں۔ منٹو کو پانی پینے کے لئے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا۔ موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے۔ اس لئے منٹو کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اُس سے پہلے اُردو میں کیا تھا، اُس کے ہم عصر کیا کر رہے تھے، منٹو کیا کر سکا اور کیا نہیں کر سکا۔ یہ باتیں دیکھے بغیر ہم منٹو کو اچھا یا بُرا تو کہہ لیں گے، مگر اُردو ادب میں منٹو کی حیثیت ہماری سمجھ میں نہ آئے گی۔

منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی، اور اس میں سے جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھاری سہی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اُس میں سے پانی نکالا۔ اب ذرا گنیئے تو سہی کہ اُردو کے کتنے ادیبوں

متعلق یہ دونوں باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہی بہت سے "خوش مذاق" حضرات کو منٹو کی ان دونوں خوبیوں سے انکار رہا ہے۔ اس کے برخلاف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اقبال کی وفات سے لے کر آج تک کسی اردو ادیب کا ماتم اس طرح نہیں ہوا جس طرح منٹو کا۔ آخر کوئی چیز تو تھی جس نے لوگوں کو اتنا سوگ منانے پر مجبور کیا۔ خیر، بعض لوگ اتنی مقبولیت کو بھی منٹو کی پستی کا آخری اور قطعی ثبوت سمجھیں گے، کیونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ ادیب کو ہر آدمی کے لئے نہیں لکھنا چاہیئے۔ ایسے لوگوں کو بیس سال سے منٹو پر یہی اعتراض رہا ہے کہ منٹو تو بس ایسی باتیں کرتا ہے جس سے لوگ چونک پڑیں۔ شاید یہ کوئی غیر شریفانہ یا غیر ادیبانہ بات ہو۔ لیکن میں نے جو تھوڑا بہت ادب پڑھا ہے اُس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو چونکانا ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے۔ بادلیئر نے تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو چونکانے سے ڈرتے ہیں۔ منٹو کو چھوڑیئے۔ بودلیر جیسے عظیم شاعر کو کیا کہیئے گا جس کا ایک ادبی اُصول ہی یہ تھا کہ متوسط طبقے کو چونکایا جائے؟ اگر چونکانا کوئی بہت بڑا ادبی نقص ہے تو چونکنے سے ڈرنا ایک ذہنی بیماری ہے، کمزور شخصیت کی نشانی ہے۔ جو آدمی دوسروں کو چونکانا چاہے اُس میں پہلے خود چونکنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ جس شخص کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعصاب زندہ نہ ہوں وہ کسی کو کیا چونکائے گا۔ ننگی کیا نہلائے گی کیا نچوڑے گی۔ اگر کوئی ادیب اپنے پڑھنے والوں کو چونکاتا ہے تو یہ کوئی شکایت کی بات نہیں۔ ورنہ پھر تو بڑھئی کی شکایت کیجئے کہ اُس نے کرسی کیوں بنائی۔ ایسا ادیب تو محض اپنا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ہاں، ادیب سے آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے ہمیں چونکانے کے بعد دکھایا کیا۔ اگر ہمیں جھنجھوڑ کر جگانے کے بعد منٹو نے ہمیں انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کا کوئی تماشا نہیں دکھایا، اگر اُس نے ہمارے اندر زندگی کا کوئی نیا شعور پیدا نہیں کیا تو پھر ہم اُسے گالیاں دینے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس نے ہمیں چین سے سونے بھی نہیں دیا۔ جو لوگ کسی قیمت پر جاگنا ہی نہیں چاہتے، اُنہیں تو اُن کے حال پر چھوڑیئے۔ لیکن کیا آپ "نیا قانون"، "ہتک"، "بابو گوپی ناتھ" جیسے افسانے پڑھ کر دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو نے ہمیں چونکا کر مفت میں ہماری نیند خراب کرائی؟

اچھا، منٹو نے چونکایا بھی ہے دو طریقوں سے۔ ایک تو اُس کے اچھے افسانے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حقیقت ہمارے لئے کچھ بدل سی گئی ہے۔ دوسری طرف اُس کے بُرے افسانے ہیں۔ منٹو کا ڈھنڈورچی ہونے کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ اُس نے بعض بہت ہی خراب افسانے لکھے ہیں، لیکن اُس کے بُرے سے بُرے افسانے میں بھی آپ کو دو ایک فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو کسی نہ کسی آدمی یا چیز یا خیال یا احساس کو منور کرکے رکھ دیں گے —— چاہے یہ روشنی ایسی ہو جو آپ کو پسند نہ آئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں بھی آورد زیادہ ہے، یہ بھی منٹو کا مداری پن تھا۔ مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ آمد اور آورد کا فرق ادب میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی چیز آمد ہو یا آورد، فیصلہ کُن بات تو یہ ہے کہ اس سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اگر آورد کے ذریعے کسی تجربے کو اظہار مل گیا تو وہ آمد سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نوائے سروش بھی دو طرح سُنی جاتی ہے، کبھی تو سروش اپنے آپ بول پڑتا ہے، کبھی اس کے کان مروڑنے پڑتے ہیں۔ سروش کی فیاضی سے تو ہر آدمی ہی ادیب بن سکتا ہے، لیکن سروش کو زبردستی بلوانے کے لئے ہمت درکار ہے۔ کیونکہ سروش کے کان مروڑنے کا مطلب ہے اپنے کان مروڑنا۔ آپ یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض دفعہ منٹو نے سروش کے کان اس طرح مروڑے کہ وہ بولنے کے بجائے چیخ پڑا یا اول فول بکنے لگا۔ لیکن منٹو نے حوصلہ تو دکھایا۔ یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ منٹو کرتا ہی کیا تھا، دو بے جوڑ باتوں کو جوڑ دیتا تھا، مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ان مل بے جوڑ میں آدمی کا حلیہ کیا ہو جاتا ہے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

منٹو کے اندر اس شعبدے بازی کی تہہ میں جو چیز کام کر رہی تھی وہ یہ کہ منٹو اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے احساس یا جذبے کو دبانے یا رد کرنے کا قائل نہ تھا۔ ہر چیز اُس کے اندر کوئی نہ کوئی ردِّ عمل پیدا کرتی تھی، اور وہ اس ردِّ عمل کو قبول کر لیتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے اور وقتی تجربات کی ایک

دوسرے سے متعلق اور منضبط کرتے رہنے کی عادت اُس میں نہ تھی۔ وقتی ردِ عمل کو وہ اتنا دلچسپ یا وقیع سمجھتا تھا کہ اس پر انضباط و تناسب کو قربان کر دیتا تھا۔ اسی لئے اُس کے افسانے کبھی تو بہت اچھے ہوتے تھے، کبھی بہت بُرے، اور کبھی افسانے میں ایک آدھ فقرہ ہی کام کا نکلتا تھا۔ منٹو میں یہ بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کا حال یہ رہا ہے کہ وہ یا تو اپنے احساس کو ایک ڈھرّے پر لگا دیتے ہیں، اس ڈگر سے ہٹ کر کسی اور قسم کے تجربے کی صلاحیت اُن میں باقی ہی نہیں رہتی، یا پھر وہ چھوٹے چھوٹے اور ہنگامی تجربات کو حقیر سمجھ کر رد کرتے چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادیب دو چار اچھے افسانے لکھ کے ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بس منٹو ایک ایسا آدمی ہے جو کسی جذبے یا احساس سے نہ ڈرتا تھا، اور جس کے لئے کوئی احساس حقیر یا غیر دلچسپ نہ تھا۔ بعض حضرات نے منٹو کے کارنامے کو یہ کہہ کر اُڑانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کے یہاں افسانے کا خام مواد تو ہے، افسانے نہیں ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے پاس خام مواد تک نہیں ہے۔ کیونکہ خام مواد تو احساسات اور جذبات ہی فراہم کرتے ہیں۔ جب آدمی اپنے اعصاب پر پہرے بٹھا دے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ منٹو کی شخصیت اُردو کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ آزاد تھی۔ اس معنی میں کہ اُس نے اپنے احساسات پر کسی قسم کی بندشیں نہیں لگائی تھیں۔ جب اُس کے احساسات ایک دوسرے سے آزاد ہونے لگے تھے تو یہی چیز اُس کے افسانے کے لئے مہلک بھی بن جاتی تھی۔ لیکن اُردو میں کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں جو احساسات کی آزادی سے اتنا کم ڈرتا ہو۔ احساسات اور ارتعاشات کی ہلچل میں منٹو کی شخصیت ضرور پاش پاش ہو گئی، لیکن اپنی زندگی اور موت سے منٹو نے ہمیں اتنا ضرور دکھا دیا کہ فن کار اپنا مواد کس طرح حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اُس نے مواد جمع کرنے کا کام برسرِ عام اور سب کی نظروں کے سامنے کیا۔ اسی لئے اُردو میں اُس کی حیثیت محض ایک ادیب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے اُس کی موت اُس کی زندگی کی معنویت کو مکمل کرتی ہے۔ اور اسی لئے اُس کے بُرے افسانوں کو بُرا سمجھنے کے باوجود میں منٹو کو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔

گنجا فرشتہ

سید عابد علی عابد

منٹو (مرحوم) مجھ سے عمر میں کوئی پانچ سال کے قریب چھوٹا تھا۔ لیکن جب وہ امرت سر سے لاہور آیا تو میں ایم اے کر چکا تھا۔ اور وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر الجھنوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کا اور میرا ایک مشترک دوست تھا (اور ہے) وہ مجھ سے دیال سنگھ کالج میں پڑھ چکا تھا۔ اور کبھی کبھی نثر کی کوئی چیز لے کر آ جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ منٹو کو لے آیا۔ ان دنوں بھی (اور یہ مدت کی بات ہے) منٹو کے انداز میں ایک نخوت اور پندار کا رنگ تھا۔ جو خود داری سے بڑھ کر تھا۔
ان دنوں بھی منٹو کسی نفسیاتی الجھن کا مریض نہ تھا۔ عمر بھر منٹو یہی چیز پریشان کرتی رہی۔ کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا مریض نہیں ہوا۔ اور جن لوگوں سے اسے واسطہ پڑتا تھا۔ اور پڑتا تھا۔ وہ کم و بیش مختلف نفسیاتی بیماریوں کے شکار تھے۔ بے باک نگاری، حق گوئی، صداقت شعاری، خلوص، دیانتداری، ادب میں اسی ادیب کو نصیب ہوں گی جو حقائق کو، نفسیاتی تعصبات اور الجھنوں کی عینک چڑھائے بغیر دیکھے گا۔ ورنہ چیز اور حقیقت کی شکل مسخ ہو جائے گی۔ میٹھی چیز تلخ معلوم ہوگی۔ اور تلخ شیریں مستطیل مربع معلوم ہوگا۔ اور دائرہ مکعب۔ حقائق کے مسخ کرنے کی صلاحیت خود مشاہدہ کرنے والے کی ذات میں مخفی ہوتی ہے۔ اور وہ حقائق کا بیان کرتے وقت ان تمام باتوں سے (سرسری تم جہاں سے گذرے) کے انداز میں گذر جاتا ہے۔ جو اسے تکلیف دیتی ہیں۔ یا جن سے کوئی تلخ یاد وابستہ ہوتی ہے۔ یا جن سے کسی نفسیاتی الجھن کا تعلق ہوتا ہے۔

منٹو حقائق کا نقاش نہیں تھا۔ عکاس تھا۔ فنونِ لطیفہ میں عکاسی اور مصوری میں یہی فرق بتایا گیا ہے۔ کہ عکاسی حقائق و اشیا کو اس طرح دکھاتی ہے جس طرح وہ موجود ہوتی ہیں۔ اور مصوری اس طرح، جس طرح مصور کے ذہن میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس طرح مصور کی تخلیق میں اور اس نمونے یا موضوع میں، جو تخلیق کا موجب ہوا ہے۔ بعض اوقات ایسا بُعد ہوتا ہے کہ پہچان نہیں پڑتا۔ کیوبسٹ آرٹ، تجریدی آرٹ کی مختلف قسمیں۔ اس قسم کے مشاہدے کی مثالیں ہیں۔ جہاں مصور اشیا کی ماہیت اور موضوع کی معنویت کی جستجو میں، علامات و رموز سے کام لیتا ہے۔ اور اصل چیز جس کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ محض ایک محور ہو جاتی ہے جس کے گرد مصور کے تصورات و افکار گھوم جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف عکاسی میں کیمرہ اشیا یا حقائق کو بعینہٖ اس طرح دیکھتا ہے۔ اور دکھاتا ہے۔ جس طرح وہ موجود ہوتی ہے۔ یعنی موجود فی الخارج۔

میں نے عرض کیا ہے۔ منٹو حقائق کا عکاس تھا۔ وہ نہایت استغنا، اور بے پروائی سے اور بہ کمالِ اطمینانِ خاطر وہ تمام نقشے الفاظ میں اُتارتا تھا۔ جو

اُسے گردوپیش کی دُنیا میں نظر آتے تھے۔ یہ نقشے اپنے اصلی خط و خال اور رنگ روپ میں بہت سے آدمیوں کو دکھ پہنچاتے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو آگاہ ہی نہ تھا کہ حقیقت کی یہ شکلیں بھی ہیں۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو آگاہ تو تھا لیکن مشرق کی وضعداری اور متانت کے خلاف کسی بات کو، وہ مختصر افسانہ ہی کیوں نہ ہو، گوارا نہ کر سکتا تھا۔ ایک وہ گروہ تھا جس کے دل کے چور کپڑے جاتے تھے بلکہ افسانوں میں ان کے دل چوری کرتے پکڑے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی جھنجھلاہٹ بجا تھی، وہ اب تک قائم ہے۔ اور غالباً رہتی دُنیا تک قائم رہے گی۔

یہ مقام کہ کوئی شخص کسی نفسیاتی بیماری کا شکار نہ ہو، بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ منٹو کے تکبر، نخوت اور پندار کو مرض نہ سمجھا جائے۔ یہ فن کار کو اپنی مہارت پر جو ناز تھا، اس کا اظہار تھا۔ وہ صرف ان موقعوں پر ہوتا تھا جب فن زیرِ بحث ہوتا تھا۔

حقیقت کی عکاسی میں، فن کار کو جزئیات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنے ماحول کی اجتماعی تصویر کھینچنے کے لئے اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے یہ پہلو دکھائے جائیں گے اور یہ نہیں۔ منٹو نے یہ کام بہت سلیقے سے کیا تھا۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ہماری معاصرانہ زندگی اور اس کے ملحوں کے بہت سے پہلو اسی طرح اجاگر ہوتے ہیں کہ مختلف افسانوں کو ملا کر ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ اس تصویر میں جنس کے رنگ بھی چوکھے لگے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جنسی معاملات میں، ہمارے ملک میں، ہر لڑکا اور ہر لڑکی کسی واہیات کتاب سے یا کسی واہیات دوست سے یا سہیلی سے جنسی معلومات حاصل کرتا یا کرتی ہے اور یہ معلومات ایسی ناقص اور بیہودہ ہوتی ہیں کہ بہت سی جنسی گمراہیوں اور کج رفتاریوں کا موجب ہوتی ہیں۔ منٹو اس گمراہی اور کجروی کی عکاسی کرتا ہے۔ (اور جنسی بھوک کا تذکرہ بھی کرتا ہے) بات ذرا طول پکڑ گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ حقیقت کی عکاسی کے لئے ضروری ہے کہ عکاس کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ یعنی ذہنی بیماری میں۔ منٹو اس اعتبار سے اپنے دور کا بڑا صحت مند ادیب تھا۔ اس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کو بالی عمر کے بچے اور بچیاں پڑھیں تو ان کے اخلاق پر بُرا اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود منٹو کی نیت کا کیا عالم تھا؟

حقیقت کے عکاسوں کو دُنیا نے ہمیشہ بُرا بھلا کہا ہے کہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ انھیں تو وہ نقاش پسند آتے ہیں جو وہ نقش لگائیں کہ دل کو بھلے معلوم ہوں۔ موضوعِ تصویر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی موہنی شکل پیدا کریں کہ آدمی گھنٹوں دیکھا کرے۔ لیکن ادب کو پہلے عکاس کی ضرورت ہے، پھر نقاش کی۔ اصلیت معلوم ہو گی تو وہ تصویر بنائی جائے گی۔ جو مطلوب ہے۔ اور مقتضائے دل ہے۔ دنیائے باطنی اس وقت تک خارج میں متشکل نہیں ہو سکتی۔ جب تک پہلے فن کار کے ضمیر کے اندر پیدا نہ ہو۔ یہ دنیا تبھی وجود میں آسکتی ہے کہ ادب میں ہر مرحلے پر عکاس پیدا ہوتے رہیں۔ تاکہ انسان حقیقت سے آگاہ رہے۔ اور آنکھیں بند کر کے یہ نہ سمجھ لے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔

دنیائے خارج میں کوئی معیاری معاشرت اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک حقیقت کے عکاس برابر ظہور میں نہ آتے رہیں۔ اور پریشان خاطر رہ کر بھی سکونِ قلب اجزا کو دیکھ کر ایک اجتماعی تصویر نہ بناتے رہیں۔ کہ نقاشوں کو معلوم ہو سکے کہ اصل صورت کیا ہے۔ نئی دُنیا بنانے کے لئے نئی اقدار دریافت کرنے کے لئے، نئی انفرادی تربیت کے لئے، اجتماعی اصلاح کے لئے پہلے اس دُنیا کی عکاسی کی ضرورت ہے، جو ہے۔ تاکہ وہ، جو ہونا چاہیئے۔ وجود میں آسکے۔

افسانوں میں فن کار اپنی مخلوقاتِ ذہنی اپنے کرداروں کے ذریعے بات کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے، وہ بالواسطہ کہا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اگرچہ مصنف کی اخلاقی اقدار مترشح ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اُس کے ذاتی عقائد کا زندگی پر اس کے نقطۂ نظر کا سُراغ بہت کم ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ افسانے میں مصنف ان تمام خیالات سے اختلاف کرے۔ جو کرداروں کی زبانی ظاہر کئے گئے ہیں۔ عکاسی کے افسانوں میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ افسانوں کے متعلق، فن کے متعلق، زندگی کے متعلق، اور بہت سے دوسرے مسائل کے متعلق، منٹو کا نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے اس کی کتاب گنجے فرشتے کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ کتاب منٹو نے جو فن کی منزلیں طے کی ہیں، ان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح نگاری اور ذاتی تاثرات کے امتزاج سے کم و بیش اُردو میں ایک نئی صنفِ ادب وجود میں آئی ہے۔ یہ طے کرنا کہ اس صنفِ ادب کا نام کیا رکھا جائے۔ چنداں

ضروری نہیں۔ صرف پہلے پایا جانا ضروری ہے۔ "گنجے فرشتے" میں منٹو نے بہت سے عناصر کو سمو کر سوانح نگاری کا ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس کتاب میں قائد اعظم (مرحوم) آغا حشر (مرحوم)، اختر شیرانی (مرحوم)، میرا جی (مرحوم)، باری (مرحوم)، عصمت چغتائی، اشیام، پری چہرہ نسیم بانو، نرگس، ڈیسائی اور بابو راؤ پٹیل کے متعلق مضامین ہیں۔ ان مضامین میں منٹو کے سوانح حیات کے بہت سے تار الجھے ہوئے ہیں۔ صنعت فلم سازی کے تذکرے موجود ہیں۔ پیشہ ور نقادوں کی ہلکی ہلکی چوٹیں بھی ہیں۔ جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا کردار اور ان کی شخصیت منفرد ہے۔ لیکن ان کے تذکرے میں ایک قدر مشترک ہے۔ منٹو کا بے تکلفانہ انداز نگارش جو اس مجموعے کی تمام شخصیتوں کو گویا ایک لڑی میں پروتا ہے (ذاتی تعلقات تو ظاہر ہیں کہ تھے۔ قائد اعظم مرحوم کے سوا) بظاہر یہ مجموعہ بارہ آدمیوں کے متعلق ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا موضوع ایک تیرھواں آدمی بھی ہے۔ اور وہ خود منٹو ہے۔ جس کی شخصیت اس کتاب میں بے نقاب ہے۔ حیرت کی بات ہے۔ کہ منٹو اپنی حد درجہ پُر تصنع فلمی دنیا میں رہ کر بھی جذباتی رہا۔ خلوص کا خواہاں اور حامل۔ مزے کی بات یہ ہے۔ کہ منٹو نے اپنی جذباتیت کو، اپنی خوبیوں کو اور اپنے خلوص کو بڑے اہتمام سے پڑھنے والوں سے مخفی رکھنا چاہا ہے لیکن جو شخصیت اس کتاب میں سب سے زیادہ اُبھری ہے۔ وہ منٹو کی ذات ہے۔ معلوم نہیں۔ کہ ترتیب میں ترتیب زمانی کس حد تک ملحوظ ہے لیکن مسلسل مطالعے سے منٹو کی ایک شخصیت اُبھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے نوجوان، سادہ دل، فنکاروں اور معشوقوں پر فریفتہ، پھر دنیا کی منافقت سے دوچار، کارزارِ حیات میں نبرد آزما اور آخر اپنی ہی ذات کی ایک کمزوری سے شکست کھا کر مایوس و نامراد انسان۔ آغا حشر سے جن دو ملاقاتوں کا منٹو نے ذکر کیا ہے۔ اُس میں ہمیں وہ کم عمر منٹو نظر آتا ہے۔ جس کی طبیعت پڑھائی سے اُچاٹ ہو چکی تھی۔ اور جو اپنے اردگرد کے حالات کو تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں اُس پر مشہور صحافی اور مورخ باری کا بہت اثر تھا۔ جو منٹو کے خیال میں حد درجہ بزدل واقع ہوئے تھے۔ اختر شیرانی سے جو ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اُس سے منٹو کے جذباتی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ "تین گولے" میں (یہ میرا جی سے متعلق مضمون ہے) منٹو نے پُراسرار تثلیث کا افسانہ شروع کر کے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ اور میرا جی کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے۔ اس سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، یہ اور بات ہے۔ لیکن منٹو نے جو داد موشگافی دی ہے۔ اس سے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ وہ لکھتا ہے:-

"حسن عشق اور موت . . . اس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے۔ لیکن حسن اور عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا۔ جس کے شیشوں میں تریڑے تھے۔ اس لئے اُس کو جس شکل میں اُس نے دیکھا تھا۔ صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اُس کے سارے وجود میں ایک ناقابل بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پہ کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور وہی نقطۂ انجام۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ موت کی طرف تھا۔ نہ زندگی کی طرف۔ رجائیت کی سمت نہ قنوطیت کی جانب۔ اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس طرح بھینچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا لہو نچڑ نچڑ کر اسی میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اُس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ اُن تین آہنی گولوں کی طرح جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگ کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔"

منٹو کو اپنے معاصروں سے، فن کاروں سے خاص طور پہ اور انسانوں سے عام طور پہ، کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اُس نے میرا جی کے مرنے پر یہ لکھا۔ کہ "اچھا ہوا کہ وہ جلدی مر گیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے مزاجے میں اور خراب ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔" بظاہر ان فقروں سے سنگدلی ٹپکتی ہے۔ لیکن ان کے بین السطور پر غور کیجئے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ منٹو کا دل رحم سے جیسے بھر آیا ہے۔ وہ میرا جی کی، انسان کی مزید ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے مرنے پر "اچھا ہوا" کے کلمات استعمال کرتا ہے۔

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

باری پر منٹو کا مضمون نہایت شگفتہ لیکن نہایت دقیق مشاہدات پر مبنی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ منٹو باری کو بہت بزدل تصور کرتا تھا۔ اپنے لئے کاروبار کی جو سکیم وہ بناتا تھا۔ اس میں فرار کا چور دروازہ ضرور ہوتا تھا۔ کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں۔ اور محاذ سے پیچھے ہٹنا پڑے۔ تو ایک راہ کھلی ہے۔ باری کو جس طرح منٹو نے دیکھا ہے۔ اُن کے کردار کا تشخص ایک جملے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

"باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں۔ اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ
کود کر باہر نکل سکیں"

باری کے متعلق منٹو کے مضمون میں طنز کا رنگ بہت چوکھا ہے۔ اور بذلہ سنجی کے کرشمے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ گویا منٹو کو باری سے جو محبت تھی۔ وہ اُسے طنزیہ جملوں کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کہیں یہ نہ کہیں۔ کہ اب منٹو ایک بزدل کو دوست رکھنے لگا۔ لیکن سارا مضمون پڑھ جائیے۔ دوبارہ پڑھ جائیے۔ تو معلوم ہوگا کہ منٹو نے دوستی کو دشمنی کا سا رنگ دے دیا ہے۔ یہ پیار کی یہ عجیب و غریب شکل ہے۔ لوگ مصلحت کو مدِ نظر رکھ کر دشمن کو بھی دوست کہتے ہیں۔ منٹو دوست کو بھی حسبِ دلخواہ نہیں گانٹھتا۔ کہ لوگ اس کی اس کمزوری پر مطلع نہ ہو جائیں۔ کہ وہ جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ اور دوستوں کے تمام عیب معاف کر دینے پر قادر ہے۔ منٹو کے اپنے بیان کے مطابق باری کی زندگی کے کچھ پہلو ریڈیائی ڈرامے "جرنلسٹ" میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو کا ایک فقرہ اس کی اصل نیت کی غمازی کرتا ہے "لیکن ٹریجڈی یہ تھی۔ کہ ان صحافیوں سے اس کے خلاف (یعنی ڈرامے) سنوایا گیا۔ جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس میں کی گئی تھی"

اب معلوم ہو گیا۔ کہ منٹو کا جو مضمون باری پر ہے۔ اس میں وہ صرف باری پر ہی نہیں۔ اپنی ذات پر بھی طنز کر رہا ہے۔ کیونکہ خود اُس نے بھی زندگی صحافی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اس مضمون میں درحقیقت منٹو نے اس زمانے کو یاد کیا ہے۔ جب اُس نے کارزارِ حیات میں قدم رکھا ہی تھا۔ وہ اعتراف کرتا ہے۔ کہ تصنیف و تالیف کا چسکا پیدا کرنے کا محرک باری مرحوم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب منٹو دریافت کر رہا تھا۔ کہ اس کی فطرت کے ممکنات کیا ہیں۔ اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ کامیاب ہوگا۔ وہ کامیاب ضرور ہوا۔ لیکن لازوال شہرت، بے پناہ خلوص، حیرت انگیز مشاہدہ، بے تکان لکھنے کی قدرت، کوئی چیز بھی آڑے اس معاشی بحران سے نہ بچا سکی۔ جس کے صدمات کو بھلانے کے لئے وہ شراب پیتا تھا۔ باری پر جو مضمون ہے۔ وہ دائرے کی طرح ہے۔ اس میں منٹو جہاں سے چلا ہے۔ وہیں واپس آتا ہے۔ معاشی بے اطمینانی سے معاشی بے اطمینانی تک۔ ان دونوں حدود کے درمیان وقتی ثروت کی کئی منزلیں ہیں۔ لیکن ان سے منٹو نے کبھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ تو باری پر جو مضمون ہے۔ وہ صرف باری کا ہی نہیں۔ منٹو کا اپنا مرثیہ بھی ہے۔ اور کم و بیش ہر صحافی، ادیب اور فنکار کا مرثیہ ہے۔ اس مضمون کا زہرخند غالباً بے نظیر ہے۔ اور منٹو کی کسی اور ذہنی تخلیق میں ایسے تیکھے فقرے نہیں ملیں گے۔ مثلاً:۔

"یہ بھی ہو سکتا تھا۔ کہ وہ پرائمری سکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی
کے ریڈر ہو جاتے"

"جاؤ کوئی اور کام کرو۔ ہیگل اور کارل مارکس تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگا۔ غریب باری
بھی ابھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا"

"اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آگیا تھا۔ کہ اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔
مگر سردیوں میں معلوم ہوا۔ کہ کام نہیں دے سکتا"

"ان کی طبیعت صلح کل تھی۔ دل کا عارضہ ان کو بہت دنوں سے تھا۔ مگر اس کا علاج انھوں نے جب بھی کیا۔ مصالحت آمیز طریقہ سے کیا۔ اس کی مدافعت میں ان سے کبھی جارحانہ قدم نہ اٹھا۔"

"وہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ لیکن یہ طرفہ تماشا ہے۔ کہ جب انگریز چلا گیا۔ تو وہ اسی کے ہو کر ہو گئے۔"

منٹو ادب کے معاملے میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ لیکن اس کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تھا۔ اس لئے جب وہ نقاد کا بہروپ بھرتا تھا۔ تو بڑی پرلطف کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس کی ذہانت اور فطانت بعض اوقات اسے ایسے نکتے سجھاتی تھی۔ کہ پیشہ ور نقاد منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اور کبھی وہ ایسے دعوے کرتا تھا۔ جن کا اثبات ممکن ہی نہیں۔ عصمت چغتائی پر جو اس نے مضمون لکھا ہے۔ اس میں اسی قسم کے تضاد کا نہایت پرلطف مظاہرہ ہے۔ ایک بار عصمت سے زبان کے مسئلے پر جو گفتگو شروع ہوئی۔ تو عصمت نے بھی شاہد کی تائید کی۔ کہ منٹو سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اسی سلسلے میں عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا۔ منٹو نے کہا "صحیح لفظ درازدستی ہے۔"

"شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ دال کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہ تھا۔"

اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ منٹو ہم سے کہنا چاہتا ہے۔ کہ دست درازی کرنا، کوئی محاورہ ہی نہیں۔ نہ دست درازی کوئی صحیح ترکیب ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ لغات میں دست درازی مندرج ہے۔ اور اس کے معنی بھی طاقت اور زبردستی وغیرہ بصراحت لکھے ہیں۔ معلوم نہیں۔ شاہد نے کونسی لغت دیکھی۔ اسی طرح عصمت کے افسانوں پر انتقاد کرتے ہوئے اس نے عزیز احمد صاحب کی تنقید پر جو انتقاد کیا ہے۔ وہ اس کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ "عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ہر ہر نکتے میں موجود ہے۔ جو اس کے سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں اور کمیوں کو ہم مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے" یہ ایسی زیادتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ عورت کے لکھے ہوئے افسانے پڑھ کر فوراً پتہ چلتا ہے کہ مصنف عورت ہے۔ اور مرد کے افسانے کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ مصنف مرد ہے۔ یہ غلط مفروضہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ عورت مردوں کی فطرت کی تصویر کشی میں مرد مصنفوں سے کم رتبہ ہے۔ نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ صرف مرد ہی مردوں کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ فن کار کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہوتا ہے۔ وہ مشاہدے، مطالعے اور تخیل سے مدد لے کر جنس مقابل کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے۔ عورت اور مرد کے جذبات بنیادی طور پر یکساں ہوتے ہیں۔ کہ انسانیت دونوں میں مشترک ہے۔ اور انسان نے جو کچھ محسوس کیا ہے۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں کسی افسانے کے متعلق ہمیں معلوم ہو۔ کہ لکھنے والی عورت ہے۔ تو ہم پر نفسیاتی اثر ضرور رہے گا۔ اور ہم کہیں گے۔ کہ جذبات کی یہ لطافت اور یہ نفاست صرف عورت ہی کے افسانوں میں مل سکتی ہے۔ منٹو بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر عصمت کے بعض افسانوں کو عورت کے نازک اور ملائم افسانے کہتا ہے۔ منٹو کی نظر میں یہ افسانے عورت کی ادائیں ہیں۔ صاف شفاف۔ ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ میں نے عرض کیا تھا۔ کہ منٹو جب نقاد کا روپ دھارتا ہے۔ تو زد و کلام میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ عورتوں نے ایسے ایسے غیر نازک اور ناملائم افسانے لکھے ہیں۔ کہ بایدو شاید۔ ادھر مردوں نے بھی ایسی نزاکت خیال دکھائی ہے۔ کہ سبحان اللہ۔ اس سلسلے میں ہیجڑے کے ادب کا ذکر بھی منٹو نے کیا ہے۔ پطرس پر منٹو نے یہ پھبتی چست کی تھی۔ کہ یہ "ٹھیٹ پطرسی فقرے بازی ہے۔" اب یہ ہیجڑے کے ادب کا ذکر جو آیا ہے۔ تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ خالص منٹو طرازی ہے۔ بذلہ سنجی انتقاد کے سلسلے میں دلیل کی نعم البدل نہیں بن سکتی۔ دعوے اور دلیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں فنی تعمیر کے متعلق بھی ایک آدھ انتقادی فقرہ ہے۔ اس سے بھی درگذر ہی کر لیا جائے۔ تو اچھا ہے۔

عصمت چغتائی کے بعد جن لوگوں سے منٹو ہمارا تعارف کراتا ہے۔ وہ سب فلم کے مصنوعی آسمان کے درخشندہ لیکن رو بہ زوال ستارے ہیں۔ فلمی زندگی کے متعلق لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں جو رومانی تصورات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ان مضامین کے مطالعے کے بعد مزید نشو و نما پاتے ہیں۔

اور کچھ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ فلم کی دنیا خود منٹو کی ذات کی طرح متضاد باتوں کا مجموعہ ہے۔ منٹو نے بڑی چابکدستی سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ بیشتر مضامین کا اسلوب ہمدردانہ ہے۔ ان مضامین میں بھی منٹو بے حد جذباتی نظر آتا ہے۔ اور حسب معمول اپنی جذباتیت کے اخفا میں مصروف جس وقت برصغیر ہند و پاک کی تقسیم عمل میں آئی ہے۔ منٹو بمبئی کے نگار خانوں میں مسلّم ادبی حیثیت اور وجاہت رکھتا تھا۔ ہزاروں روپے ماہوار کما تا تھا۔ اس کے پاکستان آنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہاں ایسا تھا۔ کہ بمبئی ٹاکیز میں بڑے بڑے منصب مسلمانوں کے تصرف میں تھے تقسیم کے بعد بمبئی ٹاکیز کے ارباب اقتدار کو گمنام خطوط موصول ہونے لگے۔ کہ مسلمانوں کو الگ کرو۔ ورنہ سٹوڈیو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ منٹو نے دل میں سوچا۔ کہ بمبئی ٹاکیز کے ارباب اقتدار یعنی اشوک کمار اور واچہ کو تکلیف میں مبتلا کرنا ٹھیک نہیں۔ اس نے بمبئے ٹاکیز جانا ترک کر دیا۔ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور خود اس کے لفظوں میں:۔

"میں چپ چاپ باجرے کی گلی سے پاکستان چلا آیا"

اس کے بعد:۔

تجھ سے مخفی ہے جو مجھ پہ گذری

تو قریب رگ جاں رہتا ہے

منٹو نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ لیکن فارغ البالی اور آسودگی کے بعد ایکا ایکی معاشی بے اطمینانی میں مبتلا ہو جانے کے نتائج نمایاں ہو کر رہے اور وہ منٹو جو کسی سے نہیں ڈرا تھا۔ جس نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی، خود اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس سے کہا شراب پینی ترک کر دو۔ ورنہ مر جاؤ گے۔ کچھ عرصہ اس نے اس مشورہ پر عمل بھی کیا۔ لیکن:۔

پیمان نمی پہ ند

مربدان ہمی بہ انند

والا نقشہ ہوا۔ اور آخر شراب نوشی کی کثرت نے منٹو کو بھی ہلاک کر دیا۔ یہ اتفاق دیکھئے گا۔ کہ "گنجے فرشتے" میں تین اور بھی ادیب ایسے ہیں۔ جن کو شراب نے ڈس لیا۔ یعنی، آغا حشر، اختر شیرانی، اور میرا جی۔ آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سوائے شراب کے شاید اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ باری مرحوم دل کے مریض تھے۔ معلوم نہیں شراب کسی حد تک ان کی موت کی ذمہ دار ہے۔

میں ذرا بہک گیا ہوں۔ اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا۔ کہ "گنجے فرشتے" بارہ آدمیوں کے حالات پر مشتمل نہیں۔ اس میں ایک تیرھویں شخصیت بھی ہے۔ یعنی خود منٹو۔ ایک طرح یہ کتاب منٹو کے خود نوشت سوانح حیات کے چند ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ منٹو کا ذکر کتاب میں گویا ضمناً آیا ہے۔ اس لئے اس کتاب کے مندرجات منٹو کی شخصیت کو اُجاگر کرنے میں مضمون "منٹو" سے کہیں زیادہ معاون ہوتے ہیں بجو "پر کنڈوں کے پیچھے" کا آخری جزو ہے۔ کیونکہ اس مضمون یعنی "منٹو" میں مصنف کچھ باتوں کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یوں بھی اپنے سوانح حیات لکھنے کی شعوری کوشش میں ریاکاری کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اور مختلف مضامین میں بغیر سوچے ہوئے مصنف جو کچھ لکھ جاتا ہے۔ اس سے انکشاف ذات و صفات میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

"گنجے فرشتے" کا پہلا مضمون "میرا صاحب" ہے۔ اس میں قائد اعظم کا شوفر اپنی زبان میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ شوفر محمد حنیف آزاد ہے۔ اس مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک عقیدت و احترام کا بڑا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا تھا۔ کہ منٹو شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کا مزید ثبوت ملتا ہے۔

منٹو بمبئی کے نگار خانوں میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ایسی کہانیاں لکھ چکا تھا۔ جو مقبول ہوئیں تھیں۔ مکالمات قلمبند کر چکا تھا۔ سیناریو لکھ

بہت تعجب کی بات ہے کہ اس کتاب کے لئے اس نے اتنا کچھ جو اس کے افسانوں سے حاصل کیا۔ پانچ ناولٹ میں اس کی فلمی کہانی "بڑی سرکار" پوری تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کہانی کا موضوع یہ ہے کہ ایک نواب صاحب ہیں بڑی سرکار، جنہوں نے جوانی میں وہ سب کچھ کیا جو نوابزادہ کو کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ ایک مالی کی بیوی سے بھی عشق فرما لیا تھا۔ ان کے صاحبزادے ہیں چھوٹی سرکار۔ وہ باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں بلکہ شباب کی اب عمر کی اس منزل پر ہیں کہ چھوٹی سرکار کو محبت کے جال میں شکار پھانستے دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں اور بس۔ بڑی سرکار کا مالی ایک لڑکی کا باپ ہے جس کا نام چنبیلی ہے۔ دراصل یہ لڑکی بڑی سرکار کی ہے جو مالن کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ مرتے وقت مالن نے خاوند کو حالات کی صحیح صورت سے مطلع کر دیا تھا اور اس کی تمنا ظاہر کی تھی کہ اس لڑکی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ لیکن مالی کے دل میں شیطان جاگ پڑا۔ اس نے بڑی سرکار کی لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر پالا اور جب سیانی ہوئی تو چھوٹی سرکار کو موقع دیا کہ اس بچی سے بھی وہی کھیل دہرائیں جو ان کے باپ نے مالی کی بیوی سے کھیلا تھا۔ یوں مالی نے خوفناک قسم کا انتقام لے کر اپنے دل کی آگ بجھائی۔ اس کہانی کا موضوع ایسا ہیبت ناک تھا کہ اگر منٹو چاہتا تو چھوٹی سرکار، بڑی سرکار، مالی، مالن اور اس کی لڑکی چنبیلی، انھی کرداروں کے اردگرد تمام واقعات گھوم جاتے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس تیس صفحے کی فلمی کہانی میں بڑی سرکار کے منشی کا لڑکا گلاب ہیرو ہے اور خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کنگا بی ہیروئن ہے۔ جیسا کہ ڈرامے کے نام سے ظاہر ہے۔ یوں بھی واقعات کے ارتکاز کے اعتبار سے یہ کھیل میلو ڈرامہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میلو ڈرامہ بھی کمزور سا ہے۔ کنگا بی اور بگو کی داستان معاشقہ جو چھوٹی اور بڑی سرکار کی ہوس رانیوں کے متوازی چلتی ہے بالکل بیکار تو نہیں۔ آخری سین میں گلاب اور چنبیلی کی تصویر میں جو مشابہت ہے اس کا ذکر کر کے منٹو نے کنگا بی کے رعایا کو بھی ڈرامے کا ضروری جزو بنا دینا چاہا ہے لیکن بات بنی نہیں۔ یوں بھی ڈراموں میں منٹو کی زبان میں وہ صناعانہ اختصار جو ایجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہونا چاہئے، موجود نہیں۔ زبان روزمرہ کی ہے۔ یہ تو خیر کوئی عیب نہیں لیکن نقص یہ ہے کہ جو چیز زبان کلام ہوتی ہے اس پر منٹو زیادہ توجہ صرف نہیں کرتا۔ چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار کی کوئی واضح تصویر بھی پڑھنے والے کے ذہن میں نہیں ابھرتی اور کردار اگرچہ ڈرامے میں برابر حرکت رہتی ہے لیکن اس کے ہاں رست بے جان ہے۔ اس کے مقابلے میں چنبیلی جیتی جاگتی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کا معاشقہ اس معاملے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے جو آغا حشر کے ڈراموں میں دوسرا متوازی پلاٹ رکھتا تھا۔ کنگا بی کی داستان خارج کر دینے سے اصل ڈرامہ کسی طرح متاثر نہیں ہوتا۔ ڈرامہ جہاں ایک لفظ بھی فالتو نہیں ہوتا منٹو نے پوری داستان کی داستان فالتو لگا دی ہے۔ پھر بھی اس کھیل میں ان انگریزی فلموں کے مناظر کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے جو خانہ بدوشوں کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا سردار ڈمرو وہ تمام باتیں کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کی توجہ اس کے حیرت انگیز کردار کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ اس کے پاس ایک بانسری ہے جس کے تار نہیں۔ گھڑی ہے جس کی سوئیاں نہیں۔ لیکن اس کے باوصف وہ کسی انگریزی فلم کا سلولائیڈ کا ٹکڑا ہے جسے منٹو نے کسی انگریزی فلم سے نکال کر یہاں چپکا دیا ہے۔

یہی موضوع اگر منٹو اپنے افسانے کے لئے انتخاب کرتا تو آپ دیکھتے کہ کیا صورت پیدا ہوتی۔

منٹو کے ڈرامے "کریا پائی" میں بھی یہی بات ہے کہ منٹو الفاظ کو نہایت اختصار استعمال نہیں کرتا۔ ان میں سے کبوتری خالص میلو ڈرامہ ہے لیکن منٹو نے اس میں کچھ (PROBLEM PLAY) کا سا انداز پیدا کر دیا ہے۔ اس ڈرامے کی ہیروئن درگی ہے۔ جس پر ایک لال لال آنکھوں والا کمبل پوش مرتا ہے۔ درگی کی شادی ایک تھانیدار سے ہوتی ہے اور اسے آخری سین میں کوئی گولی سے مار ڈالتا ہے۔ یہ اشارہ ملتا ہے کہ قاتل تھانیدار خود ہے لیکن کمبل پوش عاشق قتل کا اعتراف کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منٹو کے خیال میں درگی کو دو آدمیوں نے قتل کیا ہے۔ اس کے جسم کو اس کے شوہر تھانیدار نے جسے شبہ ہو گیا تھا اس کی کبوتری کسی کمبل پوش کے من میں بھی بستی ہے۔ اور اس کے وجود معنوی کو کمبل پوش نے جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرتا ہے کمبل بھی علامتی اہمیت کا حامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق کے متعلق یہ دریافت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ "انتظار کا دوسرا رخ" کئی بار پڑھنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا۔ ایک لڑکی بلقیس نے ساڑھے آٹھ بجے کسی سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کی ماں اسے روکنا چاہتی ہے

نسیمہ [illegible] کی مدد سے بہلا پھسلا کر آخر گھر سے نکل جاتی ہے۔ دوسرے منظر میں جس سے ملنے کے لئے نکلی ہے اس کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ لڑکا ہے وہ چلا گیا ہے یا گھر پہ ہی ہے۔ اس میں بھی وہی (PROBLEM PLAY) کا سا رنگ ہے لیکن (PROBLEM) یا مسئلہ کوئی نہیں۔

اس ڈرامے میں "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" نہایت سلجھی ہوئی اور ستھری ذہنی تخلیق ہے۔ اس میں نعیم ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نوجوان (جو تنقید نگار ہیں) اس مہذب آدمی کی علامت ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں سے آزاد ہے (مختلف جگہوں سے نکالا جاتا ہے۔ باغ میں بیٹھنا چاہتا ہے تو باغ کا [illegible] آڑے آتا ہے۔ ایک مجلس میں شریک ہونا چاہتا ہے تو دعوت نامے کی عدم موجودگی پریشان کرتی ہے۔ ایک کلب میں ایک لڑکی سے باتیں کرنا چاہتا ہے وہ اپنے پتا سے اجازت لینا چاہتی ہے (یہ لڑکی آج کل کی وہ پڑھی لکھی شائستہ لڑکی ہے جو اپنے حسن، اپنی شائستگی اور اپنی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ تعلیم کے لئے موٹر، حسن کے لئے کوٹھی اور شائستگی کے لئے سماج میں ایک اونچا مقام) آخر نعیم اپنے گھر پہنچتا ہے اور نوکر سے کہتا ہے کہ یہاں تو نہ آسمان میرا ہے نہ زمین نہ ہوا اور پانی۔ آخر وہ ایک طوائف کے ہاں پہنچتا ہے جس کے بالاخانے سے "پیا بن نا ہیں آوت چین" کے بولوں کی آواز آتی ہے (طوائف، زندگی سے گریز کی علامت ہے۔ مامن ہے جہاں انسان پناہ لینا چاہتا ہے لیکن خود طوائف اپنے پیا کی منتظر ہے) اس سارے کھیل میں مکالمات کا اختصار، کرداروں کا تشخص اور کرداروں کی علامتی اہمیت کی طرف اشارے منٹو کی مہارتِ فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوصف میرا خیال ہے کہ یہی چیز منٹو افسانے کی صورت میں لکھتا تو اس سے یقیناً بہتر لکھتا۔ آخری ڈرامہ "ہتک" منٹو کے اسی نام کے مشہور افسانہ پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ طوائف کے اندر بھی ایک خوددار عورت چھپی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر پوڈر کی کتنی تہیں کیوں نہ چڑھ جائیں لیکن نیچے رگوں میں خون حرکت کرتا ہے جو وقت آنے پر کھول بھی سکتا ہے۔ ڈرامے اور افسانے کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ جو نفاست اور جو فنکاری افسانے میں ہے وہ ڈرامے میں نہیں۔

منٹو کے افسانوں پر تبصرہ ایک نہایت مفصل مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے اس مضمون میں زیادہ تر "گنجے فرشتے" کے مطالب اور ان کی اہمیت سے بحث کرنا تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ منٹو کا ذکر ہو اور اس کے افسانوں کے متعلق کچھ نہ کہا جائے تو یہ عجیب و غریب بات ہوگی۔

منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلال ہیں، مولوی ہیں، استاد ہیں، پہلوان ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں، قریب قریب ہر معاشری طبقے کے افراد منٹو کے افسانوں میں ملیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرت کو منٹو نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے افراد کم و بیش، منٹو کے حمام میں سب ننگے ہیں۔ وہ متوسط الحال طبقہ ہے جو غریبوں اور امیروں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک رہتا ہے۔ اس طبقے میں سے کچھ اوپر کے طبقے میں چلے جاتے ہیں اور نودولتے کہلاتے ہیں۔ کچھ نیچے اترتے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں: مزدور، کسان، کلرک وغیرہ۔ منٹو کے افسانوں میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اسے اپنے معاصروں سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی ایسی چیز کو افسانے کا موضوع نہیں بناتا جس کے کیف و کم سے وہ بخوبی آگاہ نہ ہو۔ اس کی حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ، اس کے ذہن میں واقعات کا تحفظ، اس کی تیز بینی، یہ چیزیں اسی سلسلے میں نظر آتی ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں۔ ذہنی طور پر غالباً عہدِ حاضر کا سب سے زیادہ توانا اور صحت مند ادیب ہے۔ اس لئے ذہنی بیماری، نفسیاتی الجھن کو وہ فوراً پہچانتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو وہ اپنی ذات کی نسبت سے پہچانتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی ذات ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی بیماریوں کے لئے BYSTEM OF REFERENCE ہے۔ یعنی نظامِ نسبتی۔ (ہم کسی چیز کے متعلق تبھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ متحرک ہے۔ اگر ایک نظامِ نسبتی ایسا موجود ہو جس میں مسلمہ طور پر چیزیں ساکن بھی ہوں۔ ورنہ یہ کہنا ناممکن ہے کہ فلاں چیز ساکن ہے اور وہ متحرک) ذہنی الجھن اور نفسیاتی امراض کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے جبکہ ایک نظامِ نسبتی ان کے لئے بھی موجود ہو۔ منٹو اپنی ذات میں ایک مکمل نظامِ نسبتی تھا۔ اس لئے جہاں کہیں وہ نفسیاتی الجھن یا مرض کا ذکر کرتا ہے

نہایت شدت نگاہی سے کرتا ہے۔ جو عوام آسانی سے اپنی ذات میں نظر نہیں آتے۔ انھیں وہ ناصحت مند کیفیات تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ دل کے بھید بڑی آسانی سے پکڑ لیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ لکھتے وقت کوئی سماجی یا ثقافتی ممنوعات اس کے راستے میں کھڑی نہیں ہوتیں۔ اُس کے ہاں TABOOS یعنی ممنوعات ذہنی بالکل نہیں ہیں۔ پڑھنے والوں کی جھنجھلاہٹ اور پیچ و تاب کا اصلی راز اسی خصوصیت میں مخفی ہے۔ ان ممنوعات کو جب منٹو راستے سے ہٹاتا ہے تو جو لوگ ان کے سائے تلے یا ان کی دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے ان کو اپنی اس دنیا کے ستون لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چھتیں کانپتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور در و دیوار باہر کی طرف گر پڑتے ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں کو ننگے ہونے کا بے آسرا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ منٹو کو گالیاں دے کر اپنی شکست خوردگی کی خفت مٹاتے ہیں۔ تہذیب و تمدن، معاشرہ، ثقافت، یا سماج، جو چاہے کہہ لیجئے، اُن کے مفروضات، معتقدات، ظنیات اور توہمات کو منٹو ازسرِ نو پرکھتا ہے۔ اس طرح زندگی کی اقدار بھی پرکھی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ کچھ ظنیات اور ممنوعات کو ہی اقدار سمجھ کر تاریک حجروں میں رہتے تھے۔ ان کو میدان میں کھڑے ہو کر سورج کی روشنی میں اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔

یہ دو خصوصیات تو منٹو کی ایسی ہیں۔ کہ ان میں غالباً اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ایک اور خصوصیت بھی اُس کے افسانوں میں ہے۔ جو پچھلے سات آٹھ سال کے عرصے میں نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے افسانوں کے کردار اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ جسے اصطلاح میں (SPEAKING IN CHARACTER) کہتے ہیں۔ مشرقی ادب میں یہ خصوصیت بلاغت کا ایک جزو ہے۔ اور اس کے معنی ہیں۔ کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا۔ منٹو کے افسانوں میں پنجاب کے سکھ واقعی پنجاب کے سکھ ہیں۔ مراد آباد کے ظروف ساز نہیں ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں کوچوان واقعی گھوڑا ہانکتے ہیں۔ رنگینی نہیں فرماتے۔ ان کی بات چیت سے گھٹیا بیڑیوں ادھ جلی ماچسوں کی، مومی بتیوں کی، پسینے کی بو آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بھی "صنم خانے" ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی معناً یہ شعر پڑھ کر چابک پھٹکارتے ہیں کہ ؎

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ذرا ٹھہرو
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

منٹو

ابواللیث صدیقی

منٹو بھی عجیب آدمی تھا اور اتنا ہی عجیب افسانہ نگار، شروع شروع میں مجھے منٹو کی شخصیت اور اس کے افسانوں دونوں میں سے ہی سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ منٹو کے بعض افسانوں میں اس طرح کی گندگی تھی جس کا بظاہر کوئی مقصد نہ تھا سوائے اس کے کہ منٹو نے اس میں اپنی مریضانہ ذہنیت کا اظہار کیا تھا، اور یہ غلاظت محض جنسی قسم کی تھی اور مجھے اس اعتبار سے منٹو اور میراجی ایک دوسرے سے بہت قریب آتے نظر آتے تھے، کبھی میں یہ سوچتا کہ میراجی کے پاس جو تین گولے تھے اُن میں سے ایک گولہ خود منٹو تھا، اتنا ہی مبہم اور اتنا ہی دلچسپ۔

تقسیم کے بعد مجھے اکثر منٹو سے ملنے اور اس کے افسانے اسی کی زبانی سننے کا موقعہ ملا، اسی قسم کی ایک صحبت میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا، افسانے میں ایک اُجڈ سپاہی کا کردار تھا جو بات بات پہ گالی بکتا اور اکثر گالیاں خاصی مغلظات تھیں، لوگ منٹو پہ برس پڑے، اس نے بار بار سمجھانے کی کوشش کی گالی منٹو نے نہیں بکی، اس سپاہی نے بکی، یہ جہاں آپ کو ہاتھ لگے آپ اس کی تواضع کریں، منٹو نے تو صرف اسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں بھی ہیں، آپ اس گالی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لئے آمادہ نہیں، آپ کا جی چاہے آپ گالی دے لیں لیکن افسانے کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں، میں سمجھتا ہوں منٹو نے ٹھیک کہا تھا، بلاشبہ اس کے بعض افسانوں کے موضوعات ایسے جنسی مسائل ہیں جو ہمارے ادب اور معاشرہ میں ابھی "ممنوعات" ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض افسانوں میں محض لذّت لینے کی خاطر ایسے مسائل کی تشریح، ایسی تشبیہیں، استعارے، اور کنائے ملتے ہیں جن کا مقصد محض آتشِ شوق کو بھڑکانا اور بھڑکتے شعلوں سے اس آگ کو پھیلانا ہوتا ہے، کہیں وہ جزئیات نگاری میں ایسا عملِ جرّاحی کرنے لگتا ہے جیسے کوئی سرجن ہو، لیکن یہ عمل جرّاحی کسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ہو تو کوئی ہرج نہیں، منٹو اسے شارع عام پر کرنے لگتا ہے، کہیں منٹو علاج بالمثل اور کہیں علاج بالضد کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ وہ زہر کا علاج زہر سے کرنا چاہتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ زہر سے زہر کا علاج نہ ہر طبیب کے بس کا ہے اور نہ ہر مریض پہ آزمایا جا سکتا ہے، اور منٹو جیسے شرابی کیلئے ان حدود کا لحاظ رکھنا ممکن

دلتا، لیکن ان سب باتوں کے علاوہ منٹو کے یہاں کچھ اور بھی ہے اور اس "کچھ اور" نے منٹو کو بحیثیت افسانہ نگار نہ سہی بحیثیت افسانہ نگار ایک مرتبہ بخشا ہے۔

اپنے افسانوں کے بارے میں منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیئے، اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے ——" اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے کیونکہ منٹو کے علاوہ اور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تحریروں کا جائزہ لیجئے تو یہ نقص اور بھی کہیں کہیں مل جائے گا، میراجی کی شاعری کا بڑا حصہ، راشد کی بعض چیزیں، اسلام مچھلی شہری کی بعض نظمیں، عصمت چغتائی کے بعض افسانے اس طرح کے ہیں جو بہت سے لوگوں کے لئے "قابلِ برداشت نہیں"۔ یہ سچ ہے کہ ان میں ایک طرح کی فرسودگی اور مریضانہ ذہنیت پائی جاتی ہے لیکن اس صورتِ حال اور نفسیاتی کیفیات کے پیدا ہونے کی ذمہ داری اس ماحول پر ہے جن میں ان لوگوں کی نشو و نما ہوئی۔ ان کی تہہ میں ایک طرح کی بھوک، ایک تشنگی اور محرومی جھلکتی ہے اور جب ان چیزوں کی تسکین کے فطری ذرائع مسدود ہوتے ہیں یا ان کی راہوں میں روڑے اٹکتے ہیں تو یہ پھر اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر لیتی ہیں۔ اور یہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اُردو شاعری میں امرد پرستی، معاملہ بندی یا بقول میر چوما چاٹی اسی ذہنیت کی ترجمان ہے۔ نظیر جیسا شاعر جس کے یہاں فنی شعور کی معراج تک پہنچنے کے امکانات سب سے زیادہ تھے، اس کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے اور آج تک اس کی سزا پا رہا ہے۔ تو ظاہر ہے آج کے زمانے میں جب "شستہ کلامی، صحت، اور نفاست پسندی" ہمارے ماحول میں آبِ حیات کی طرح ظلمات کے ہزار پردوں میں چھپی ہو، ان لوگوں کو کیسے میسر آ سکتی تھیں۔

ایک بات آپ ضرور کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ اس طرح کے لکھنے والے بیماریوں کی تشہیر کرتے ہیں، غلاظت کے ڈھیروں پر سے خس و خاشاک کے غلاف اُتار کر پھینک دیتے ہیں لیکن ان بیماریوں کا علاج نہیں بتاتے، اس غلاظت کو پیدا ہونے سے روکنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے، یہ خامی ان میں البتہ ہے، یہ مجتہد اور مصلح نہیں ہو سکتے، اس کے لئے ان کے پاس ساز و سامان نہیں۔

لیکن میں منٹو کے افسانوں کے اس پہلو پر زیادہ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کے لئے بعض بنیادی طویل بحثیں درکار ہیں، ہم کس چیز کو فحش کہتے ہیں، کیا "فحش" کا تصور کوئی بنیادی تصور ہے یا محض اضافی ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جنس کے ساتھ فحش کا تصور کب اور کیوں وابستہ ہو گیا۔ ایک فطری فعل اور اس میں شریک بعض اعضا کی نمائش اور ان کا ذکر کب اور کیوں ایک گناہ سمجھا جانے لگا، یہ بحثیں ہمیں معاشرتی ارتقا، مذہب اور اخلاق کی تاریخ اور نفسیات کی پُرپیچ راہوں پر لا ڈالیں گی جس کا یہاں موقع نہیں، شاید اس سے یہ بھی غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ میں منٹو کی فحش نگاری کی معذرت پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت میرا مقصد یہ نہیں میں منٹو کے افسانوں کو صرف افسانوں کے فنی معیار سے دیکھنا چاہتا ہوں، ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو فحش ہیں اور ایسے بھی جو فحش نہیں ہیں۔ اس بحث میں میرے سامنے منٹو کے تین مجموعے ہیں "منٹو کے افسانے"، "دھواں" اور "سرکنڈوں کے پیچھے"۔

"منٹو کے افسانے" میں پہلا افسانہ "نیا قانون" ہے۔ منگو کوچوان جو سیاست داں اور لیڈر نہیں صرف ایک کوچوان ہے انگریزوں سے نفرت کرتا ہے، اس لئے نفرت کرتا ہے کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں، طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں اور منگو کوچوان کو ستاتے ہیں، شرابی گوروں سے اس کا اکثر جھگڑا ہوتا ہے اور ایک روز منگو کوچوان کو خبر ملتی ہے کہ نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی، اُستاد منگو نے لینن اور کارل مارکس کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ لیکن وہ "ردّم والے بادشاہ"

مداری کے قانون اور دوسری نئی چیزوں کو بہت پسند کرتا تھا اور اس نے ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں کو "روس والے بادشاہ" کے تخیل سے وابستہ کر دیا، نئے قانون کے نفاذ کا دن آگیا اور استاد منگو کے دل میں نئی امنگوں نے کروٹ لی، اب وہ گوروں سے نہیں ڈرے گا، استاد منگو کی ملاقات ایک شرابی گورے سے ہوئی جو پہلے ایک مرتبہ اس سے جھگڑا کر چکا تھا، آج بھی جھگڑا ہوا۔ لیکن نیا قانون ہو چکا تھا، گورے کی بید کی پالش کی ہوئی چھڑی استاد منگو کی ران سے چھوئی اور اس کے جواب میں استاد کا گھونسا گورے کے منہ پر جم گیا۔ وہ گورے کو پیٹ رہا تھا، وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے، اب نیا قانون ہے نیا قانون۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ـــــ قانون وہی پرانا ہے"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس افسانے میں منٹو کا کوئی کمزور پہلو نہیں اُبھرتا۔ یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے جس میں ہماری آرزوئیں اور اُمنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں۔ اور فنی معیار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ نہ بکھرا ہو، بات سے بات نکل کر طوالت نہ پیدا ہو جائے، مرکزی خیال ایک رہے، کردار، واقعات اور مکالمات بھی ایک خیال کو اُجاگر کرنے اور تاثر میں شدت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں، یہ بات بھی یہاں پوری طرح حاصل ہو گئی ہے۔ کردار صرف ایک ہی ہے، استاد منگو، واقعات اور مکالمات / مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار، لیکن اس ایک محور پہ مشاہدہ اور مطالعہ کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا، مگر اُسے ہر چیز پرانی نظر آئی ـــ آسمان کی طرح پرانی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پہ جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں، یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی ـــــ"

مختصر افسانہ میں جزئیات نگاری کا موقع نہیں ہوتا لیکن چابکدست افسانہ نگار مختصر اشاروں میں بھی جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیتا ہے۔ استاد منگو کی ملاقات گورے شرابی سے ہوتی ہے اور وہ تانگہ ٹھہرا کر پچھلی نشست پہ بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھتا ہے۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

"اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا، اور پاس ہی کے گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔"

اس طرح کی مثالیں اور افسانوں میں بھی ملتی ہیں :-

"ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی اونچی ایڑیوں کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں.....

یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے۔"

اسی مجموعے میں ایک اور افسانہ "ہتک" ہے، اس میں بھی اس طرح کی جزئیات نگاری کی مثالیں موجود ہیں اور پھر یہ ایک ہی مجموعے پر

منحصر نہیں۔ سارے مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔

عام حالات میں اس تکنیک سے افسانہ نگار بڑا فائدہ اُٹھا سکتا ہے لیکن منٹو جہاں بعض اعضا اور اعمال و افعال، حرکات و سکنات کے بیان میں اسے استعمال کرتا ہے وہاں قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ منٹو دراصل صرف مزے لے لیکر اسے لکھ رہا ہے۔ اس کا مقصد لذتیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ دھواں، بلاؤز، کالی شلوار، مصری کی ڈلی، ممد بھائی، خوشیا اور مسز ڈی کوسٹا پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے، یہ نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ویسے اُردو میں یہ روایت نئی نہیں، مولوی نذیر احمد کے یہاں کم از کم توبۃ النصوح میں اس کی دو مثالیں نصوح اور کلیم کے کرداروں کی تخلیق میں موجود ہیں اور پھر یہ سلسلہ مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا سے ہوتا ہوا ہمارے زمانے تک پہنچتا ہے۔ مختصر افسانے میں یہاں بھی تفصیلات کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن اشاروں اور کنایوں میں کرداروں کی ذہنی کیفیات اور ان کے ردِ عمل کا جائزہ لے لیا جاتا ہے۔ منٹو کے کردار طرح طرح کے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے وہ طبیب نہیں کہ نفسیاتی بیماریوں کا علاج تجویز کرے لیکن اس کی نظر ان بیماریوں پر ضرور ہے۔ اس طرح کی ایک مثال منٹو کے بدنام افسانے دھواں میں ملتی ہے۔ اس افسانے میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماں باپ کے تعلقات کا اثر نوجوان اولاد پر کس طرح ہوتا ہے۔ منٹو نے یہاں بات اشاروں میں کی ہے جس کا وہ کم عادی ہے لیکن بات صاف ہو گئی ہے:-

"اِدھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے، بارش اب رُک گئی تھی، مسعود نے ہاکی اور گیند نکالا اور صحن میں کھیلنا شروع کیا ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی، اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی، کون، جی میں ہوں مسعود، اندر سے آواز آئی کیا کر رہے ہو۔ جی کھیل رہا ہوں۔ کھیلو، پھر تھوڑے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔ زیادہ شور نہ مچانا۔"

ماں باپ کا سر دبا رہی ہے۔ وہ خود تھوڑی دیر پہلے اپنی بہن کی کمر دبا چکا تھا، اور دوسرے لمحے اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا، اس کی بہن کلثوم اور اس کی سہیلی بملا.... اس افسانے میں بلاشبہ نفسیات فاسدہ کا مطالعہ ہے، اور پڑھنے والے کو ایک جگہ تو کچھ گھن سی محسوس ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک خاص ماحول کی وجہ سے ہمارے یہاں صحت مندانہ جنسی تعلیم کا امکان نہیں اور اسی لئے اس طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ممد بھائی بھی اسی طرح کا ایک افسانہ ہے اور مصری کی ڈلی میں بھی تحت شعور میں یہی مسئلہ ہے۔

طوائفوں اور عیاش عورتوں کے نفسیاتی مطالعے منٹو کو خاص طور پر بہت مرغوب تھے، منٹو نے جس طرح کی زندگی خاص طور پر پونہ، دہلی اور بمبئی میں گذاری تھی اس نے منٹو کو ان طبقوں کے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا تھا۔ اس کی ایک مثال خوشیا میں ملتی ہے، خوشیا ایک پیشہ ور دلال ہے، اسے علاقے کی چھوکریوں کا سارا حال معلوم ہے۔ لیکن کانتا جب اس کے سامنے بالکل ننگی چلی آتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیونکہ اسکی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا۔ یہاں سے قصے کا تانا بانا شروع ہوتا ہے اور خوشیا کا کردار پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی مطالعوں کے سلسلے میں نعرہ، بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ کیشو لال ایک سیٹھ کے مکان میں کرایہ دار ہے۔ برسوں کرایہ ادا کرتا رہتا ہے۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور سیٹھ اسے گالی دیتا ہے۔ اس گالی کو سن کر کیشو لال پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا منٹو نے بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے اور بلاشبہ یہ افسانہ منٹو کے اس طرح کے دو کر

سالوں کے مجموعے بابو گوپی ناتھ، پاک اور مثالی افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں، 'ہتک' اور 'کالی شلوار' بھی اسی طرح کے افسانے ہیں۔

ایک اور عنصر جو منٹو کی تمام تحریروں میں جاری و ساری ہے طنز ہے۔ ایسا بھرپور طنز جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا، جس میں تندی بھی ہوتی ہے اور تلخی بھی۔ اس طنز میں ہی منٹو کبھی کبھی ننگا ہو جاتا ہے لیکن وہ کیا کرے، جن زخموں کو وہ دکھانا چاہتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے جسم پر صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور رِس رِس کر ناسور بن چکے ہیں، ہم ان کا علاج کرنے کی بجائے انھیں کپڑوں اور تمغوں میں چھپانا چاہتے ہیں، اور اس طرح خود فریبی کا شکار رہتے ہیں۔ ہم نے اخلاق اور شرافت کا ایک معیار بنا رکھا ہے، لیکن ہمارا مسلّمہ اخلاق اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اور ہم صرف کپڑوں اور نعروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے منٹو کا افسانہ 'ہتک' پڑھا ہے وہ اس زخم کو دیکھیں جو طوائف کہلاتی ہے۔ اب یہ موضوع نیا نہیں رہا۔ نذیر احمد کی ہریالی سے مرزا رسوا کی امراؤ جان اور قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ تک ہم اپنے افسانوی ادب میں اس کے بہت سے روپ دیکھ چکے ہیں۔ نذیر احمد بے چارے مولوی تھے، یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے ایک طوائف کو ادب کے مقدس ایوان میں آنے کی اجازت دے دی، یہ اور بات ہے کہ انھیں اپنے اس کردار سے آخر تک مولویانہ کدر رہی ہے۔ امراؤ جان ادا بڑی متعلین قسم کی طوائف ہے، اس کی شاعری، شستہ مذاقی، سخن فہمی، سخن سنجی، فقرے بازیاں، اس کے ٹھاٹ باٹ سب کچھ لکھنؤ کے تعلقہ داری نظام کا ایک جزو معلوم ہوتے ہیں۔ امراؤ جان ادا آج کی طوائف نہیں، یہی حال قاضی غفار کی لیلیٰ کا ہے۔ اس میں رومان اور شاعری زیادہ ہے لیکن منٹو کی طوائف کے یہاں رومان اور شاعری کی جگہ زندگی کی وہ تلخ حقیقت ہے جس سے طوائف دوچار ہے اور یہ تلخی منٹو کے افسانے 'ہتک' میں سوگندھی کا کردار بن کر پوری طرح نمایاں ہوتی ہے، سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن ایک عورت بھی اور اس عورت کو طوائف بننے پر کس نے مجبور کیا؟ وہ عورت جو بہن بن سکتی ہے۔ ماں بن سکتی ہے۔ بیٹی بن سکتی ہے اس روپ میں کیسے آ جاتی ہے؟ 'ہتک' پڑھنے والا اسی سوال کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اور 'ڈرپوک' پڑھتے وقت بھی یہی طنز بار بار ابھرتا ہے۔ 'بابو جیون' کا قحبہ خانہ صرف منٹو کے ذہن کی تخلیق نہیں ہمارے آس پاس کہیں موجود ہے لیکن ہمارے دلوں میں چور ہے اس لئے ہم اس سے نظر بچا کر گزر جاتے ہیں، اسی طرح کے کردار منٹو کے افسانے 'دس روپے' میں بھی موجود ہیں۔

منٹو کی کردار نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سارے کردار محض اس کے تخیل کی پیداوار نہیں اس لئے اپنے مطالعہ اور مشاہدے سے انھیں اچھے برے افسانوں کی اس بھیڑ میں سے چھانٹ لیا ہے جن میں ہم سب کھو جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا کام محض مطالعہ اور مشاہدہ نہیں، انتخاب بھی ہے اور منٹو انتخاب کے معاملے میں ایک ہوشیار فن کار ہے۔ اس کے کردار ناٹک کی اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے، بلکہ وہ تو اپنے جسم پر سے لباس بھی اتار پھینکتے ہیں کہ ہم ان کے خط و خال، ان کے ولآویز خطوط اور ابھار، یا پھر رستے ہوئے ناسور اور سڑتے ہوئے زخم بھی دیکھ لیں، ان کی گفتگو بھی ایسی ہی بے تکلف اور برجستہ ہوتی ہے۔ گالی بکنے والا کردار گالی ہی بکتا ہے، موقع بے موقع اقبال کا شعر نہیں پڑھ سکتا، اور معلوم نہیں کیوں منٹو کو اپنے افسانوں میں شعر استعمال کرنے سے ایک طرح کی چڑ سی معلوم ہوتی ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو کے کرداروں کی دنیا میں زندگی کے تلخ حقائق شعر و شاعری پر غالب آ گئے ہیں۔

میں نے منٹو کے جن افسانوں اور کرداروں کا ذکر کیا ہے اُن سے منٹو کے افسانوں کے موضوعات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ موضوع آس پاس کی زندگی ہے۔ اس میں دیہات کی رومان پرور فضا کی جگہ وہ بارونق شہر ہیں جہاں منٹو نے زندگی کو گناہوں میں ڈھلتے دیکھا تھا، اور اس طوفان میں اس کی حیثیت اس تماشائی کی سی نہیں تھی جو ساحل سے کھڑا طوفانی لہروں کا مشاہدہ کرتا ہو، وہ خود اس طوفان میں کود پڑا تھا، طوفانی موجوں اور بپھری ہوئی لہروں کا رُخ موڑنے کی طاقت اس کے کمزور جسم اور نحیف بازوؤں میں نہ تھی اس لئے وہ ان موجوں اور لہروں کے ساتھ بہتا چلا گیا اور بالآخر ایک بہت بڑی طوفانی موج نے اسے ایسے ساحل پر پہنچا دیا جہاں کے طوفانوں کا کسی کو پتہ نہیں۔

منٹو کی حقیقت نگاری

عبادت بریلوی

منٹو اُردو کا سب سے بڑا نہیں، تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے ــــ اُس نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور بہت بُرے بھی ــــ اس کے یہاں بلندی اور پستی، روشنی اور تاریکی، سب سے بہ یک وقت دوچار ہونا پڑتا ہے ــــ اس کیفیت کو مجموعی طور پر اس کی خامی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پستی اور بلندی کا یہ تضادت فکر و فن کو استواری سے محروم کر دیتا ہے ــ لیکن منٹو کے یہاں اس خامی میں ایک خوبی بھی نظر آتی ہے ــــ اور وہ خوبی یہ ہے کہ منٹو نے زندگی کے بُرے اور بھلے، صاف اور کثیف، ہر پہلو کو دیکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اُس کے تمام اسرار و رموز کھل جاتے ہیں اور سارے نشیب و فراز آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں ــــ منٹو کی خوبی یہ ہے کہ جو باتیں اس کے یہاں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہیں، ان میں بھی زندگی کی حقیقت کا کوئی نہ کوئی رُخ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے ــــ زندگی کے مختلف حقائق تک اس کی نظر بڑی بے باکی اور دراکی کے ساتھ پہنچتی ہیں، اور ان کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں ــــ منٹو اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا ــــ اُس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اسی لئے انسانی زندگی اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام تنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں ــــ اسی کو اُس کی حقیقت نگاری کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت نگاری کا ادبی تنقید میں آج جو صحیح مفہوم ہے، وہ پوری طرح تو منٹو کے افسانوں میں نہیں اُبھرتا ــ کیونکہ زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر جس کو موجودہ دَور میں حقیقت نگاری کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، وہ منٹو کے افسانوں میں نہیں ہے۔ منٹو نے زندگی کو دیکھا ضرور ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس سلسلے میں ان معیاروں اور قدروں کو اُس نے اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ جن کے ہاتھوں نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات کی تشکیل ہوتی ہے ــــ اسی لئے منٹو کے افسانوں میں کوئی مخصوص فکر و فلسفہ نہیں ملتا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس کو کس سانچے میں ڈھالنے اور کس شیشے میں اتارنے کا خواہشمند ہے ــــ اس کو منزل کا علم نہیں ہے۔ وہ تو صرف راستے کا ایک مسافر ہے اور سفر ہی کو اپنی منزل سمجھتا ہے ــــ منزل سے بے نیازی اور صرف راستے پر گامزن رہنے کی خواہش نے منٹو کو اس کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے سارے اسرار و رموز اس پر روشن ہو گئے ہیں ــــ چنانچہ اس سفر میں زندگی کے اَن گنت پہلو اُس کے سامنے

ئے ہیں ـــ اس نے ان سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اور انہیں سے اپنے فن کی محفل سجائی ہے ـــ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل اور جزئیات موجودہ افسانہ نگاروں میں جیسی منٹو کے یہاں ملتی ہیں، کسی اور کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتی ـــ اس لئے نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات نہ ہونے کے باوجود اور معیاروں اور قدروں کے نہ ہونے کے باوصف اس نے زندگی کے حقائق کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے یہاں خود بخود زندگی پیدا ہو گئی ہے ـــ اس زندگی میں جو کچھ بھی ہے، جو کچھ بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تھا، جو کچھ بھی ہونا چاہئے، منٹو اس کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے کا فن کار ہے ـــ یہی اس کی واقعیت ہے ـــ یہی اس کی حقیقت نگاری ہے ـــ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقت نگاری کا یہ تصور جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جائے ـــ کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے ماضی اور حال کے حقائق کی تفصیل و جزئیات موجود ہیں۔ مستقبل کا احساس بھی اس میں ہوتا تو اس کی تکمیل ہو جاتی لیکن منٹو نے ماضی اور حال کی مصوری میں کمال دکھایا ہے اور اس سلسلے میں جس طرح مختلف رنگوں کی آمیزش سے اپنی پیش کی ہوئی تصویروں میں زندگی کی بجلیاں بھری ہیں، وہ مستقبل کے خیال کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے ـــ لیکن ماضی اور حال کے مختلف پہلوؤں سے زندگی کے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں ـــ منٹو نے ان حقائق کو ایک فوٹوگرافر کی طرح پیش نہیں کیا ہے، بلکہ ایک مصور کی طرح ان کی تصویریں بنائی ہیں اور مرقعے تیار کئے ہیں ـــ اسی لئے حقیقت نگاری کے موجودہ مفہوم سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہونے کے باوجود منٹو کی یہ ترجمانی حقیقت نگاری معلوم ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی کی ہے، اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ بعضوں کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے ـــ خصوصاً وہ لوگ اس سے ذرا بھی متفق نہیں ہو سکتے جو بعض اصول اور نظریات کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک تو منٹو کو زیادہ سے زیادہ ایک واقعیت نگار یا فطرت نگار (NATURALIST) کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جن میں اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے بس ہو بہو اسی طرح پیش کر دیا ہے ـــ اپنی طرف سے کوئی خاص بات نہیں کہی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو منٹو کے افسانوں کے بارے میں یہ خیال پوری طرح صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا خاص میدان واقعیت نگاری رہا ہے۔ زندگی جس روپ میں بھی اس کے سامنے آئی ہے، اس نے ہو بہو اس کو اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کو پیش کرتے ہوئے وہ کھل کر بہت کچھ نہ کہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے ـــ انسان اور انسانیت کی آواز جگہ جگہ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلو کا گہرا شعور نہیں رکھتا ـــ اس لئے اس کے یہاں انسان اور انسانیت کی آواز بڑی حد تک صدائے بازگشت (MERE ECHOES) بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا احساس اتنا شدید ہے، اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تخیل اتنا بلند ہے کہ وہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی نکال ہی لاتا ہے ـــ منٹو کے یہاں اس سلسلے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے۔ بڑی ہی جذب و شوق کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ایسا کرتے ہوئے ان حقائق کو بھی سامنے لاتا ہے جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی میں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ـــ منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا کوئی ایک مخصوص تصور نہیں ہے، بہت سے تصورات ہیں ـــ کہیں وہ زندگی کے سماجی اور عمرانی پہلوؤں کو حقائق کے روپ میں دیکھتا ہے، کہیں انسانی زندگی سے عام واقفیت اس کے یہاں حقائق کو رونما کرتی ہے۔ غرض اس کے یہاں حقائق کے مختلف روپ ہیں ـــ اس نے ان حقائق کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے ـــ مختلف پہلوؤں سے ان پر نظر دوڑائی ہے ـــ لیکن ان سب کی تہہ میں انسانی زندگی سے دلچسپی کا ایک خیال ضرور کار فرما نظر آتا ہے۔ یہی انسانی زندگی منٹو کے فن میں حقیقت و واقعیت کا رنگ بھرتی ہے۔ اور اسی کے سہارے اس کا فن حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کا بنیادی محور عام انسانی زندگی ہے۔ اس کے تمام موضوعات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے تمام خیالات کی بنیاد اسی انسانیت انسانی زندگی پر استوار ہے۔ منٹو اس دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ ہر حال میں وہ اسی کو اپنے سامنے رکھتا ہے ـــ انسانیت اس کے

نزدیک ترقی سے عبارت ہے۔ اس لئے وہ ہر انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتا ہے ـــ اس نے ایک جگہ لکھا ہے "ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے، یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان نہیں ہے ـــ یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیئے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صنعت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ خود ترقی نہیں چاہتے ـــ" یہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا طالب رہا ہے۔ اور ترقی سے اس کی مراد انسان اور انسانیت کی تکمیل ہے ـــ یہ جذبہ اس کے یہاں برابر کارفرما رہتا ہے ـــ البتہ اس جذبے کے اس کے یہاں مختلف روپ ہیں ـــ کہیں انسانیت کا سدھار ہے، کہیں انسانی جذبات کی تہذیب ہے، کہیں انسانی روابط کی اہمیت کا احساس ہے، کہیں انسانی رشتوں کی ضرورت کا خیال ہے ـــ کہیں انسانی زندگی کی کمزوریاں ہیں، کہیں اس کی خامیاں ہیں، کہیں اس کی بے راہروی ہے، کہیں بے عنوانی ہے ـــ کہیں اس کی بے بسی ہے، مجبوری ہے ـــ غرض انسانی زندگی کے ان گنت روپ منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کئے ہیں ـــ

انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے میں منٹو کے یہاں جو رنگا رنگی ملتی ہے، وہ بدلتے ہوئے حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے ـــ منٹو تبدیلی کے عمل کا قائل ہے۔ وہ تغیر کے قانون پر ایمان رکھتا ہے ـــ اس کے خیال میں حالات کی یہی تبدیلی ادب اور فن کو تغیرات سے ہمکنار کرتی ہے ـــ ایک دور کا ادب دوسرے دور کے ادب سے اسی لئے مختلف نظر آتا ہے ـــ اس کے خیال میں "حالات کا اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آسکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے کا شاعر اپنے اصیل مرغ کی جوانا مرگی پر زوردار نظم لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانا مرگی کے نوحے لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غیر مطمئن ہے۔ اس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی ـــ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے؟ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیئے؟ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں ـــ عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور فکر خیز ہیں" ـــ اس لئے اس نے ان عورتوں کے بارے میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ اور عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کر دیا ہے ـــ اس سلسلے میں اس کی حقیقت نگاری کا ثبوت یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر وہ عورت سے متعلق محض جذباتی اور رومانی پہلوؤں ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ـــ اس سے ماورا ہو کر اس کی زندگی کے بڑے ہی تلخ پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کرتا ہے ـــ چنانچہ عورت اس کے یہاں طوائف کے روپ میں بھی آتی ہے ـــ لیکن یہ طوائف تعیش کا ذریعہ اور وسیلہ نہیں رہتی، ایک بھیانک صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ منٹو اس کی زندگی کے تلخ اور تاریک پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتا ہے ـــ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان پہلوؤں پر اس کی نظر زیادہ پڑتی ہے ـــ اور نسبتاً زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑتی ہے ـــ منٹو سیدھی سادی باتوں پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی نظریں تہ تک پہنچتی ہیں۔ اور وہ بڑی ٹیڑھی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی جدت پسند طبیعت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اہم پہلو تلاش کر لیتی ہے ـــ اس نے خود اس صورتِ حال کو واضح کیا ہے ـــ لکھتا ہے "جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن (قلم) نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ اسے دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے ـــ میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لئے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب

ہوتے ہوئے دوسری جگہ کی عورت اپنے خاوند سے مل کر، اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے تک سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اُسے زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔ مگر وہ لڑکا میری توجہ کو ضرور اپنی طرف کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے، جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ ——— اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی، اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا۔ اور دوسروں کو سناؤں گا ——— چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے۔ اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے ——— اُس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اُس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اُس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں ——— میں اُن کے متعلق لکھتا ہوں۔ اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، اُن کی صحت اور اُن کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں" ——— گویا انسان کیا ہوتا ہے، حالات اُسے کیا بنا دیتے ہیں، زندگی اس سے کیا کیا کچھ کراتی ہے، اُسے زندگی کو بسر کرنے کے لئے کن کن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے، منٹو کے یہاں ان سب کی طرف توجہ زیادہ ملتی ہے۔ اور اس غیر معمولی توجہ کا سبب یہ ہے کہ وہ زندگی کے مذمومات پر کڑھتا ہے ——— اس کی ناسازگار حالت پر آنسو بہاتا ہے ——— اسی لئے زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے اس کے یہاں نشتریت پیدا ہو جاتی ہے ——— اور اس نشتریت میں حالات کو سدھارنے اور ان کو کسی نئے سانچے میں ڈھالنے کا ایک دبا ہوا احساس بھی کارفرما رہتا ہے ——— اور یہی کیفیت اس کے فن کو حقیقت نگاری سے قریب کرتی ہے۔

منٹو زندگی کی تلخیوں اور اس کی خون آشامیوں کا فنکار ہے ——— اس کی لذتوں اور مسرتوں کا احساس اس کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے ——— زندگی کی ناسازگار حالت کے شدید احساس نے منٹو کو ان لذتوں اور مسرتوں کے احساس سے بڑی حد تک محروم کر دیا ہے ——— وہ مسرتوں کو دیکھتا ضرور ہے۔ لذتیں اُسے نظر ضرور آتی ہیں لیکن زندگی کی بے عنوانیوں کا شدید احساس، ان لذتوں اور مسرتوں سے اُسے مطلق نہیں سنبھلنے دیتا ——— اسی لئے اس کے افسانے بعض اوقات ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگتے ہیں ——— لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جن حالات کی ترجمانی اور جس ماحول کی عکاسی وہ کرتا ہے وہ خود ناقابلِ برداشت ہیں ——— اس نے خود لکھا ہے "زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے ——— مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں ——— میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے ——— میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی ——— میں اُسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے" ——— منٹو نے سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کو ننگا دیکھا ہے ——— اور اسی لئے اُسے ننگا دکھایا بھی ہے ——— اسی لئے لوگ اُسے دیکھ کر سٹپٹا بھی جاتے ہیں۔ ان میں گھبراہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے ——— لیکن اس حقیقت کا وجود اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ سوسائٹی ننگی ہے، تہذیب و تمدن برہنہ ہے ——— اس کو کپڑے پہنانے کا کام بھی منٹو کو اپنے ذمے لینا چاہیئے تھا۔ اس کام کو درزیوں کے سپرد کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے ——— بہرحال منٹو اس برہنگی کا فنکار ہے ——— اس لئے زندگی کے مذمومات پر اس کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے ——— وہ اس سلسلے کی تمام حقیقتوں کو معلوم کر لیتا ہے ——— اور اسی کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے یہاں رومانیت نام کو بھی نہیں ہے ——— اس لئے زندگی کی سنگینی اور تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا اس کا مزاج بنا ہوا ہے۔ شاید جدید افسانہ نگاروں میں وہ واحد فنکار ہے جس کے مزاج میں رومانیت کا اثر نہیں ملتا ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو تخیل پرست

ہے۔ وہ جو کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے اُسی کو اپنے فن کا موضوع بناتا ہے ـــــ خارجی حالات کو دیکھ کر جو باتیں اس کے ذہن میں آتی ہیں انھیں کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرتا ہے ـــــ منٹو نے اپنی طرف سے خیالی دنیا نہیں قائم کی ہیں ـــــ اپنی طرف سے اس نے بہت کم باتیں کہی ہیں ـــــ جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا ہے، وہ اُس کے لبوں پہ آگیا ہے اور اس کی تفصیل اس کے قلم سے افسانوں کی شکل میں ٹپک پڑی ہے ـــــ اسی لئے رومانی پہلو اس کے یہاں ذرا بھی نمایاں نہیں ہوتا ـــــ وہ شروع سے آخر تک زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کا ترجمان دکھائی دیتا ہے۔

یہ صورتِ حال منٹو کی بڑائی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ جس وقت اس نے لکھنا شروع کیا ہے، اس کے آس پاس اور گرد و پیش رومانیت و روایت خاصی مستحکم صورت میں موجود تھی۔ ہر چند کہ اس وقت تک جذباتی رومانیت کی اس تحریک کا خاتمہ ہو چکا تھا جس نے ایک زمانے تک شعر و ادب کے گیت گائے تھے لیکن اس کے بعد واقعیت کا جو نیا رجحان پیدا ہوا تھا، اس میں بھی رومانیت کا رنگ خاصا گہرا تھا۔ انقلاب کے تصورات تک اس زمانے میں جذباتی اور رومانی سے تھے ـــــ اس میں لکھنے والوں کے رومانی مزاج اور جذباتی رفتارِ طبع کو بڑا دخل تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی واقعیت اور حقیقت بھی رومانیت سے ملی جلی معلوم ہوتی تھی۔ افسانے میں اس رومانیت کے اثرات کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے ـــــ پریم چند نے اس رومانی روایت کے بت کو توڑا تھا لیکن ان کی یہ بت شکنی بتکدوں کا خاتمہ نہ کر سکی تھی۔ اس زمانے میں بھی رومانیت کی یہ روایت [illegible] آپ کو مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں رونما کر رہی تھی۔ کرشن چندر اور عصمت اس زمانے کے چوٹی کے فنکار تھے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھایا ضرور ہے لیکن چونکہ رومانیت اُن کے ضمیر میں داخل تھی، اس لئے ان کا فن بھی اس سے اپنا دامن بچا نہیں سکا ہے ـــــ عشق و محبت کے اثرات اس وقت تک موجود رہتے۔ منٹو نے اس رومانیت کے بت کو پوری طرح توڑا۔ اس کے مزاج میں رومانیت نہیں تھی ـــــ اس لئے اس کے اثرات اس کے افسانوں میں بھی نظر نہیں آتے ـــــ منٹو کا کمال یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے ہی نازک جذباتی معاملات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ جذباتی نہیں ہوتا ـــــ اس کے یہاں جذبات کی اہمیت کا احساس تو ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے ـــــ اُسے محض تخیل کے سہارے پر بہنا نہیں آتا۔ اسی لئے اس کے یہاں رومانیت کا اثر نہیں ملتا ـــــ وہ اپنی ذات کو شامل کئے بغیر زندگی میں اُس حقیقت کو دیکھتا ہے جو ایک خارجی وجود رکھتی ہے ـــــ اسی لئے منٹو کے یہاں حقیقت کا ادراک ہے لیکن اس میں محسوسات کو دخل نہیں ہے ـــــ برخلاف اس کے گہرا شعور ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقت منٹو کے یہاں ایک خارجی وجود رکھتی ہے اور وہ حقیقتوں کو اسی طرح دیکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے فن میں حقیقت نگاری کے خد و خال اس درجہ نمایاں ہیں۔

منٹو کی حقیقت نگاری کچھ تو زندگی کے شدید احساس اور صحیح شعور کا نتیجہ ہے ـــــ اور کچھ فرانس اور روس کے بعض حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے گہرے اثرات بھی اس میں شامل ہیں۔ منٹو زندگی اور اس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اُس نے ان میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے ـــــ اُس کی ایک ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ـــــ اور اس طرح زندگی کی تمام حقیقتیں اس پر بے نقاب ہو گئی ہیں ـــــ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے حقائق سے وابستگی نے منٹو کو بعض اہم حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا گرویدہ بنایا ہے ـــــ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں منٹو نے روس اور فرانس کے افسانہ نگاروں سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں کیونکہ وہاں کے افسانہ نگاروں کے یہاں اُسے زندگی اور اس کی حقیقتیں اپنے اصل روپ میں بے نقاب ملی ہیں ـــــ چیخوف، ترجنیف، ٹالسٹائی، موپاساں، بالزاک اور فلابیر وغیرہ کے اثرات اس پر بہت گہرے ہیں۔ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کو بہت غور سے پڑھا ہے ـــــ ایک زمانہ تو ایسا گزرا ہے کہ جب اس نے ان افسانہ نگاروں کے بہت اچھے ترجمے بھی کئے ہیں ـــــ اس لئے ان کی حقیقت نگاری نے منٹو کو براہِ راست متاثر کیا ہے ـــــ اور پھر جب آگے چل کر اس نے خود افسانے لکھے ہیں تو ان افسانہ نگاروں کے رنگوں کی جھلک خود اس کے فن میں پیدا

ملتا ہے ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے ——— اس کے یہاں اس سلسلے میں تقلید نہیں بلکہ تناسب ہے ——— اس نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے ——— اسی لئے اس کی حقیقت نگاری ترقی پسند افسانہ نگاروں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ ان سب کے یہاں حقیقت کی ترجمانی میں ایک دھیما پن ملتا ہے، منٹو کے یہاں اس کے برخلاف ایک تیز تندی اور تیکھا پن ہے۔ جس کے اثرات اس کے فن میں ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں ——— منٹو کی حقیقت نگاری اسی تیزی تندی اور تیکھے پن سے پہچانی جاتی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے فن کے لئے ایک مخصوص میدان تلاش کیا ہے، ایک مخصوص راہ نکالی ہے۔ منٹو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ اس نے بھی اپنے فن کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ منٹو کا یہ میدان دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح محدود نہیں ہے ——— موضوعات کے تنوع سے اس نے اس میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ منٹو زندگی کا فنکار ہے۔ اور زندگی تنوع سے عبارت ہے ——— اس لئے اس کے افسانوں کے موضوعات میں زندگی ہی کی طرح تنوع نظر آتا ہے ——— منٹو نے زندگی کے سماجی اور جنسی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ عام انسانی مسائل کو سلجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ نفسیاتی حقائق پر روشنی بھی ڈالی ہے ——— غرض اس کے یہاں زندگی کے تمام پہلو اپنی ساری رنگا رنگی کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں ——— منٹو نے ان سب کی تفصیل و جزئیات کو گہرے مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور ان سب کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا زاویۂ نظر انسانی رہا ہے۔ منٹو کے یہاں اس انسانی زاویۂ نظر کے مختلف روپ ہیں اور اس کے ہر افسانے میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ضرور دکھائی دیتا ہے ——— منٹو نے اپنے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کی بنیاد بہ اسی انسانی زاویۂ نظر پر استوار کی ہیں ——— یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کے یہاں زندگی کے عام حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری اس کو اپنے وجود کے لئے ایک سہارا بنا لیتی ہے۔

یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ منٹو کے فن نے سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کی آغوش میں آنکھ کھولنے کے باوجود، ان معاملات کی طرف ایسی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی ہے ——— وہ سیاسی اور سماجی اقدار کی ناہمواری کا احساس رکھتے ہوئے بھی ان معاملات سے متعلق کوئی بڑی گہری بات نہیں کہہ سکا ہے ——— صرف جگہ جگہ چند تاثرات کا اظہار ہے ——— ان تاثرات میں کسی قسم کی کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ ماحول کی ایک تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے۔ حالات کا ایک نقشہ ضرور آنکھوں میں پھر جاتا ہے ——— جستہ جستہ تو یہ کیفیت منٹو کے بہت سے افسانوں میں مل جاتی ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں اس کے افسانے "نیا قانون" اور "نعرہ" ایک نمایاں حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان میں گہرا سیاسی اور سماجی شعور تو نہیں ہے لیکن ان کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے بعض حالات نے منٹو کو متاثر ضرور کیا ہے ——— انھیں تاثرات کا اظہار ان افسانوں میں ملتا ہے ——— اور یہ تاثرات محض بعض حالات کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں ——— اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔

"نیا قانون" یوں دیکھئے تو ایک کوچوان اُستاد منگو کے بعض خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے، لیکن ان سب کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے اس زمانے کی سیاسی حالت کی ایک تصویر بھی بنائی ہے ——— اور سیاسی حالت نے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے، اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے، جس سے اس کشمکش کا کوئی حل بھی نکل سکے ——— منٹو کی پرواز اس حد تک نہیں ہے۔ اس کی نظر تو صرف کشمکش میں کھو کر رہ جاتی ہے ——— لیکن ویسے اس کیفیت کی ترجمانی اس نے بڑی ہی چابکدستی سے کی ہے۔ دراصل وہ دکھانا یہ چاہتا ہے کہ اُستاد منگو جس کو سب نہایت عقلمند آدمی سمجھتے ہیں، ایک ہونے والی سیاسی تبدیلی کو سمجھتا نہیں ہے، اس کا فریب کھاتا ہے ——— یہ نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اُسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ اُستاد منگو کا یہ خیال تھا کہ پہلی اپریل کو جو نیا قانون نافذ ہونے والا ہے، وہ زندگی کے انداز

کو بدل دے گا۔ اس لئے وہ خوش تھا کہ نیا قانون اُسے انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دے گا ـــــ کیونکہ اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اُس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے ـــــ اسی لئے وہ اکثر کہا کرتا "قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آگیا ہوں ـــــ جب کبھی اُن کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے ـــــ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے" ـــــ نئے قانون کے ساتھ اُستاد منگو کے دل میں صرف غلامی سے چھٹکارے ہی کا خیال نہیں آیا، یہ لہر بھی اُٹھی کہ مارواڑیوں اور ان کے سود پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اور اس کے بعد وہ غریبوں کا خون نہیں چوس سکیں گے ـــــ غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ـــــ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہو گا ـــــ اور پھر یہ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ اس کے بعد روس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا ـــــ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تو ہے ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا۔ اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا ـــــ نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی جب اس نے دو گریجویٹ طالب علموں کی زبانی یہ سنا کہ جو بیکار گریجویٹ مارے مارے پھر رہے ہیں، ان میں کچھ تو کمی ہو گی ـــــ لیکن یکم اپریل کو ہُوا یہ کہ نیا قانون تو نافذ ہو گیا لیکن زندگی نہ بدل سکی، نظام تبدیل نہ ہو سکا۔ اور اُستاد منگو کو اس حقیقت کا احساس اُس وقت ہُوا جب چھاؤنی میں ایک گورے کو پیٹنے کے سلسلے میں اُسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑی ـــــ وہ سمجھتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حالات بدل چکے ہیں اس لئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی جا سکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا ـــــ اس مختصر سی کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ ہندوستانی عوام کی انگریز سے نفرت، تبدیلی کی خواہش، آزاد ہونے کا خیال، سرمایہ داروں کی دست درازی، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری، سب اپنی اپنی جگہ پر حقیقتیں ہیں ـــــ منٹو نے ان کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے ـــــ ہرچند کہ ان حقیقتوں کے پیش کرنے میں کوئی بہت واضح سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اس کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

منٹو سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ معاشی اقدار کی ناہمواری کے باعث پیدا ہونے والی اُلجھنوں اور پریشانیوں کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے ـــــ بہت سے افسانوں میں اس کی طرف اشارے ہیں ـــــ لیکن "نعرہ" میں اس نے اس صورت حال کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ "نعرہ" ایک ایسے شخص کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کی کہانی ہے جو افلاس کا شکار ہے۔ اور جس کو موجودہ سماجی نظام اقدار میں مفلسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ نکلتی ہوئی نظر نہیں آتی ـــــ کیشو لال کی مفلسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی کھولی کا کرایہ تک ادا نہیں کر سکتا، اور جب اس کھولی کا مالک اس سے دو مہینے کا بقایا کرایہ طلب کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ وہ گھبرا جاتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے، اور زمانے نے مختلف اوقات میں اس کے دل پر جو زخم لگائے ہیں وہ سب کے سب ہرے ہو جاتے ہیں ـــــ کل کے تمام دُکھ درد اس کے نئے آج کی تکلیفیں بن جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیتا ہے ـــــ وہ سوچنے لگتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سوچتا ہے ـــــ اور اس کی نظر پھر اپنے گھر کے اندھے لیمپ کو کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکراتے ہوئے دیکھتی ہیں جو مالک مکان کے گنجے سر پر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اُس کے میلے بدن پر چمٹ جاتے ہیں جو دیوار میں گڑی جھک رہی تھیں۔ کئی بار اُسے اَن داتا بھگوان کا خیال آتا ہے جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے ـــــ اسی حالت میں مکان دار اُسے گالی دیتا ہے ـــــ اور یہ گالی اس کے دل میں کچھ اور بھی ہنگامہ برپا کر دیتی ہے ـــــ وہ اُسے پی جاتا ہے لیکن اس کے جی میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں پڑے چہرے پر تھوک دے۔ مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اُس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے ـــــ

میں اس کا دماغ اَن گنت خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے ——— وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ غریب ہے اسی لئے اُسے گالی دی گئی ہے۔ اور اسی لئے اسے یہ گالی سننا پڑی ہے ——— اگر اس کا راج ہوتا تو وہ اس سیٹھ کو مزہ چکھا دیتا جو اُسے اوپر تلے دو گالیاں سنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیئے ہیں ——— سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبلا اُٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو، اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دُکھنے لگتا ——— پر اس وقت اُسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی ——— کیوں؟ ——— وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پہ دھپا مار سکتا تھا۔ اُسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟ ——— رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش رہا ——— لیکن اس کے سوچنے کے عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکی اور اس نے کبھی تڑتڑ گولیاں چلتی ہوئی دیکھیں، کبھی اُسے آگ کا ایک چکر نظر آیا جو گھومتے گھومتے شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اُچھلنے کودنے لگی ——— وہ سڑک پر چلتا رہا ——— اور سڑک پہ چلتے ہوئے اُسے انتقام کا خیال بھی آیا ——— انتقام کا خیال آتے ہی اُسے اپنی زبان پہ لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی ——— لہو ——— لہو ——— اسے آسمان زمین سب لہو میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے ——— لہو ——— اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا ——— لیکن انتقام اس کے بس میں نہیں تھا۔ اُس کی اس ذہنی کیفیت نے بہت سے حقائق اس پر روشن کئے ——— اپولو بندر اور گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے جب اس نے بہت سے موٹریں قطار اندر قطار کھڑی ہوئی دیکھیں تو اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ، پر جوڑے کسی لاش کے اِرد گرد بیٹھے ہیں" ——— ان حقائق پہ غور کرتا ہوا انتہائی کرب کے عالم میں وہ ایک عالیشان ہوٹل تک پہنچا ——— اور وہاں پہنچ کر بے اختیار اس کے حلق سے ایک نعرہ نکلا ——— کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم لاوے کی مانند نکلا ——— ہیبت ناک ——— اسے یقین تھا کہ اس نعرے سے ہوٹل کی عمارت زمین پر آ جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایک شخص جس نے اس نعرے کو سنا اپنی بیوی سے کہنے لگا ——— "پگلا ہے" ——— منٹو نے اس افسانے میں مفلسوں کی زبوں حالی اور اس زبوں حالی کے زیر اثر پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی حقیقت سے بڑی بھرپور تصویر بنائی ہے۔ منٹو اس نظام میں ایک فرد کی بے بسی کو بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ اور اس بے بسی کو پیش کر کے اس نظام کے تضاد کو واضح کرتا ہے۔ جگہ جگہ اس میں عمل کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں ——— انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ایک نئے نظام کی تمنا بھی اپنے آپ کو کہیں کہیں رونما کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساسِ شکست ہی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے کیونکہ موجودہ نظام کے ہاتھوں یہی بات ایک حقیقت بن گئی ہے ——— اسی لئے منٹو کے یہاں ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے کوئی جارحانہ انداز پیدا نہیں ہوتا ——— اس کے کردار عمل اور انقلاب کے بارے میں سوچتے ضرور ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے ——— حالات نے انہیں بے بس بنا دیا ہے ——— منٹو اسی لئے زندگی کے ان پہلوؤں کا صرف عکاس بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھتا ——— لیکن اس کی یہ عکاسی بے مقصد نہیں ہوتی ——— اس عکاسی میں قدم قدم پر کچھ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کو سدھارنے کا پیام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے ——— اور اسی خصوصیت کا سہارا لے کر حقیقت نگاری اس کے فن میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

روسی افسانے میں حقیقت نگاری کے جو مختلف روپ ملتے ہیں ان کے اثرات منٹو کے فن پر بڑے گہرے ہیں ——— چیخوف اور گورکی سے خاص طور پر وہ متاثر ہوا ہے۔ گورکی کے یہاں زندگی کے نظامِ اقدار کا جو واضح اور گہرا شعور ملتا ہے، وہ منٹو کے یہاں نسبتاً کم ہے۔ اسی لئے وہ گورکی کے مقابلے میں چیخوف کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ گورکی کے یہاں زندگی کا تجزیہ ہے، چیخوف کے یہاں اس کی عکاسی ہے منٹو کا ایک افسانہ شغل ہے جو جیکسم گورکی کی یاد میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے گورکی کے مشہور افسانے TWENTY SIX MEN AND A GIRL

کی تکنیک استعمال کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں گورکی کی حقیقت نگاری کا انداز پیدا نہیں ہوتا ——— اس کا موضوع بھی بہت پامال ہے ——— کچھ مزدور ہیں جو صبح سے شام تک ایک پہاڑی سڑک پر کام کرتے رہتے ہیں ——— روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتے رہنا ان کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی طرح وہ اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔ ایک دن اس سڑک پر ایک موٹر آئی۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا ——— اور وہ سنتو چمار کی لڑکی رام دئی کو لے کر گم ہو گیا ——— بعض مزدور اس واقعے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ بعضوں نے اس سے چشم پوشی کی۔ وہ پنڈت جس نے رام دئی کو اس نوجوان کے ساتھ موٹر میں بٹھا دیا تھا۔ اس نے مزدوروں کے اضطراب کو دیکھ کر صرف یہ بات بتائی کہ میں نے ان سے دریافت کیا ہے، کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں ——— تھوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیں گے ——— امیر آدمی ہیں، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں ——— یہ سن کر یہ کام کرنے والے دیر تک خدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتہً فضل کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ دو مرتبہ زور سے تھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا ” اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے“ ———

جیسا کہ اس افسانے سے ظاہر ہے یہ سپاٹ ہے۔ اس میں ایک سماجی بدحالی کا تذکرہ ضرور ہے لیکن کسی گہرائی کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اسی لئے اس میں وہ تیکھا پن پیدا نہیں ہو سکا ہے جو منٹو کے بعض دوسرے افسانوں میں ملتا ہے ——— لیکن بہر حال اس افسانے کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسی باتیں ایک غلط سماجی نظام میں عجیب نہیں ہیں۔ منٹو اس افسانے میں اسی حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہے ——— اس کے اظہار میں نشتریت نہ سہی لیکن سماجی زندگی کے ایک تاریک پہلو کا اظہار تو ہے ——— اسی لئے اس حقیقت کے اظہار میں گورکی سے کہیں زیادہ چیخوف کی آواز سنائی دیتی ہے ——— اس میں وہ سادگی اور دھیما پن ہے جو چیخوف کے ساتھ مخصوص ہے ——— وہ گہرائی نشتریت اور تیکھا پن نہیں جس سے گورکی کی حقیقت نگاری پہچانی جاتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو کی سماجی حقیقت نگاری نشتریت اور تیکھے پن سے یکسر خالی ہے۔ ایسا نہیں ہے ——— منٹو کے یہاں گہرائی کا احساس البتہ کم ہوتا ہے لیکن نشتریت اور تیکھا پن اس کی سماجی حقیقت نگاری میں جگہ جگہ اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اس وقت اس کے افسانوں میں خاص طور پر پیدا ہوتی ہے جب وہ انسانی زندگی کے حد درجہ تاریک پہلوؤں کی پردہ دری کرتا ہے۔ جب وہ انسانیت کے جسم پر سڑتے ہوئے زخموں کو بڑی بے رحمی سے کریدتا ہے۔ اس خیال سے کہ افراد کو ان زخموں کی اصل حالت کا صحیح اندازہ ہو ——— اور منٹو کی حقیقت نگاری کے جوہر یہیں کھلتے ہیں ——— یہاں وہ اصل حقیقت کو دکھانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے ——— اس سلسلے میں اس کے سب سے اچھے افسانے وہ ہیں جو اس نے طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھے ہیں ——— اور جن میں اس نے ان حقیقتوں کو واضح کیا ہے کہ طوائف انسانی زندگی کے خوشنما چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ ایک ایسا ناسور ہے جو سالہا سال سے رس رہا ہے ——— اس ناسور کو دکھاتے ہوئے منٹو نے طوائف کو ایک انسانی مخلوق کی طرح دیکھا ہے۔ اسی لئے وہ اس کی مسرتوں، اس کے غموں، اس کی حسرتوں، اس کی ناکامیوں اور اس کی مایوسیوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ منٹو کے ایسے افسانوں کو پڑھ کر طوائف سے ہمدردی اور غلط نظام اقدار سے گھن اور نفرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہیں سے منٹو کی کامیابی کی حد شروع ہوتی ہے ——— اس موضوع پر منٹو نے یوں تو بہت سے افسانے لکھے ہیں لیکن ہتک، خوشیا، کالی شلوار اور پہچان اس رجحان کے سب سے اچھے نمونے ہیں ——— منٹو نے ان افسانوں میں اپنی مخصوص حقیقت نگاری کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔

ہتک، سوگندھی کی کہانی ہے ——— وہ سوگندھی جو ایک طوائف بھی ہے اور ایک عورت بھی ——— بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جو طوائف ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے۔ جس کو عورت بننے کی تمنا ہے لیکن حالات جس کو طوائف ہی رہنے دیتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ ایک

طوائف بن رہتی ہے ـــــ سوگندھی دس روپے میں اپنا جسم بیچتی تھی جس میں سے ڈھائی روپے اُسے رام لال دلّال کو دینے پڑتے تھے ـــــ سوگندھی اپنے کام میں بڑی ہوشیار تھی ـــــ اُسے بے شمار گُر یاد تھے ـــــ عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی ـــــ "اگر آدمی شریف ہو زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ـــــ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ـــــ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہوگی ـــــ ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں ـــــ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے" ـــــ غرض اس میں طوائف کی تمام خصوصیات موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک جذباتی عورت بھی تھی۔ اُسے بے شمار گُر مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بیٹھے رہنے کے ساتھ پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت باقی رہ جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا۔ سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں ـــــ اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے ـــــ پریم کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے ـــــ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے ـــــ اس نے چار مردوں سے اس پریم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا ـــــ اور ان کی تصویریں اپنے سامنے لٹکا لی تھیں۔ لیکن یہ مرد اُس کے نہ ہو سکے۔ انھوں نے سوگندھی کو ایک طوائف ہی سمجھا ـــــ ایک زمانے میں مادھو کی باتوں نے اس پر بڑا اثر کیا تھا ـــــ مادھو پونا میں حوالدار تھا ـــــ اور اس حوالدار کی میٹھی باتیں سن سن کر وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی ـــــ مادھو ہر ہفتے پونا سے آتا اور میٹھی میٹھی باتیں کرکے اُسے خوب سہانے سپنے دکھایا کرتا ـــــ لیکن کبھی بھی وہ سوگندھی کے کام نہ آیا۔ اس سے کچھ نہ کچھ لے مرتا تھا ـــــ اور وہ دے دیتی تھی ـــــ ایک دن مادھو نے سوگندھی سے پچاس روپے طلب کئے۔ اس بہانے سے کہ اس پر کوئی کیس ہو گیا ہے اور یہ رقم اُسے داروغہ کو دینی ہے ـــــ سوگندھی کا کاروبار جاری تھا لیکن اب اس کی گرم بازاری نہیں تھی ـــــ چند روز ہوئے ایک سیٹھ بڑی مشکل سے اُس کے پاس آیا تھا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھ کر اُسے ناپسند کرکے رخصت ہو گیا تھا۔ گویا اس نے سوگندھی کی ہتک کی تھی ـــــ سوگندھی پر اس واقعے کا گہرا اثر تھا ـــــ چنانچہ جب مادھو نے پچاس روپے کا سوال کیا تو اسے کچھ اس بات کا احساس ہُوا کہ مادھو اُسے بیوقوف بنا رہا ہے ـــــ چنانچہ اُس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا ـــــ کھری کھری سُنائیں۔ اور اس کے خارش زدہ کُتّے نے مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا ـــــ اور جب مادھو چلا گیا تو سوگندھی نے اپنے خارش زدہ کُتّے کو گود میں اُٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سو گئی ـــــ"

منٹو نے اس کہانی میں طوائفوں کے ماحول کی جو ہو بہو تصویر کھینچی ہے، اور اُس کی نفسیات کا زندگی سے جو بھرپور نقشہ بنایا ہے، اس میں قدم قدم پر حقیقتوں کے پیکر اُبھرتے ہیں ـــــ طوائف بہرحال ایک عورت ہوتی ہے لیکن طوائف کو عورت ہونے کے باوصف ایک طوائف ہونا پڑتا ہے ـــــ حالات اُسے ایسا کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں ـــــ اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ ـــــ اس کہانی میں سوگندھی کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، رام لال دلّال سے اس کے روابط، اپنی ہم پیشہ عورتوں سے اس کی ہمدردی، سیٹھ کے ہاتھوں ہونے والی اس کی ہتک، ایک چھوڑ چار مردوں کے بارے میں اس کی غلط فہمی، لیکن اصل حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد مادھو سے اس کی سخت کلامی، ان تمام باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں موجود ہیں ـــــ منٹو نے اس میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا ہے ـــــ صرف حالات، فضا اور ماحول کے بعض ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے جن سے اس زندگی کی بعض بڑی ہی اہم حقیقتیں ذہن نشین ہوتی ہیں ـــــ منٹو نے اپنی حقیقت نگاری

بہت بڑی حد تک انہیں حقیقتوں سے تیار کیا ہے۔

خوشیا کا موضوع ہتک سے قدرا مختلف ہے لیکن ماحول یہی ہے، اور منٹو نے اس افسانے میں بھی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں ــــ کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ کانتا پیشہ کرتی تھی اور خوشیا اس کا دلال تھا ــــ ایک دن خوشیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کانتا کی کھولی میں داخل ہو کر اسے بالکل برہنہ دیکھا۔ وہ اس پر گھبرایا لیکن کانتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اور یہ کہہ کر اس کی حیرت کو دور کرنے کی کوشش کی "جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ــــ اس بات نے خوشیا کی حیرت کو تو کسی حد تک دور کر دیا لیکن اس فقرے میں اس نے بہت سے مطلب کر ڈھونڈنے شروع کر دیئے۔ لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اور اس کو ایک الجھن سی رہی۔ دس برس کی دلالی کے عرصے میں وہ ایسے واقعے سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا ــــ اس لئے اس ننگی عورت کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اس کے جذبات میں ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی ــــ اور کانتا کے جسم کے خطوط نے اس کے دل میں اس خیال کو بیدار کیا کہ کانتا دس روپے میں مہنگی نہیں ہے ــــ انہیں خیالات میں محو وہ گھر پہنچا اور اپنے آپ کو خوب سجایا بنایا، نئی دھوتی پہنی، بالوں میں کنگھی کی، داڑھی منڈائی ــــ اور پھر ایک ٹیکسی لی ــــ ٹیکسی لے کر وہ ایک اور دلال کے ساتھ کانتا کے گھر پہنچا ــــ دلالی معاملہ طے کر کے کانتا کو ٹیکسی میں لے آیا ــــ اور جب وہ ٹیکسی میں داخل ہوئی تو سامنے خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے کہا "خوشیا تم" ــــ خوشیا نے جواب دیا "ہاں میں ــــ لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں نا؟" ــــ خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی۔ دیکھو ڈرائیور ــــ جوہو لے چلو" ــــ اس واقعے کے بعد خوشیا پھر اس بازار میں نظر نہ آیا ــــ اس افسانے میں منٹو نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مرد بھی ہر حال میں مرد ہوتا ہے ــــ دلال تک اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ خوشیا کے کردار میں اس نے ایک ایسے مرد کو دکھایا ہے جس کے جذبات دس سال کی دلالی کے بعد بھی سرد نہیں ہوئے ہیں۔ اور جو ایک زمانے تک کانتا کی دلالی کرنے کے بعد خود اس کی نسائیت کا شکار ہو جاتا ہے ــــ زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے؟

منٹو کی ایک اور کہانی "پہان" بھی طوائفوں سے متعلق ہے لیکن اس میں ایسی طوائفوں کا ذکر ہے جو بازار میں نہیں اپنے گھروں میں پیشہ کرتی ہیں۔ منٹو نے ان پیشہ ور عورتوں کی زندگی کی ساری زبوں حالی اور ان کے سارے کرب کو اس افسانے میں مجسم کر دیا ہے ــــ چار دوست شراب سے سرشار ہو کر یوں ہی تفریح کی غرض سے عورت کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن چار جگہ جانے کے بعد بھی انہیں تفریح کی جگہ تنغص حاصل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تانگے والا انہیں "میموں" کے یہاں لے جاتا ہے ــــ ایک ایسی جگہ جہاں کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ــــ اور جہاں انہیں دو کالی بھجنگ انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں۔ اور جن کو دیکھ کر ان دوستوں میں سے ایک نے کہا "کیا لذیذ ٹافیاں ہیں" ــــ یہ بات سن کر میموں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ سرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی ــــ یہ لوگ بھی ہنس دیئے ــــ اور ان دوستوں میں سے ایک نے پوچھا ــــ "کیا نام ہے آپ کا؟

بولی ــــ "لوسی"

دوسرے دوست نے آگے بڑھ کر پوچھا ــــ "آپ کا"

اس نے جواب دیا "میری"

تیسرا بھی آگے بڑھ آیا ــــ "کیوں صاحب آپ کیا کام کرتی ہیں؟"

دونوں لجا گئیں ــــ ایک نے ادا سے کہا ــــ "کیسا بات کرتا ہے تم؟"

دوسری نے کہا ——— "چلو جلدی کرو ——— رہنا مانگتا ہے یا نہیں - ہمیں روٹی پکانا ہے۔"

اور ان لوگوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی ——— تانگے والا قطعی طور پر غلط سمجھ کر انہیں یہاں لے آیا تھا۔ مروڑیاں اس عورت کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں ———" اس منظر سے تنگ آ کر وہ لوگ وہاں سے چل دیئے۔ اور اس کے بعد تانگے والا انہیں ایک پنجابن گلزار کے یہاں لے گیا جو بڑی ہی خوفناک عورت تھی ——— وہاں سے یہ لوگ الٹے پاؤں واپس ہوئے ——— اور پھر انہیں تانگے والا ایک میلے کچیلے گھر میں لے گیا جہاں ایک بڑھیا چولہا جھونک رہی تھی ——— یہ لوگ اس مکان میں اندر جا کر بیٹھ گئے اور وہاں انہیں ایک ٹھنگنی سی کم عمر لڑکی نظر آئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو اب ایک دم رک گئی ہے۔ اس کے پہیوں میں یہ یک لگ گئے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا سارا رنگ روغن دھوپ اور بارش میں اڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدی سے بھدی لڑکی کے جسم میں جو ایک قسم کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے، اس میں بالکل نہیں تھی ——— کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی ——— بہت ہی بیہودہ اور نامناسب طریقے پر ننگی ——— اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا ——— یہاں سے بھی یہ لوگ جان چھڑا کے بھاگے ——— تانگے والے نے یہی کہا "بابو جی آپ کو پہچان نہیں" ——— اور یہ کہہ کر اس نے کرائے کے روپے جیب میں ڈالے اور ——— "ساون کے نظارے ہیں" گاتا ہوا چلا گیا ——— اس افسانے میں زندگی کے متضاد پہلوؤں کو دکھا کر منٹو نے حقیقت کو واضح کیا ہے ——— ایک طرف تفریح اور عیاشی کا خیال اور اس کی جستجو و تلاش ہے لیکن اس کا حصول بے معنی ہے کیونکہ جس ماحول میں اس کو تلاش کیا جا رہا ہے اس میں ایک کرب کی سی کیفیت ہے ——— جہاں بھی یہ لوگ پہنچتے ہیں وہاں منٹو کی نظریں گندگی اور تاریکی کو دیکھتی ہیں، لالٹینوں کی اندھی روشنی میں بڑی مشکل سے انہیں راستہ ملتا ہے ——— ساتھ ہی ہر جگہ آٹا گندھا ہوا اور روٹی پکتی ہوئی نظر آتی ہے ——— کہ اسی کے لئے یہ سارا کاروبار چلتا ہے ——— منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے ——— اور اسی لئے کالی عیسائی عورت کے ہاتھوں سے آٹے کی جو مروڑیاں کچے فرش پر گرتی ہیں، ان کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔

اسی طرح کالی شلوار میں بھی اس نے زندگی کے انہیں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو کی تصویر کشی کی ہے ——— "کالی شلوار" سوگندھی اور کانتا ہی کی طرح ایک طوائف سلطانہ کی کہانی ہے۔ سلطانہ پہلے انبالے میں پیشہ کرتی تھی۔ وہاں اس کے دلال خدا بخش نے چند گوروں کو اس کا مستقل گاہک بنا لیا تھا لیکن پھر نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے سلطانہ سمیت دلی منتقل ہونے کا ارادہ کر لیا ——— سلطانہ تیار ہو گئی اور وہ دونوں دلی آ گئے۔ لیکن دلی میں ان کا کاروبار نہ چلا ——— سلطانہ کی چوڑیاں تک بک گئیں۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔ محرم کا مہینہ آیا تو سلطانہ کو ایک کالی شلوار بنانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ اس کی پڑوسنوں میں انوری اور مختار نے بھی محرم کے موقع پر کالے کپڑے پہننے کا اہتمام کیا تھا ——— خدا بخش اس سلسلے میں کوئی مدد نہ کر سکا ——— ایک شخص شنکر نامی ایک دن سلطانہ کے یہاں آیا۔ اس کو دیکھ کر سلطانہ کی باچھیں کھل گئیں لیکن وہ اچھا گاہک ثابت نہ ہوا ——— دوسری دفعہ جب وہ آیا تو سلطانہ نے اس سے کالی شلوار لانے کی فرمائش کر دی۔ شنکر نے کہا کہ وہ کوشش کرے گا۔ اور چلتے وقت سلطانہ کے بندے مانگے جو اس نے اتار کر دے دیئے ——— محرم کی پہلی تاریخ کو شنکر آیا اور ایک اخبار میں لپٹی ہوئی اس کے پاس کالی شلوار تھی ——— شنکر نے کہا "یہ ساٹن کی شلوار ہے۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا ——— سلطانہ نے اخبار ہٹا کر دیکھا تو اسے ساٹن کی شلوار نظر آئی۔ ایسی ہی شلوار جو اس نے انوری کے پاس دیکھی تھی ——— محرم کے موقع پر سلطانہ نے یہ شلوار پہنی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور انوری داخل ہوئی ——— اور اس نے کہا کہ شلوار تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہے ——— اس پر سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی دے گیا ہے" ——— یہ کہتے ہوئے اس کی نظر انوری کے کانوں پر پڑی۔ "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے؟" انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں"

...... دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا ——— اس کہانی میں بھی منٹو نے طوائف کی زندگی کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔ اس کی کس مپرسی اور زبوں حالی کی پوری تصویر اس کہانی سے آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ——— اس کی ہر بات اور ہر پہلو میں زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔

منٹو نے اس موضوعات پر اور بھی افسانے لکھے ہیں لیکن حقیقت نگاری کا جو کمال ان چار افسانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی لذت، کسی طرح کی جنسی تسکین یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا ——— اسی لئے طوائف منٹو کے یہاں دلچسپی کا سامان باقی نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے انسانیت کے جسم پر ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ منٹو طوائف کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق تاریک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتے ہیں ——— منٹو ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے ——— گھن تو اس ماحول سے پیدا ہوتی ہے جس میں گندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اور ہمدردی کے خیال کو دوسرے بہت سے مسائل بیدار کرتے ہیں، جن کا اس ماحول کے افراد کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے ——— منٹو کی حقیقت بیں نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ طوائف پیٹ کی خاطر انسانیت کی سطح سے نیچے گرنے کے باوجود اپنا پیٹ نہیں پال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بدحالی میں گزرتی ہے ——— اس کو ساری زندگی جذباتی اعتبار سے ناآسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے ——— "ہتک" کی سوگندھی، "خوشیا" کی کانتا، اور "کالی شلوار" کی سلطانہ سب معاشی اعتبار سے بدحال اور جذباتی اعتبار سے ناآسودہ ہیں۔ منٹو نے ان طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس ماحول کی زندگی کی بڑی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں ——— منٹو جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو گویا ایک غلط سماجی نظام اقتدار کے خلاف احتجاج کرتا ہے، جس نے صدیوں سے طوائف کو باقی رکھا ہے ——— وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے، ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ منٹو اس غلط سماجی نظام کا جانی دشمن ہے ——— وہ اس نظام اقتدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح لائحہ عمل پیش نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور ابھار دیتا ہے۔ لیکن یہ نفرت محض نفرت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کی حدیں انسانی ہمدردی سے ملی ہوتی ہیں ——— طوائف کے ماحول اور اس کے معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر منٹو کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ——— اور انسانی ہمدردی کی یہی خصوصیت اس کی حقیقت نگاری میں جان ڈال دیتی ہے۔

یہ بات بظاہر تو عجیب ہے کہ منٹو نے جذباتی و رومانی موضوعات پر افسانے نہیں لکھے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات اتنی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ منٹو فطرتاً جذباتی اور رومانی نہیں ہے ——— اس کے یہاں جب کبھی یہ پہلو نمایاں بھی ہوتے ہیں تو ان میں سے بھی کوئی نہ کوئی حقیقت ابھرتی ہے۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی اہم رمز سامنے آتا ہے ——— اس لئے اس کی جذباتیت اور رومانیت اپنے آپ کو کہیں رونما نہیں کرتی ——— اس پر اگر کبھی اس کا دورہ پڑتا بھی ہے تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے ——— "میں نے ازراہِ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی کہ اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں، ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کے پاس ہونے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے ——— ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے" ——— اور یہ ایک حقیقت ہے ——— پرکیف و دلآویز فضا میں عورت کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے ——— منٹو اس سلسلے میں کسی رومانی فضا کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔ موسم اور فضا میں تھوڑی سی رومانیت کا رنگ وہ ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تان زندگی کی ایک بڑی ہی اہم حقیقت پر جا کر ٹوٹتی ہے ——— یوں بعض افسانے جذباتی رومانی موضوعات پر منٹو کے یہاں مل ضرور جاتے ہیں لیکن ان افسانوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ———

خود منٹو نے ان افسانوں کو اہمیت نہیں دی ہے۔ اور اسی لئے انھیں دماغی عیاشی کی پیداوار بتایا ہے ——— ایک جگہ اس نے لکھا ہے ——— "مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں ——— میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں ——— وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لئے ——— میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے، اسی لئے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا ——— ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں، مگر وہ رومان نہیں ہیں" ——— وہ کسی نہ کسی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں ——— منٹو کی طبیعت کا رجحان ہی رومان کی طرف نہیں ہے ——— یہاں تک کہ جب محبت کا تذکرہ ہو تب بھی وہ اپنے گرد رومانیت کا حصار نہیں کھینچتا۔ اس کی نگاہیں یہاں بھی حقیقت پر جمی رہتی ہیں ——— محبت کے ساتھ اُسے یہ خیال آتا ہے کہ "محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں ——— محبت خوبصورت کریں یا بدصورت، بدکردار کریں یا نیکوکار، محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آ رہی ہے، اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راج کماری جنگل میں ——— غلام محمد کے دل میں بینگلی محبت پیدا کرے اور نٹور لال کے دل میں کوئی رانی۔ جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے، اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے۔ بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے ——— ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں ——— اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی ہے، یا اُن کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا، نہیں، یہ خواہش ان کے دل میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے ——— محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے" ——— جو شخص محبت کا ذکر ایسے غیر شاعرانہ انداز میں کرے اس کے یہاں رومان بھلا کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ ——— منٹو کے یہاں محبت بھی حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آتی ہے ——— اسی لئے اگر کہیں رومان پیدا بھی ہوتا ہے تو حقیقت پسندی کی اس فضا میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے ——— اور دیکھتے دیکھتے اس کی ہستی دم توڑ دیتی ہے۔

ویسے منٹو نے بعض افسانے محبت اور عشق کے موضوع پر لکھے ضرور ہیں لیکن وہ رومانیت اور خصوصاً جذباتی رومانیت سے محروم ہیں۔ ان میں شروع سے آخر تک حقیقت و واقعیت کی ایک فضا ملتی ہے ——— بانجھ، اگرچہ محبت سے متعلق ایک کہانی ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی اس کہانی میں رومانی ماحول پیدا نہیں ہوتا ——— کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ خاصی دیر تک اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع محبت ہے۔ ——— نعیم ایک لاابالی زخم خوردہ انسان کی طرح سامنے آتا ہے ——— کئی ملاقاتوں کے بعد وہ ایک دن کھلتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک دولت مند مالک کی لڑکی، زہرہ سے محبت کی ہے ——— وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر لکھنؤ سے باہر چلے جاتے ہیں اور اطمینان سے رہنے لگتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ زہرہ مر جاتی ہے، اور نعیم اس دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے ——— نعیم بیان کرنے کو تو یہ واقعہ بیان کر دیتا ہے لیکن آخر میں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ حقیقت افسانہ ہی رہے ——— چنانچہ وہ خط میں یہ عبارت لکھتا ہے ——— "آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ عشق سنائی تھی ——— وہ محض افسانہ تھا، ایک جھوٹا افسانہ ——— نہ کوئی زہرہ ہے نہ کوئی نعیم ——— میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی" ——— کہانی میں اگرچہ موٹر ڈرائیور اپنے مالک کی لڑکی سے

عشق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کہانی میں کہیں رومان پیدا نہیں ہوتا۔ زہرہ اور نعیم دونوں حقیقت پسند ہیں —— وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر کہتے ہیں —— زندگی ان کا ساتھ نہیں دیتی —— اور بہت تھوڑے عرصے میں ان کی ساری آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے —— اور بس یہ حقیقت رہ جاتی ہے کہ انسان بے بس ہے —— خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے، جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی —— منٹو نے اس کہانی میں کسی بہت بڑے موضوع کو نہیں اپنایا ہے —— صرف ایک کردار کی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے اور اس طرح زندگی کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے —— اسی لئے اس کا موضوع رومانیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی رومانیت سے کوسوں دور ہے —— غرض منٹو نے محبت اور عشق کے موضوعات پر جو گنتی کی چند کہانیاں لکھی ہیں ان میں سطحیت اور سستا پن نہیں ہے —— وہ کسی بڑے اہم بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں —— کیونکہ منٹو زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلوؤں سے کہیں زیادہ ان بے شمار حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے جو مرتے دم تک انسان کے دم کے ساتھ رہتی ہیں۔

منٹو انسانی نفسیات کا گہرا نباض ہے۔ اس کی ہر کہانی کو یہی نفسیاتی شعور حقیقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس شعور کے سہارے رومانی موضوعات تک اس کے یہاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں —— زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی میں اس نے کسی نہ کسی اہم نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے —— بعض افسانے تو اس نے ایسے لکھے ہیں جن کی بنیاد کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت پر استوار ہے لیکن جو افسانے نفسیاتی حقائق کو بنیاد بنا کر نہیں لکھے گئے ہیں ان میں بھی قدم قدم پر نفسیاتی حقائق کی ترجمانی نظر آتی ہے —— زندگی کے معاملات اور کرداروں کی حرکات و سکنات کو پیش کرتے ہوئے یہ نفسیاتی شعور اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے —— "شوشو" میں ایک نوجوان لڑکی سے اچانک مڈبھیڑ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے: "میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طور پر کہ اُس کو دھکا سا لگا۔ وہ سہمی اور فوراً ہی منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا —— اس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا: میرے ماتھے پر پسینہ آگیا" —— خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی کسی عورت کو یوں اچانک طور پر برہنہ نہیں دیکھا تھا جب اچانک کانتا ننگی ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ ہٹ پٹا سا جاتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہے۔ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دو چار ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں —— اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا جاؤ —— جاؤ، تم نہا لو —— پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی۔ پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی —— اندر سے کہہ دیا ہوتا، میں پھر آجاتا —— لیکن جاؤ —— تم نہا لو' —— کانتا مسکرائی "جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو" —— پھر خوشیا یہ سوچنے لگتا ہے اور دل میں کہتا ہے —— "یعنی یہ ایمان نہیں ہے تو کیا ہے —— یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے —— تم خوشیا ہی تو ہو —— خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اُس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے" —— اور یہ بات خوشیا پر ایک خوشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک رات وہ دلال سے ایک گاہک بن جاتا ہے —— اور کانتا اس کے پہلو میں ہوتی ہے —— ایک مرد کی نفسیات کی تصویر کشی یہاں حقیقت سے کتنی بھرپور کھینچی گئی ہے —— اسی طرح "نعرہ" میں کیشو لال جب سیٹھ سے گالیاں سنتا ہے تو اُسے بہت بُرا لگتا ہے لیکن پھر اس کے دل میں اس طرح کے خیالات بھی آنے لگتے ہیں —— "اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں —— میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔ بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یونہی سہی —— اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا —— یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم اب مجھے زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا —— تنگ آکر مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا کر مر جاؤں گا —— مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا" —— یہ

بھلے نفسیات شکست کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتے ہیں ـــــ "ہتک" کی سوگندھی کو دیکھئے ۔ اس پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی قریب ہیں ـــــ "سوگندھی دماغ دار عورت تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات، کوئی کومل بول، اُس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی ۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اُس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اُس کے بُری طرح قائل تھے ۔ وہ تھکن چاہتے تھے ـــــ ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر ـــــ انھیں مار کر سُلانے پر مجبور کر دے ـــــ ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ـــــ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے !" ـــــ سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن وہ عورت بھی ہے چنانچہ جب بھی وہ کسی شخص سے محبت کا سندیسہ سنتی ہے تو موم ہو جاتی ہے ـــــ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب فریب ہے، جھوٹ ہے، مکاری ہے ـــــ " ہر روز رات کو اس کا پُرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا، سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں' ـــــ اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی ـــــ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ـــــ پریم، کتنا سُندر بول ہے ـــــ وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ـــــ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے، سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے" ـــــ غرض اس طرح انسانی نفسیات کے اَن گنت حقائق منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کئے ہیں ـــــ منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو نئے زاویوں سے دیکھتا ہے ـــــ اس کی نگاہیں اس سلسلے میں اس جگہ جا پہنچتی ہیں جہاں عام افراد کی نظروں کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا ـــــ منٹو انسانی نفسیات کو انسانی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے ۔ اس لئے اس میں حقیقت کے بے شمار پہلو رونما ہوتے ہیں ـــــ اس کی دُور بین نگاہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انسانی زندگی کی بڑی اہم حقیقتیں بنا دیتی ہے ـــــ اس کے افسانوں کے یہ پہلو بھی اس کی حقیقت نگاری کو سہارا دیتے ہیں ـــــ ۔

یہ نفسیاتی شعور یوں تو منٹو کے ہر افسانے میں ملتا ہے لیکن بعض افسانے اس نے ایسے بھی لکھے ہیں جن کا بنیادی موضوع ہی کوئی نہ کوئی اہم نفسیاتی حقیقت ہے ـــــ ان میں سے بیشتر انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں سے متعلق ہیں ـــــ لیکن ان جنسی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے انسانی نفسیات کے بہت سے اسرار و رموز کی حقیقت واضح کی ہے ـــــ "شو شو"، "بلاؤز"، "پھاہا" اور اسی طرح کے بعض اور افسانے اسی نفسیات جنسی کے مختلف حقائق کو پیش کرتے ہیں ـــــ "شو شو" ایک نوجوان لڑکی کی کہانی ہے جو کسی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی ہے اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ رات گزار رہی ہے ـــــ وہ آپس میں دلہنوں کے متعلق بے شمار باتیں کرتی ہیں ـــــ جن سے ان کے جنسی دباؤ کا اندازہ ہوتا ہے ـــــ شو شو یہ باتیں کرتے ہوئے بالآخر اپنی سہیلی عفّت کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جما دیتی ہے لیکن عفّت معترض نہیں ہوتی، خاموش بیٹھی رہتی ہے ـــــ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سو جاتی ہیں ـــــ منٹو نے یہاں نوجوان لڑکیوں کے جنسی جذبات کی حقیقت سے بھرپور ترجمانی کی ہے ـــــ "بلاؤز" مومن، شکیلہ اور رضیہ کی کہانی ہے جو بلوغ کی منزلوں سے گزر رہے ہیں ـــــ شکیلہ ساٹن کا ایک بلاؤز پہنتی ہے ۔ اور رضیہ کو دکھاتی ہے ـــــ مومن کے دماغ میں یہ بلاؤز عجیب و غریب خیالات پیدا کرتا ہے ـــــ "ادھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا ۔ اُدھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے اُدھڑ رہے تھے ـــــ جب اُسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھُو کر اُسے دیکھے ـــــ صرف چھُو کر ہی نہیں ـــــ بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے ـــــ اپنے کھردرے ہاتھ ـــــ اس میں بھی ایک نفسیاتی حقیقت پنہاں ہے ـــــ "پھاہا" بھی کم و بیش اسی طرح کی کہانی ہے ۔ گوپال کی ران پر پھوڑا نکل آتا ہے ـــــ وہ اور اس کی بہن اس پر پھاہا لگاتے ہیں ـــــ لیکن آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نرملا تنہائی میں اپنے لئے بھی ایک پھاہا تراشتی ہے ـــــ اور پھر جو کچھ ہوتا ہے اُس کو منٹو ہی کے الفاظ میں سُنیئے ـــــ "پھاہا کاٹنے کے بعد اُس نے

شور را سا ہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی صابن کا چھوٹا سا ناکھوں بلبلہ اٹکا ہوا ہے ـــــ زملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے منتھے سے اُبھار پر جما دیا" ـــــ اس افسانے میں بھی منٹو نے بلوغ کی نفسیات کو واضح کیا ہے ـــــ غرض اس طرح اس نے بہت سے افسانے اس موضوع پر لکھے ہیں ـــــ ان افسانوں کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے ـــــ لیکن یہ زندگی کے بعض بنیادی نفسیاتی حقائق کو ضرور پیش کرتے ہیں ـــــ دوسرے ان حقیقتوں پہ پردہ ڈالتے ہیں۔ ـــ منٹو ان حقیقتوں کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس لئے ان افسانوں میں بھی اس کی حقیقت نگاری اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

منٹو نے خالص جنسی موضوعات پر جو چند افسانے لکھے ہیں اور جن پر خاصا ہنگامہ ہوا ہے، وہ بھی نفسیاتی حقائق کی ترجمانی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہیں ـــــ اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں میں سے اکثر کے موضوعات بڑی حد تک مہمل ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ فرد کی نفسیات روبری چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے ـــــ اور اس نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی منٹو نے کی ہے، اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ـــــ "دھواں" اور "ٹھنڈا گوشت" منٹو کے ایسے ہی افسانے ہیں ـــــ "دھواں" کا کوئی خاص اہم موضوع نہیں ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ مسعود ایک سکول کا لڑکا ایک قصائی کو گوشت لے جاتے ہوئے دیکھتا ہے ـــ اس گوشت میں سے اُسے دھواں سا اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے دل میں اس گوشت کو چھونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اُسے اُنگلی سے چھوتا ہے، اور گوشت کی گرمی اسے اچھی معلوم ہوتی ہے ـــــ یہ روداد وہ اپنی ماں اور بہن کلثوم کو سناتا ہے ـــــ اس کی بہن پر [illegible] روداد سن کر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ مسعود سے یہ کہتی ہے کہ اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ اور وہ مسعود سے کمر دبوانا چاہتی ہے ـــــ چنانچہ وہ دبا دیتا ہے ـــــ پھر اس کی بہن کلثوم اپنی سہیلی بملا کے ساتھ ایک پلنگ پر دیکھی جاتی ہے ـــــ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں اس افسانے کا موضوع ہیں۔ اس کے موضوع کے سستے پن سے قطع نظر اس میں جگہ جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں گہرے نفسیاتی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ ـــــ مسعود اور کلثوم کی گفتگو اور کلثوم اور بملا کی حرکات میں ان حقائق کا پتہ چلتا ہے ـــــ "ٹھنڈا گوشت" کا جو موضوع ہے اس کا بھی کم و بیش یہی حال ہے ـــــ موضوع اس کا بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نفسیاتی حقائق اس میں بھی جگہ جگہ ملتے ہیں ـــــ منٹو نے ان باتوں کو اپنے گہرے نفسیاتی شعور سے کام لے کر حقیقت کا روپ ضرور دے دیا ہے ـــــ اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری میں یہ باتیں معاون ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے ـــــ

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ منٹو کے یہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں اس نے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا ہے ـــ ان حقیقتوں کی تلاش میں وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ٹٹولتا ہے ـــــ اس کی ساری تفصیل اور جزئیات دیکھتا ہے ـــــ یہ جزئیات حقیقتوں کو اُبھارنے میں بڑا کام کرتی ہے ـــــ اور اس پر منٹو کا مشاہدہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے چنانچہ اس کی نگاہیں اس جزئیات میں ایسے پہلوؤں کو بھی دیکھ لیتی ہیں جن کو دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی ـــــ اسی لئے منٹو کے یہاں جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات بہ یک وقت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ مشاہدہ کی تیزی کے سہارے جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات جس طرح منٹو کے یہاں نمایاں ہوتی ہے شاید ہی اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں اس طرح نمایاں ہوتی ہو ـــــ لیکن اس میں منٹو کے تخیل کو بہت کم دخل ہوتا ہے ـــ منٹو صرف دیکھتا ہے اور دیکھتے ہوئے اس کی نظر بہ خارجی مظاہر کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں اور جب وہ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اس میں زندگی کی بے شمار حقیقتیں نمایاں ہوتی ہیں ـــــ اصل میں حقیقتوں کی تلاش ہی منٹو کو خارجی مظاہر کی تفصیل و جزئیات کی طرف متوجہ کرتی ہے ـــــ اور وہ اس کی جستجو اور تلاش میں بہت دور نکل جاتا ہے ـــــ لیکن اس کے باوجود رہتا ہے اسی دُنیا میں ـــ منٹو کے یہاں خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اسی دُنیا کی باتیں ہیں ـــــ اسی ماحول کی باتیں ہیں۔ اسی فضا

کی باتیں ہیں ——— منٹو ان باتوں کو بہت نمایاں کرکے پیش کرتا ہے ——— اور ان باتوں کو نمایاں کرکے پیش کرنے ہی میں اس کے یہاں حقیقت کی جزئیات اور جذبات کی حقیقت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ——— گوپال جس کی ران پر پھوڑا نکلا تھا، اس کے باپ کے کردار کی تفصیل یہ ہے کہ "اس کے پتا جی لالہ پرشوتم داس تھانیدار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو انھوں نے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کئے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لئے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا " بے شرم تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا جانے کب آئے گا " ——— اور نتھو کے کردار کی جزئیات ان جملوں میں موجود ہے " نتھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والے کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ چودھری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا۔ اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے ——— اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو اپلوں پر پرسرام اور گنگو کی چخ چخ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور رسالک رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے۔ حالانکہ وید جی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے "——— اور ایک فلم کمپنی کے ماحول کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ——— " بابو کی گٹھڑی کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی۔ رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لئے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹرس سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لئے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نووارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے" ——— اور سوگندھی کے ماحول کی تصویر اس طرح بنائی ہے " دروازے پر دستک ہوئی ——— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ——— دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور بدبودار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا " ——— اور " شوشو " میں حسن و شباب کے طوفان رنگ و بو کی مصوری اس طرح کی ہے۔ " ساٹنیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں، اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں! ——— یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے " ——— منٹو کے افسانے اس طرح کی تفصیل و جزئیات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس تفصیل جزئیات سے اس فضا اور ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے جس میں حقیقتیں پرورش پاتی ہیں۔ اسی لئے منٹو کی یہ تفصیل و جزئیات زندگی کی ان گنت حقیقتوں کو ظاہر کرنے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ بن جاتی ہے ——— اور اس میں شک نہیں کہ منٹو نے اپنے ہر افسانے میں تفصیل و جزئیات سے بھی کام لیا ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا منٹو کے یہاں محض خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس نے حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی بنیاد تخیل پر نہیں رکھی ہے۔ ان کی

جو ہو اور من و عن پیش کر دیا ہے۔ لیکن جگہ جگہ حقیقتوں کو واضح کرنے میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے، اس میں تخیل کی رنگ آمیزی ضرور نظر آتی ہے۔ اس رنگ آمیزی سے منٹو نے حقیقتوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے میں بڑا کام لیا ہے ـــــ اس کے افسانوں میں تخیل کی رنگ آمیزی کا مقصد صرف اسلوب کی پرکاری ہی نہیں، بعض بنیادی معاملات کی توضیح و تشریح ہے ـــــ اسی لئے تخیل کی رنگ آمیزی منٹو کے یہاں مقصد نہیں ذریعہ بن جاتی ہے ـــــ اور اس ذریعے سے مختلف حقیقتوں کو واضح کرنے کا جو مقصد ہے، اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ایسے ہی مقامات پر حقیقت کا حسن بھی نمایاں ہوتا ہے اور حسن کی حقیقت بھی ـــــ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو حقیقت حسن بن جاتی ہے اور حسن حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے ـــــ منٹو کے ہر افسانے میں ایسے مقامات آتے ہیں اور ان کے بنیادی موضوعات میں جو مختلف حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں ـــــ یہ جملے تخیل کی رنگین کاری کے باعث کتنے حسین لیکن حقیقت سے کتنے بھرپور ہیں :-

"پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔" (کالی شلوار)

"شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھلی ہوئی تھی جو ان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ جب میں نے بمبئی کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔" (پریشانی کا سبب)

"ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔" (مصری کی ڈلی)

"اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر ماد... نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ـــــ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ـــــ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ـــــ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ـــــ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔" (ہتک)

"لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی، خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے اس طرف لوہے کے کھمبے پر ایک لالٹین دسمبر کی سردی میں مجبور سنتری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے بھٹیارے کی بند دکان کے باہر چبوترے پر انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں ضدی بچوں کی طرح مچل مچل کر نیچے گر رہی تھیں۔" (موم بتی کے آنسو)

"میرے دائیں ہاتھ کو ایک اونچا ٹیلہ تھا جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے نہایت ہی مدھم

سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے ۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ آنکھیں بند کر لو تو یہ معلوم ہوتا کہ تھیٹر کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں ریشمی ساڑھی پہنے چل پھر رہی تھیں ۔"

(موسم کی شرارت)

" جہاں بیٹھا تھا وہاں دو بازنی ، ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے ! دونوں گجراتی بولتے تھے ۔ مگر مختلف لب و لہجہ سے ۔ پارسی کی آواز میں دو سُر تھے ۔ کبھی بار یک سُر میں بات کرتا تھا کبھی موٹے سُر میں ۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے ۔" (بانجھ)

" شوشو میں بانجھ کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے ۔ آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے ۔" (شوشو)

" اُس بازار کا راستہ ہم جانتے تھے ، جہاں عورتیں مل سکتی ہیں ——— کالی ، نیلی ، پیلی ، لال اور جامنی رنگ کی عورتیں ، بیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دُور تک دوڑتے چلے گئے ہیں ۔ یہ رنگ برنگی عورتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں ۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں ۔" (پہچان)

ان اقتباسات میں تخیل کی رنگ آمیزی اپنے شباب پر ہے ، اور اس رنگ آمیزی نے ان میں بلا کا حسن پیدا کر دیا ہے لیکن یہاں تخیل کی رنگ آمیزی بذات خود اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ وہ حقیقتیں جن کو منٹو پیش کرنا چاہتا ہے ——— اسی لئے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ نظر آتا ہے ——— ان کا حسن برائے حسن نہیں ہے بلکہ حسن برائے حقیقت ہے ——— اور اسی لئے ان میں بہ یک وقت حقیقت کا حسن بھی نظر آتا ہے اور حسن کی حقیقت بھی !

منٹو اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے ——— اس میں اُس کا کوئی ثانی نہیں !

اب تک منٹو کی حقیقت نگاری پر جو بحث ہوئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا میدان محدود نہیں ہے ۔ اس کے فن میں اس حقیقت نگاری کے بے شمار پہلو ہیں ۔ اَن گنت روپ ہیں ۔ اور اس کی حقیقت کو دیکھنے والی نگاہیں ان تمام متنوع پہلوؤں کو دیکھتی ہیں ——— یہ سارے مختلف روپ اُس کے سامنے آتے ہیں ۔ اس نے عالم انسان کی زندگی کے حقائق کو بھی دیکھا ہے ، سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کی حقیقتیں بھی اس کے سامنے آئی ہیں ——— انسانی نفسیات کے نارمل اور ایب نارمل دونوں پہلوؤں کے حقائق اس کی نظروں کے سامنے رہے ہیں ——— لیکن ان سب کو پیش کرنے میں وہ خود نارمل رہا ہے ——— کہیں کہیں ایب نارمل نفسیات کو پیش کرتے ہوئے تھوڑی سی انتہا پسندی اس کے یہاں ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ عام انسانی سطح سے نیچے نہیں گرتا ——— برخلاف اس کے ایسے مقامات پر تو اُس کی حقیقت نگاری اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے ——— "بابو گوپی ناتھ" ، "سہائے" ، اور "موذیل" اس کے ایسے ہی شاہکار افسانے ہیں ——— بظاہر یہ تینوں کردار دیکھنے میں عجیب معلوم ہوتے ہیں لیکن عجیب دکھانے کے باوجود منٹو انھیں انسانوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے ——— اور اسی لئے ان کی تمام حرکات و سکنات حقیقت سے اتنی قریب نظر آتی ہیں ۔ منٹو نے ان سب کو حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے یا ان میں اُسے حقیقت کے مختلف روپ نظر آئے ہیں ——— ان حقیقتوں کو کہیں کہیں اس نے حالات و واقعات اور معاملات و مسائل میں بھی تلاش کیا ہے ——— اور اسی لئے اس کے یہاں فضا اور ماحول کے بھی بعض بہت اچھے افسانے ملتے ہیں لیکن حقیقتوں کو دیکھنے کا جو ملکہ اُسے

کرداروں میں حاصل ہے۔ اس کی مثال سارے اُردو افسانے میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اسی لئے اس کے بہترین افسانے کرداروں کے مطالعے پر مشتمل ہیں —— اور ان افسانوں میں حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے —— بہرحال منٹو کے یہاں تنوعات کی حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے تنوعات ہیں —— لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے —— اور وہ ہے ایک انسانی زاویۂ نظر!

یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے —— اور اسی زاویۂ نظر کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے تمام افسانوں میں انسانیت اور انسان دوستی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے —— وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست (HUMANIST) ہے۔ اور اس انسان دوستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف مظاہر سے گہری دلچسپی رکھتا ہے —— انسان جو کچھ بھی کرتا ہے جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے۔ جو کچھ بھی سوچتا ہے، منٹو ان سب کو دیکھنے کا شیدائی ہے —— اسی لئے اس کے یہاں عام انسانوں کے جذبات و احساسات، واردات و کیفیات، ان کی آرزوئیں اور تمنائیں۔ ان کی حسرتیں اور مایوسیاں سب کی حقیقت سے بھرپور تصویریں موجود ہیں —— اس سلسلے کے کسی پہلو کو بھی منٹو نے چھوڑا نہیں ہے۔ ہر پہلو کی ترجمانی کی ہے —— لیکن منٹو کی انسانیت اور انسان دوستی صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے —— وہ سماجی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ منٹو کے یہاں اس حقیقت کا گہرا شعور ہے کہ انسانی زندگی میں فرد ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سماجی معاملات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ فرد بہرحال سماج کا ایک جزو ہوتا ہے اور سماجی حالات اس کو ہر اعتبار سے متاثر کرتے ہیں —— چنانچہ سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے۔ منٹو نے بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں اُس نے ان مظالم کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے جو زندگی کے غلط نظام اقدار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں افراد پر روا رکھے ہیں، اور جن کی وجہ سے انسانیت کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے —— زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا چاہیئے تھا نہیں ڈھل سکی ہے —— اور اس کی رفتارِ ارتقا کا جو اندازہ ہونا چاہیئے تھا، وہ اُسے میسّر نہیں آسکا ہے —— اس میں گندگی اور تاریکی ہے —— اور منٹو اس گندگی اور تاریکی پر کڑھتا ہے۔ اس پر خون کے آنسو بہاتا ہے —— اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشن ہو جاتے ہیں، لیکن خود منٹو ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا —— ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لئے کوئی واضح لائحہ عمل منٹو کے یہاں موجود نہیں ہے —— وہ ان کو دیکھتا اور دکھاتا ہے —— اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے —— بہتر کس طرح بنایا جائے —— لیکن اس کی تحریروں میں ان حالات سے بیزاری ضرور محسوس ہوتی ہے —— وہ ان سے باہر نکلنے کا احساس دلاتا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے —— منٹو کے یہاں ان حالات کی تنقید نہیں ہے —— عکاسی ہی عکاسی ہے، ترجمانی ہی ترجمانی ہے —— اس عکاسی اور ترجمانی میں کہیں کہیں نشتریت کا احساس ضرور ہوتا ہے —— اور اس نشتریت سے کسی حد تک تنقید کی کمی پوری ہو جاتی ہے —— زندگی کی ترجمانی اور عکاسی میں دو چیزیں منٹو کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں —— ایک تو عقلی زاویۂ نظر اور دوسرے عام انسانی ہمدردی —— منٹو انسانی ارتقا کا قائل ہے۔ اسی لئے انسانی زندگی اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ ایک عقلی زاویۂ نظر اختیار کرتا ہے —— اُسے جذبات کے دھارے پر بہنا نہیں آتا —— اسی لئے اس کے یہاں جذباتیت نام کو بھی پیدا نہیں ہوتی —— عقل و شعور ہر جگہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں —— اور ان سب کی تان انسانی ہمدردی پر جا کر ٹوٹتی ہے —— یہی باتیں اُسے انسان دوست بتاتی ہیں —— اس انسان دوستی نے اس کی حقیقت نگاری کو زندگی بخشنے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اور انسان دوستی سے بڑی حقیقت اس زندگی میں اور کوئی نہیں ——

منٹو اشتراکی نہیں ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں اشتراکی حقیقت نگاری کا وہ تصوّر نہیں اُبھرتا۔ جس کی بنیاد سماجی زندگی کے طبقاتی

اور جدلیاتی شعور پر استوار ہوتی ہے — منٹو کے یہاں یہ شعور نہ ہونے کے برابر ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے محدود شعور کی روشنی میں زندگی کی مختلف اور متنوع حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے ۔ اس کے یہاں اشتراکی اور تنقیدی حقیقت نگاری نہ سہی لیکن جن حقیقتوں کو اس نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہماری عام زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں — اس نے اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی زندگی کے بدلتے ہوئے معاملات و مسائل سے موضوعات منتخب کئے ہیں ۔ اور اس سلسلے میں اس کا زاویۂ نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے — اس کے افسانوں میں جو حقیقتیں نظر آتی ہیں وہ اس کے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں — ان میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتی ہے — منٹو نے خارجی طور پر انھیں سماجی زندگی میں دیکھا ہے — اسے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے — زندگی کے شدید احساس اور حالات کے گہرے شعور نے انھیں اس کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے — اس کی دوررس اور دوربین نظریں ان سب پر حاوی معلوم ہوتی ہیں — اسی لئے اس نے ان حقیقتوں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے یہاں جگہ جگہ ان میں سے بعض نئی حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں ۔

اور یہی اس کی حقیقت نگاری ہے !

سعادت حسن منٹو کی یادیں

ممتاز حسین

چونکہ منٹو کا تعلق کسی خاص ادبی فرقے (SECT) سے نہ تھا اس لئے اس بات کا خدشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ کہیں ان کی لاش پر لاہور کے مختلف ادبی فرقوں کے درمیان لڑائی نہ ہو۔ لیکن خوش قسمتی سے منٹو کو اس وقت موت آئی جبکہ "ادب میں جمود تھا" اور سیاسی فضا کسی قسم کے ہنگامے کے لئے سازگار نہ تھی۔ پھر بھی سُنا ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر، انتقال کیوں موت کی خبر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی جہاں سے ان کے ڈرامے نشر نہیں ہو پاتے تھے، تو کچھ فرقہ پرست قسم کے لوگ مرحوم کے گھر پر اس نیت سے بھی گئے لیکن وہ لوگ اتنی دیر میں پہنچے کہ ان کی لاش پر قبضہ کیا جا چکا تھا۔ یہ قبضہ نہ تو ادیبوں کے کسی فرقے نے کیا تھا اور نہ شہر کے رؤسا اور عمائد نے اور نہ حکومت نے بلکہ اس انبوہِ کثیر نے جس میں اکثر و بیشتر کے کیریکٹر "سوسائٹی" کی نگاہ میں مشتبہ تھے۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا تھا جس کا تعلق دولت کی پیداوار سے براہِ راست رہا ہو، ورنہ وہ سب کے سب دولت اڑانے والوں کے لئے سامانِ تفریح بہم پہنچانے والوں میں سے تھے۔

اکثریت یقیناً انہی لوگوں کی تھی لیکن ان میں جابجا ادیبوں کو چھوڑ کر غیر مشتبہ کیریکٹر کے لوگ بھی تھے۔ انہی میں ایک مولوی صاحب اور کچھ سکھ لوگ بھی تھے جو اپنے مخصوص حلیے کی وجہ سے خواہ مخواہ نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ چونکہ مرحوم مولوی اور سکھ دونوں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لئے ان کی موجودگی پر مشتبہ کیریکٹر کے لوگوں کے درمیان کھسر پھسر بھی رہی جو جلد ہی دب گئی۔ کیونکہ اتنی سی بات پر وہ ان سے مخالفت مول لے کر اپنا بزنس قربان کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی یہ کاروباری رواداری کس قدر سطحی تھی اور وہ اپنے عقائد میں کس قدر رجعت پرست واقع ہوئے تھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جبکہ مولوی صاحب نے نمازِ جنازہ کی تیاری میں اپنی داڑھی اور پٹا اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ وہی گروہ جو چند منٹ پہلے بزنس کا خیال کر کے خاموش ہو رہا تھا احتجاج پر اتر آیا۔ مولوی صاحب نے اعتراض کی نوعیت کو بھانپ لیا اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا "حضرات میں نے جو یہ داڑھی اور پٹا اتار کر رکھ دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مرحوم بالخصوص میری ذات سے متعلق اسے کفر کا آلہ تصور کرتے تھے۔ وہ مذہب کی اسپرٹ یعنی خدمتِ خلق اور اس قسم کے دوسرے اصولِ حسنہ کے مخالف نہ تھے لیکن ان حیلوں اور اداروں کے ضرور مخالف تھے جن کی کمین گاہ سے انسان کو شکار کیا جاتا ہے۔ مرحوم کی ایک کہانی "صاحبِ کرامات" تو آپ حضرات نے

پیش ہی ہوگا۔ میرے اس کہانی کا ہیرو یا ملین ہوں اور یہ داڑھی اور پاجامہ جس کے اتارنے پر اتنا احتجاج ہو رہا ہے وہی ہے جسے ایک بار میں
مرحوم کے گھر چھوڑ آیا تھا۔" مولوی کے اس "اعتراف" پر مشتبہ کیریکٹر کے لوگوں کے درمیان اور بھی زیادہ احتجاج اٹھا۔ وہ علانیہ کہنے لگے
"ہم کبھی بھی ایسے مولوی کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے تیار نہیں جو بدباطن جوان ہے۔" اعتراض کی یہ عجیب و غریب نوعیت مولوی صاحب
کے لئے سخت پریشان کن تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجمع کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "حضرات ہمارا تعلق قوم یہود سے نہیں کہ ہر نیک کام
کے افتتاح کے لئے کسی معصوم ہستی کو تلاش کریں اور نہ مرحوم نے کبھی ایسی تلاش کو جائز سمجھا۔ وہ تو سب سے زیادہ گنہگار آدمی کو سب سے زیادہ
نیک کام کا اہل سمجھتے تھے اور یہ بات حق پر مبنی ہے جیسا کہ آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے بھی علم ہوگا کہ نیکی کا ردعمل صرف گنہگار آدمیوں ہی
پر ہوتا ہے ورنہ نیک آدمیوں کو تو برائی ہی کی طرف جھکتے پایا ہے۔" مولوی صاحب کے اس جملے پر "NO PERSONAL REMARK"
کا ایک زبردست شور اٹھا لیکن مولوی صاحب کی آواز اسے پل بنا کر آگے بڑھ چکی تھی۔ "آپ کے ذہن میں میری ذات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں
ہیں جو غالباً فقہ کی ناواقفیت سے پیدا ہوئی ہیں، میں نے جو کچھ کیا اس کا جواز فقہ میں موجود ہے، کسی بھی مطلقہ کو اس کا طلاق دینے والا شوہر
اس وقت تک عقد ثانی میں نہیں لا سکتا ہے جب تک وہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ دوسرا مرد اسے طلاق نہ دیدے
فرض کیجئے اگر مرحوم کی مطلقہ عورت یعنی پھاتاں کو میں اپنے نکاح میں نہ لاتا اور دوسرے ہی دن صبح اپنی مرضی سے اسے طلاق نہ دے دیتا تو پھر
مرحوم کی شادی دوبارہ پھاتاں سے کیونکر ہوتی۔ کیونکہ اس کا امکان بھی پایا جاتا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ پھاتاں کو طلاق بھی نہ دیتا۔ میں
نے جو کچھ کیا مرحوم اور پھاتاں کی بھلائی کے لئے کیا۔ اس میں بظاہر میری بزرگی ہے نہ کہ جوانی۔" اس پر مجمع خاموش ہو گیا حالانکہ اعتراض بدباطنی پر
تھا۔ اور ایسی خاموشی چھا گئی کہ پھر کسی بھی بدعت پر لوگوں نے اعتراض نہیں کیا۔

جب نمازِ جنازہ ختم ہو چکی اور مرحوم کی لاش کو قبر میں اتارنے کا وقت آیا تو بابو گوپی ناتھ، مس موزیل، ممی اور ٹوبا سنگھ نے خاص طور
حصہ لیا۔ گوار دگرزا اور لوگ بھی تھے اور جب یہ رسم بھی پوری ہو چکی اور مرحوم کی لاش مٹی کے حوالے کی جا چکی تو مولوی صاحب نے ادیبوں
سے درخواست کی کہ وہ مرحوم کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی شخص مرحوم کے الفاظ میں اپنا صرف مطلب
تلاش نہ کرے۔ اس پر ناقدین حضرات پیچھے ہٹ گئے اور صرف افسانہ نگار حضرات آگے بڑھے۔

اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار جنہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال منٹو کے ساتھ گزارے تھے، ان کی شخصیت کو آئینہ دکھانا چاہا۔
لیکن وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ ایک ہی آدھ جملے کے بعد یہ کہہ کر رونے لگے کہ "یار منٹو بڑا پیارا دوست تھا" افسانہ نگار کے
اس ایک جملے نے وہ کام کیا جو غالباً کسی لمبی چوڑی تقریر سے ممکن نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مرحوم کی
شخصیت، فراخدلی، راست گوئی اور دردمندی کی تصویر بن کر چھا گئی۔ اب ان کی جگہ ایک دوسرے مشہور افسانہ نگار تشریف لائے جنہوں
نے شخصیت سے ہٹ کر ان کی افسانہ نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔

"حضرات! منٹو کی افسانہ نگاری اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اور شخصیت کا یقین خواہ غلط ہو یا صحیح ہم لوگ بالعموم آدمی کے مزاج سے کیا
کرتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا خیال ہے کہ آدمی کے مزاج میں سودا، صفرا، بلغم اور خون ان چار جزوں کے مختلف النوع تناسب کو دخل ہوتا
ہے لیکن مرحوم نے اپنی شخصیت سے اس حکم کو جھٹلا دیا۔ ان کے مزاج میں سودا، صفرا اور خون تو تھا لیکن بلغم بالکل نہ تھا۔ وہ نہ تو خبطی واقع
ہوئے تھے اور نہ ہنسوڑ۔ ان کے افسانوں میں تلخی اور ترشی ہے نہ کہ سٹھیا پن یا حمق، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں تلخی اس
وجہ سے ہے کہ وہ افسانہ لکھنے سے پہلے کوئی کڑوا گھونٹ اتار لیتے تھے لیکن میں اسے بالکل ہی غلط سمجھتا ہوں، آزما کر دیکھ چکا ہوں
نہ تو تلخی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس وجہ سے کہ کسی کے ایام تلخ ہیں، یہ بھی آزما کر دیکھ چکا ہوں حضرات اس کے افسانوں کے تلخ

اور چڑھ جانے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ حساس اور زیادہ ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کا ردِ عمل اور اس کی گرفت دوسروں کی ہم لوگوں سے زیادہ تیز اور چست تھیں۔ وہ جس قسم کے سماج میں رہ رہا تھا اس میں صرف عفونت اور سڑاند ہی نہ تھی بلکہ شدید قسم کی جہالت اور ہماری بے حسی بھی تھی۔ چھوٹے سے بڑے حادثات اس طرح پاس سے گزر جاتے جیسے وہ کسی ہوائی بندوق کے دہانے سے نکلے ہوں۔ منٹو ہماری اس بے حسی سے اکتا کر کبھی کبھی اصلی بندوق چلا دیا کرتا اور بالکل ہی سنجیدہ رہتا۔ کیونکہ نہ تو وہ رونے کے لئے ہنساتا اور نہ ہنسنے کے لئے رلاتا۔ وہ جو کچھ کرتا وہی اس کا مقصد ہوتا۔ اس کا مقصد سوسائٹی کی روٹین کو منتشر کر دینے، یعنی دوسرے پر چلنے والے پہیے کو روک لینے کا تھا۔ ایسا آدمی یقیناً باغی ہی کہلائے گا لیکن اس کی بغاوت میں ڈیرنگ گیگی نہیں ہے بلکہ "آلٹ" بولنے والا انداز ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے آرٹ کی طرف وہی آتے ہیں جن پر بقول افلاطون بھوت سوار رہتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑے گا کہ آرٹ سے عہدہ برآ بھی وہی ہوتے ہیں جو اپنے بھوت کو بھگا دیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی خوبی یہی ہے کہ آسیب زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے بھوت کو بھگا دیا تھا۔ وہ صدیوں تک عوام کے توہمات پر زندہ رہنے والے سچ بولنے کے بجائے "منکشف جھوٹ" بولتا۔ زندگی کے ان تجربات کے ذریعے نہیں جن کا سہارا لے کر ہم سو جاتے ہیں، بلکہ ان تجربات کے ذریعے جو ہمیں خواب میں بیدار رکھتے ہیں۔ چونکہ فکشن کے لئے اس قسم کا میٹریل ذرا مشکل سے ملتا ہے اس لئے اس کی کم مقداری پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور یہ اسی قناعت کا نتیجہ ہے کہ فن کار اپنے آپ کو دہرایا بھی کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنے کو دہرایا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ہم اسے پکڑ لیں۔ وہ ہر بار اپنے تجربات کے پہلو بدل دیا کرتا۔ منٹو کے اس منکشف جھوٹ کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر ہے کہ اگر دنیا کے سارے انسانوں کی کھال یکساں ہے بہ اعتبار ردِ عمل تو ان کی روح بھی یکساں ہے "جیسی روح ویسے فرشتے" اسے وہ گرگوں کا تراشا ہوا اصول بتلاتے۔ اگر کھال راحت اور تکلیف کے اصول کی پابند ہے تو روح بھی یکساں طور پر نیک و بد کی تمیز کی پابند ہے۔ کیونکہ توریت میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اس وقت باغ عدن سے نکالا جبکہ ان میں نیک و بد کی تمیز پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ایک زندہ آدمی کو اسی کی زندگی میں انہی دو اصولوں کی کارفرمائی سے پہچانا جا سکتا ہے وہ اپنے سماج کو مخاطب کر کے پوچھتے "یہ آخر یہ کس قسم کا کلچر ہے، یہ کون سی تجارت ہے جس میں اگر کھال راحت و تکلیف کی جواب دہی سے بے نیاز ہو جاتی ہے تو روح نیک و بد کی تمیز ضائع کر دیتی ہے؟" "کالی شلوار" سے لے کر "کھول دو" تک میں جہاں انسان کی روح پرواز کر جاتی ہے اور صرف شلوار رہ جاتی ہے اسی تمدن اور کلچر پر طنز ہے، ایٹمی طنز ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منٹو کسی خاص نظام کا نام نہیں لیتا ہے لیکن کیا کہانی کا پس منظر نظام کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے۔ منٹو کی کہانیاں اسباب کی طرف نہیں بلکہ اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سڈیشن کا مقدمہ نہیں چلایا گیا بلکہ اس بات کا کہ وہ جو سسٹم یا اثرات پیش کرتا ہے اس سے ہمارے کلچر اور تمدن کا مریض ہونا لازمی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں آدمی کو آدمی کے خلاف نہیں بلکہ آدمی کو خود اس کی ذات کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اور چونکہ مرحوم کا آدمی ناخواندہ تھا جیسا کہ ہم آپ ہیں اس لئے وہ سسٹم کو اس کے حواس تک لے جاتا۔ اس سے بہت سے لوگ چڑھ جاتے۔ لیکن چڑھنے کا اصلی سبب یہ نہ تھا کہ جو چیز اشارے اور کنایے سے بتلانے کی ہے اسے وہ ہماری ناک میں کیوں ٹھونسے دیتا ہے بلکہ یہ تھا کہ کیوں نہیں وہ خیر محض کی باتیں کرتا ہے، کیوں خیر کی بقا کے لئے شر کی ماہیت کو بھی بے نقاب کرنا ضروری سمجھتا ہے اس سے خیر کا اکلوتا پن جاتا رہتا ہے۔ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ہی جڑواں بچے ہیں، ایک کی پیٹھ دوسرے سے لگی ہوئی ہے

میر کا شعر ہے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

اگر فنا کا حصول بھی شعور کا ایک پہلو ہے تو پھر بندگی کی خواہش کیوں کی جائے لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی بندگی پوری کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہر آدمی جس کو فلسفیوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں بڑا فلسفہ ساز بھی ہے۔ اگر ایک طرف وہ آدمی کو شکار کرنے والا فلسفہ گھڑتا ہے تو دوسری طرف شکاری کو صید کرنے والا فلسفہ بھی وہی گھڑ سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں مرحوم کے پاس کوئی فلسفہ اسلوب تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ہر کہانی میں شکاری کے لئے اشتعال اور سوچنے والے کے لئے تحریک ہوتی۔ اس ایک گر کے علاوہ ان کے پاس لڑنے بھڑنے کا کوئی اور داؤ پیچ نہ تھا۔ نہ تو وہ اپنے افسانوں میں ہمارے شعرا کی طرح نیزہ ہلاتے رجز پڑھتے رزم و پیکار کو آواز دیتے اور نہ ہمارے جادوگر نثاروں کی طرح ہم وزن فقروں کے گنبد ہوا میں اچھالتے اور نہ ہمارے کرتب باز طنزیہ اور مزاحیہ مضمون نگاروں کی طرح لفظ سے لفظ اور جملے سے جملے کی پٹی نکالتے جاتے۔ وہ اس قدر براہ راست قسم کے آدمی تھے کہ وہ ان چیزوں کو بھی فراڈ سمجھتے وہ تو صرف آرٹسٹ تھے۔ لفظوں کے انبار کو چیر کر مقصد تک پہنچنا جانتے تھے۔ ان کی تشبیہات اور استعاروں میں الفاظ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ہمارے بعض نازک مزاج شرفا کو ان کے اس کمال سے بھی چڑ تھی۔"

فاضل افسانہ نگار کی یہ تقریر اس قدر بے مزہ چلی تھی کہ سامعین کے درمیان سخت قسم کی کسمساہٹ پیدا ہو گئی۔ لیکن چونکہ مقرر ہوشیار تھا جیسا کہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری چھوڑ کر مزاحیہ کالم لکھنے لگا ہے اس لئے اس نے اپنی تقریر کا رخ موڑ دیا۔

"حضرات! آپ گھبرائیں نہیں ابھی میں مرحوم کی زندگی سے متعلق مزے دار باتیں سناؤں گا۔ مرحوم نے ایک بار اردو کے مشہور افسانہ نگار دیویندر ستیارتھی کی داڑھی کو شراب سے رنگ دیا اور یہ مصرع پڑھا:

ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ"

اس پر مجمع اور بھی برافروختہ ہو گیا اور انہیں بیٹھ جانا پڑا۔ ان کا بیٹھنا تھا کہ جیب کترے صاحب جنہیں ساری دنیا جیب کترا ہی کہتی کھڑے ہو گئے اور بغیر مولوی صاحب کی اجازت کے تقریر کرنے لگے:

"حضرات! منٹو صاحب کے آرٹ اور زندگی پر بولنے کا حق جیسا مجھے ہے کسی کو نہیں ہے کیونکہ میں انہیں اندر سے جانتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں ان کے آرٹ اور زندگی پر روشنی ڈالوں، میں اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ میں وہی جیب کترا ہوں جس نے ایک "جھوٹی کہانی" میں بیگم پیرزمان کے ہینڈ بیگ سے ان کا Love Letter اڑا لیا تھا اور میں نے ہی ایک ریڈیائی ڈرامے میں بملا کو اس کا ہینڈ بیگ واپس کیا تھا۔ میرا نام نہ تو کانشی ہے اور نہ گھانسی، نام اس کو دیا جاتا ہے جس کی کوئی انفرادیت ہوتی ہے۔ اور چونکہ میں اپنے خالق کے ہاتھوں اس صفت سے محروم رہا ہوں اس لئے وہ مجھے صرف جیب کترا کہہ کر یاد کرتے اور شارٹ فارم میں صرف جیک (JACK) کہہ کر بلایا کرتے۔ جہاں کسی (HYPOCRITE) ملمع پوش کو جاتے دیکھا، بولے جیک اس کا چور پاکٹ مار دے۔ گویا چوری کر کے ہتھیانہ کریں، چنانچہ مجھے دوسرے کا چور کہا جائے کیونکہ مجھ میں اپنی انفرادیت تو ہے ہی نہیں تو یہ نام غیر مناسب نہ ہوگا۔ منٹو صاحب نے میرے وجود کی اس کمزوری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ جب کبھی انہیں اپنے طنزیات کے لئے کوئی وسیلہ ملتا تو مجھے بلا لیتے، اور یہ بات تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں کہ طنز نہ صرف منفی ہوتا ہے بلکہ اصلی تناسب سے بھی عاری ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کی کمزوریاں سامنے آ جاتی ہیں اور وہ خود بیک گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے۔ ایک طنز نگار کو برداشت کرنے کے لئے بہت ہی مہذب قسم کی سوسائٹی کی ضرورت ہے جسے آئینہ توڑنا آتا ہی نہ ہو، منٹو صاحب اصل میں اسی پیشے کے آدمی تھے اور اس کی اخلاقیات کو سختی سے برتتے۔ اصل میں تو دوست کے دشمن پر طنز کیا جاتا ہے نہ کہ اپنے دشمن پر۔ چنانچہ وہ غالب کو بہت پسند کرتے۔ ایک بار یہ جیب کترا ان سے پوچھ بیٹھا، "میں نے آپ کی زبان سے کبھی اکبر الہ آبادی کا کوئی مصرع نہیں سنا؟" بولے مسٹر جیک میں فرسٹ کلاس آدمی کو پسند کرتا ہوں، فرسٹ کلاس آدمی کو پسند

کرتا۔ تعجب! کسی کا جو پاکٹ نہیں ہوتا ہے۔ مگر اکبر آبادی کی شیروانی کے استر میں بائیں جانب زپ لگا ہوا ایک پاکٹ تھا جہاں سے اکثر ایک ملا بھی پڑا رہتا۔ فاتحہ سے کے فرغل میں اس قسم کا کوئی بھی چور پاکٹ نہ تھا۔ اس پر میں نے پوچھا: آخر آپ HYPOCRITE سے اس قدر کیوں خفا ہوتے ہیں؟" بولے "یہ تو نہیں جانتا ہے، ہپوکرٹ اسٹیج کے ایکٹر کو کہتے ہیں جو زندگی میں اپنا رول نہیں بلکہ دوسروں کا رول ادا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی بلکہ دوسروں کی بھی لٹیا اور اخلاقی جرأت ماری جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا عیب دوسروں کو لگتا رہتا ہے، بڑا آدمی مریض ہوتا ہے نہ کہ چور۔" چنانچہ یہ سب اسی کا ردِ عمل تھا۔

حضرات! وہ آپ لوگوں کے درمیان جاتے یعنی اچھے آدمیوں کے درمیان جاتے جو اپنے پیشے میں ہر چند درمیانی سہی یعنی دولت پیدا کر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی ذات سے بالکل تندرست ہیں، کیونکہ وہ اپنے پیشے کو نہ چھپانے پر مجبور ہیں، کہیں کہیں سے تالی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ منٹو صاحب حقیقت تک پہنچنے اور سوسائٹی سے اس کے مرض کو خارج کرنے کا جو یہ راستہ اختیار کرتے اس پر ان کے بعض دوستوں سے بڑی بحث رہتی۔ وہ کہتے منٹو تم مسئلے کو کیوں اخلاقی سرے سے پکڑتے ہو۔ کیوں نہیں سیاسی، اقتصادی سرے سے پکڑتے ہو۔ کیوں نہیں طبقات، سٹیٹ اینڈ ریسٹ، ارتقا اور انقلاب کی منطق میں سوچتے ہو؟ اس کے جواب میں منٹو صاحب کہتے: "تم لوگ بعض اوقات فوری مقاصد پہ اتنا زور دیتے ہو کہ دور کا نصب العین نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے، بعض اوقات نظام پہ اتنا زور دیتے ہو کہ آدمی گم ہو جاتا ہے بعض اوقات راستوں پہ اتنا زور دیتے ہو کہ مقصد کھو بیٹھتے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم لوگ مجھے سکھانے کے بجائے میرے آرٹ کی اسپرٹ کو دیکھ سکو، اگر ایک طرف میرے لئے فرد، فرد کے مجرد یونیورسل تصور سے زیادہ اہم ہے اور میں اپنے افسانوں میں وہ سب پیش کرتا ہوں جو کچھ کہ انسان کرتے ہیں نہ کہ وہ سب ناپید جو کہ انہیں کرنا چاہئے۔ تو دوسری طرف مجھ میں ایک اخلاقی حس (SENSE) بھی ہے جو ان کے اعمال کے تانے بانے میں نیکی کے دھاگے کو ڈھونڈھ بھی نکالتی ہے، یہی میرے آرٹ کا وہ اخلاقی پہلو ہے جو کہ "ہونا چاہئے" میں پایا جاتا ہے۔"

حضرات! منٹو صاحب نے اپنے آرٹ میں 'ہے' کو 'ہونے' سے کچھ ایسا ملا دیا ہے کہ ان کا پروپیگنڈا یا ایجی ٹیشن آرٹ بن گیا ہے نہ کہ ان کا آرٹ پروپیگنڈا یا ایجی ٹیشن ہو کر رہ گیا ہے۔ منٹو صاحب ایک مورلسٹ اور ریلسٹ دونوں ہی ہیں جیسا کہ دنیا کے تمام بڑے فنکار گزرے ہیں۔ بدنصیب تاجر کے کلچر پر جس نے اپنی زراندوزی اور نفع اندوزی کے دھن میں کیا کچھ نہیں دیا، حتیٰ کہ ایٹم بم بھی دیا آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے حملہ کیا جا رہا ہے، اور یہ حملہ اس کے کلچر پر ماسبق کی تمام صدیوں میں اخلاقی پہلو ہی سے کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سیاست کا پہلو اس سے رکھا نہیں گیا، کیونکہ ایسا ناممکن ہے۔ منٹو صاحب اسی گرانڈ اولڈ ٹریڈیشن کے آدمی تھے۔ وہ بالزاک، گوگول، زولا، موپساں، ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی اور پریم چند کی روایت کے آدمی تھے، اگر یہ صحیح ہے کہ وہ روایت پرست نہ تھے۔

حضرات! انسانی مسائل کو دیکھنے کے یہی دو طریقے ہیں، یا تو انہیں سیاسیات اور اقتصادیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے یا پھر اخلاقیات کی روشنی میں۔ ہمارے ادباء ان دونوں طریقِ کار کی اثر آفرینی اور زود رسی پر بحث و تمحیص کر سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز بحث میں لانے کی نہیں ہے وہ یہ کہ ان میں سے کوئی بھی طریقِ کار واحد طور پہ کسی فن کار کے آرٹ کو بلند نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں لفظ واحد بہت ہی اہم ہے۔ اس کے لئے کچھ اور چیزیں بھی چاہئیں جن پر ہمارے ناقدین برابر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ آرٹ وہی بلند ہوگا جو زندہ ہوگا، نہ کہ ٹھس اور جامد، منٹو صاحب کے آرٹ میں وہ جان موجود ہے جو کہانی کو ایک داخلی وحدت اور سالمیت میں ڈھالنے اور امیجز یا تصورات کو حواس سے مخاطب کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے منٹو صاحب ایک بڑے فن کار تھے جو کہ ان کے ہم عصر افسانہ نگار نہیں ہیں خواہ وہ اردو میں لکھتے ہوں، ہندی میں لکھتے ہوں یا انگلینڈ میں، منٹو صاحب کو موپساں کے ساتھ ہی ملانا ہوگا۔ لیکن یہ بات ادھوری رہ جائے گی اگر اس میں

معروف ہوتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی کچھ تنقید نہ شامل کر دوں۔ منٹو صاحب کی تنقید تجارتی کلچر پر INFERENTIAL ہے نہ کہ سپاٹ یا براہِ راست) وہ آدمی پر زیادہ اور اس کے گلے میں جو پتھر ہے اس پر کم توجہ دیتے ہیں (یہاں کم کا لفظ بھی کافی اہم ہے) ان کی زیادہ تر توجہ اس بات پر رہتی ہے کہ دیکھو اس شعلۂ رفتار، اس اوباش، اس لفنگے اور بدطینت کو یہ تجارتی کلچر کے کولھو میں پھنس کر بھی انسان ہے، اس میں نیکی کا جوہر ـــــ ہمدردی اور قربانی کا جذبہ زندہ ہے۔ منٹو کا یہ رجحان جو ان کی انسان دوستی کا نشان ہے رومانٹک ہے۔ اس لئے نہیں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے، ایسا تو اکثر ہی ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس سے آدمی کو کولھو سے نکلنے میں مدد نہیں ملتی ہے۔ یوں تو مرحوم کو نہ تو انٹ سے دلچسپی ہے (معلوم نہیں یہ کون سا فلسفی ہے) اور نہ کانٹ سے اور نہ کارل مارکس سے اور نہ فرائیڈ سے لیکن ان کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کونس برگ کے چینامین (CHINAMAN) کی طرح وہ بھی اسی کو ٹھیک سمجھتے تھے کہ انسانوں میں اخلاقی حس (SENSE) فطری ہوتی ہے، اب یہ بات دوسری ہے کہ مرحوم اس 'METAPHYSICS' کو ڈھونڈنے وہاں جاتے جہاں اس کی توقع وہ چینامین بھی نہ کرتا۔ مرحوم کی کہانیوں میں جو ڈراماٹیت ہے ان کی اسی نرالی ادا سے متعین ہوتی ہے، وہ ہر کام غیر متوقع کرتے تھے لیکن وہ اپنی اس ڈراماٹیت میں اس قدر زیادہ پھنس گئے تھے کہ وہ عنصری ذہانت سے زیادہ اور اکتسابی ذہانت سے کم کام لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابھی ہمارے یہاں پڑھے لکھے اور ناخواندہ لوگوں میں کم ہی فرق ہے، کیونکہ اگر ایک علم سے بے بہرہ ہے تو دوسرا اضافی حیثیت سے علم کے تخلیقی جوہر اور تطبیق سے بے بہرہ ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ علم کا میکانکی پتلا ہمارے لئے بالکل ہی بیکار ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنے سماج کی ہیئت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ہمارے یہاں صدیوں سے کتاب انسان کے عمل سے علیحدہ رہی ہے۔ ہم بقراط، ارسطو اور اقلیدس کو اس زمانے میں بھی پڑھتے رہے ہیں جبکہ ان کی کتابوں پر خطِ تنسیخ کھینچا جا چکا تھا۔ ہمیں کچھ دنوں تک موٹی موٹی کتاب پڑھنے والے، چشمہ لگانے والے، دوسروں کے قول اقوال کو پیش کرنے والے، کٹھ ملاؤں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہی کی غلط باتوں سے ہمیں صحیح باتوں کا علم ہوگا۔ لیکن مرحوم اس قسم کے ملا کی سماجی اور نفسیاتی باریکیوں میں نہ جاتے، وہ جہاں کہیں کسی آدمی کو دوسرے کا قول پیش کرتے سنتے اسے ڈفر کر دیتے۔ ممکن ہے یہ سب اس وجہ سے رہا ہو کہ کچھ لوگ انہیں غلط طور سے پڑھنے سے پہلے چند دیو قسم کے منکرین کا نام لے لیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار کسی شخص نے فرائڈ کے نام سے بسم اللہ کہہ کر یہ لکھ دیا کہ منٹو کی عورت "مزے دار" ہے۔ اس پر وہ سخت خفا ہوئے، بولے: "جوک تُو تو جانتا ہی ہے منٹو کی عورت کتنی کرکری ہے، وہ تو مرد کا بھوت بھگا دیتی ہے بھلا وہ مزے دار کیا ہوگی!" لیکن میں نے ان کے اس وقتی ردِ عمل پر زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں دوسروں کی بات کو رد کر دینے کی بھی عادت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی عورت، میری مراد ان کے مونث کردار سے ہے کہ نہ تو مزے دار ہے اور نہ کرکری بلکہ وہی ہے جو ان کی ایک کہانی "سڑک کے کنارے" میں ہے: "عورت اور مرد دونوں ہی مل کر ایک نقطہ بناتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہے؟" منٹو صاحب پوچھتے ہیں کہ "اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے، کیا اس قصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس نکتے پر پہنچنے میں مدد کی تھی؟" لیکن ناانصافی کے اس زخم کے باوجود اس کی مامتا سرد ہونے نہیں پاتی ہے وہ چیختی رہتی ہے "میرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن کو اوندھا نہ کرو۔" منٹو صاحب نے اپنی زندگی میں بس یہی ایک لیرک (LYRIC) لکھی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان میں لیرزم کسی سے کم ہے یا یہ کہ ان کے منہ کا مزا کڑوا رہتا جیسا کہ بعض نقادوں کے کہنے کا انداز ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے سینے میں بہت سی گولیاں پیوست تھیں جس سے ان میں انتقام کا جذبہ ابھر آیا تھا وہ کوئی سیاسی آدمی نہ تھے لیکن جب اپنی گوشہ نشینی کے باوجود دوسروں کی سیاست سے مجروح ہو جاتے تو وہ گریبان پھاڑ کر باہر نکل آتے۔ پہلی دفعہ جب انہیں جلیانوالہ باغ میں زخمی کیا گیا تو انہوں نے دو کہانیاں لکھیں۔ "نیا قانون" اسی کا ردِ عمل تھا۔ دوسری دفعہ جب ۱۹۴۷ء میں انہیں خود اپنے شہر میں زخمی کیا گیا تو وہ بیچارے بہت زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دن بہت ہی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا "کیا آدمی کو اس وقت تک بھڑکایا جا سکتا ہے

جب تک کہ اس میں بولنے کا مادہ نہ ہو؟" میں نے کہا، "استاد ناممکن!" اس پر انہوں نے پوچھا: "تو اچھا یہ بتاؤ یہ مادہ کیونکر نکلے گا؟" میں نے کہا "ایک طرف سے بند کر دیتے ہیں اور دوسری طرف سے کھول دیتے ہیں۔" انہوں نے ٹھیٹھ پنجابی محاورے میں کہا: "تو یزید کا کچھ نہیں بلکہ مجھ پہ ہے:" تقریباً سات سال تک وہ اسی یزید کو پالتے رہے کہ ایک گولی ان کے سینے میں پیوست ہوئی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے کسی سادہ لوح نے ان سے چچا سام کی طرف سے کہانی لکھنے کی پیشکش کر دی، ناشر لوگ ان سے وہ اپنی کہانی کا برابر پیسہ لیتے اور کبھی کبھار ایڈوانس بھی لے لیتے لیکن معلوم نہیں اس پیشکش میں کیا تھا کہ وہ سخت بوکھلا گئے۔ پوچھنے لگے "آخر اسے اس بات کی ہمت کیونکر ہوئی؟" میں نے کہا "دیکھیے مجھ سے تجاہل عارفانہ تو برتئے نہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری روح کی محافظت کے لئے جو حصار کھینچا جا رہا ہے اس میں فحش لٹریچر اور فحش تصویروں کو فروغ دیا جا رہا ہے؟" حضرات! مورلسٹ تو وہ تھے ہی، اس پوائنٹ (POINT) پر بالکل چت ہو گئے۔ پہلے تو یہ سمجھے کہ شاید میں نے ان پر کوئی حملہ کیا ہے، لیکن جب انہوں نے غور و فکر سے کام لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے ایک معمولی مشاہدے کی بات کہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وہ جو دو خطوط چچا سام کو لکھے سب اسی کا ردِ عمل تھا۔ یقیناً ہالی ووڈ کی ایکٹریس کو طلب کرنا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی یہ جھنجھلاہٹ کس چیز کا نتیجہ تھی، وہ سوسائٹی میں جائز بچوں کو پسند کرتے نہ کہ فطری بچوں کو جو کہ اس وقت جرمنی اور جاپان میں پل رہے ہیں۔ وہ جس قدر پکے نیشنلسٹ اور ڈیموکریٹ جمہوریت پسند تھے اتنے ہی پکے مورلسٹ تھے۔" یہ کہنے کے بعد جیب کترے نے اپنی انگلیوں کے درمیان سے ایک رقعہ نکالا اور ہوا میں لہرا کر بولا: "حضرات! یہ میری آخری کارستانی ہے، میں نے یہ رقعہ مرحوم کے 'جیب کفن' سے اڑا لیا ہے سنئے وہ اس میں کیا تحریر کرتے ہیں: "میں آج بہت افسردہ ہوں پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں یکدم مجھے رجعت پسند بنا دیا گیا اور اب فتویٰ دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور فتووں پر اپنا فتویٰ دینے والی سرکار مجھے "ترقی پسند" یقین کرتی ہے یعنی ایک سرخا ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر مجھ پہ فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا دیتی ہے دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے۔ اس کا قلم گذشتہ ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا۔ میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تمغہ میرے کفن سے ٹانک دے گی، جو میرے داغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہو گی۔" (جیب کفن)

"حضرات!" جیب کترے نے رقعے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا: "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ مرحوم کی افسردگی کے دونوں اسباب کو مٹا سکیں؟"

میرا دوست، میرا دشمن!

عصمت چغتائی

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو وہ "نیا آدمی" منٹو تھا۔ جس سے میں پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ دہشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا "چلو واپس چلیں شاید منٹو گھر پہ نہ ہو" مگر شاہد نے میری اُمیدوں پہ پانی پھیر دیا۔

"وہ شام کو گھر ہی پہ رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔"

پیے مرے پر سو دُرّے ایک تو منٹو، اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی کیا، مجھے کھا تو نہیں جائے گا! ہونے دو جو اُس کی زبان کی نوک پر ڈنک ہے۔ میں بلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اُکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آئیے آئیے۔" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پہ اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اُس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا۔ اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے جسم پھکندر کا کُرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"اسے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی دُبلی سوکھی مریل سی ہوں گی۔" اُس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے گلمیر جنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید بیٹھے چلو کہیں یہ ایکدم نہ اُلٹے پہلے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے جو گھاٹا اُٹھایا ہو اور اُسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا لہٰذا دوسری ملاقات کے لئے اُٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہم پرانے جٹے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جھگڑے کرتے رہے۔ اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سُننے سے پہلے ہی بول اُٹھتا ہے۔ اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق، جھکی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا۔ مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ اُن آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے سنجیدگی سے مسکراتے۔ طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں بکھرتے! وہی نازک ہاتھ پیر، سر پر ٹوکرا بھر بال، چکنے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ بیٹھے بیٹھے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی ایسے تو میں نے بچپن سے سُنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

"یہ بالکل غلط" اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

"آپ کج بحثی کر رہی ہیں"

"حماقت ہے یہ"

"وحامد لی ہے۔ عصمت بہن"

"آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں" میں نے چڑ کر کہا۔

"بس یونہی۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا"

"تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں"

نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟

"اس لئے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلانے چڑانے اور مارتے پیٹتے رہے۔ یا پکڑ کر چڑاتے رہے" منٹو زور سے ہنسا۔

"تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا"

"تو اتنا یاد رکھیے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟"

"علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے تمہیں ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے مر کر اُن کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا۔ اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ اُن سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں"

"یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے"

"یہ کون بزرگ؟"

"میرے بھائی عظیم بیگ، زمین مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے، شاہد جو ہماری جھڑپ کا الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملاد پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

"ذرا اس برنی سے اچار نکال لیجئے۔" منٹو نے تیزی سے میز پہ کھانا لگایا اور کرسی پہ اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگزاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی۔ اور بغیر کسی سے "پہلے آپ" کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر منٹو "لحاف" کے بخیے ادھیڑنے لگتا جو ان دنوں میری دُکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اُسے بڑا دھکا لگا یہ سُن کر کہ مجھے "لحاف" لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں "لحاف" کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مُصر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں "لحاف" سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات دھڑ سے اس معصومیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

"صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔"

"آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"بہت یاد آرہی ہے۔ تو اُسے بلا کیوں نہیں لیتے" میں نے کہا۔

"ارے.... کیا سمجھتی اس کے بغیر سو نہیں سکتا" وہ اپنی اصلیت پہ اترنے لگا۔

"نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے" میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

"آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟" میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

"محبت!" وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ "مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔" اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ "میں محبت کا قائل نہیں۔"

"ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"نہیں۔"

"اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نکلے۔ خسرہ بھی نہیں ہوئی۔ مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔" وہ ہنس پڑا۔

"محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے بہن اور بیٹی سے بھی۔ بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کُتیا سے محبت ہے، ہاں مجھے

اپنے بیٹے سے محبت تھی۔" وہ بیٹے کے خیال پر ایک کرسی پہ اُونچا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درازوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا" عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

"آپ یقین کیجئے چھ سات دن کا تھا کہ میں اُسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اُسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینہ کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دُودھ پلانے کے سوا اُس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو تو بس پڑی سوئی رہتی میں چپ چاپ بچے کو دُودھ پلوا لیتا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے بورک کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیئے۔ نہیں تو بچے کے مُنہ میں دانے ہو جاتے ہیں" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اُسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد ہے جو بچے پالنے میں مشّاق ہے۔

"مگر وہ مر گیا" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرہ پہ لا کر کہا ——" اچھا ہُوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اُس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اُس کے پوتڑے دھوتا ہوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا۔ سچ سچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا"

"چلتے چلتے اُس نے پھر کہا کہ صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گُٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں۔ جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں عورتیں ہی سُنتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھُسر پھُسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا۔ اور طعنے دینے لگا۔ اُس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سُن لی تھیں۔ وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

"توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں"

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

"اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی اُمید نہ تھی کہ یوں محلّے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی، شادی کی رات کیسی گذری۔ بچّہ کب اور کیسے پیدا ہُوا۔ توبہ ہے" وہ چڑانے لگا۔

مَیں نے فوراً لگام لگا لی " حد ہے منٹو صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے۔ بچّہ کی پیدائش دُنیا کا حسین ترین حادثہ ہے۔ اور یہ کانا پھوسی ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے۔ کیا سمجھتے ہیں آپ کیا کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے۔ محلّے کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب ودب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پہ تھو تھو کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے۔ کہ قورمے میں کتنی ہلدی اور کہ دال کے دہی بڑے۔۔۔۔۔"

"لے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے" صفیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

اور منٹو لڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیئے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے" میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ کچی اور ہلدی پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا" اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست گئی اور ہلدی چھوڑ کیچڑ پیتا تھا ہم کسی شرط پہ ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں۔ اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادے سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پہ دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے۔ اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں الجھ گئی ہیں۔ اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی۔ مگر دونوں بحثے جاتے۔ الجھے جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا۔ مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا آنکھیں مونڈکیوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا۔ اور جنگ ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو صفیہ کو لے کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑنے کہ تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے جواب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری رعونت کی حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا۔ اور اگر ان دوستوں کے سامنے جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بری طرح چڑ جایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پلے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں مگر "عام لوگوں" کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر تپاک سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے۔ ہر بات پہ ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر بہر جلد ہی اس تصنع سے دل اکتا جاتا۔ اور اس کا بھی۔ اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گولیوں کی سی سنسناہٹ آجاتی کبھی لگتا ہم دونوں کو یوں الجھ کر مزہ لینے لگتے اور ہم پھر مل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ ان کے لئے بٹیر بن کر لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی بھی یہی رائے تھی کہ گھر پہ چاہے جتنی اٹھا پٹک کر لیں مگر مخالفوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیئے۔ اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ مگر مجھے عموماً مورچہ سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح پھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پئے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور بحران کو آجاتا تھا۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشہ میں نہیں۔ اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگائیے۔"

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے۔ اور آپ نشے میں ہیں۔"

کیسا کیسا منٹو شہرت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں وہ اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے گلو خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خود ستائی کی عادت تھی ۔ مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا ۔ اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا ۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا ۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اٹھتا ۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا ۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سم قاتل سمجھنا خاص طور پر ادب کے لئے ۔

۔ بکواس کرتے ہیں یہ لوگ " وہ جل کر کہتا " جو یہ کہنے جائیں بس اس کا الٹا کرتے جاؤ ۔ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں ۔ وہ کبھی تاؤ چڑھ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں ۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ لیجئے مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجئے ۔ مگر وہ بھناتا رہتا ۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے ۔

" مقدمہ دائر کریں گے "

میں نے کہا " کون "

کہنے لگے " ہم ۔ یعنی میں اور آپ ۔ اس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہیئے اب اس کمبخت سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے ۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے ۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے نوٹس دلوا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے "

پھر نہ جانے بھول بھال گئے ۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا ۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجیب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی ۔ جب اس کا تذکرہ کیا یہی کہا " بڑا بدمعاش لفنگا ہے ۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے ۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوائی ہو "

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں ۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا ۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا ۔ میں نے کہا کیا کروں گی مل کر ، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ ۔

کہنے لگے ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں ۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش برا آدمی ہوتا ہے ۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے ۔

میں نے کہا " منٹو صاحب لفنگا شریف بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسا نہیں "

" آپ مڈل کلاس ہیں " منٹو نے برا مان کر کہا " جبھی تو میں آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں —— بڑا دلچسپ آدمی ہے ۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی "

" میں بھی تو عورت ہوں " میں نے فکر مند بن کر کہا ۔ اور وہ کھسیانہ ہو گیا ۔

" میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں "

" مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے " منٹو نے قہقہہ لگایا ۔

"ہو سکتی ہے!" یہ خوب کہا "مگر منٹو کو ضد ہو گئی" "آپ کو اُس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھئے تو سہی"

"میں اُسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیئے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کمبخت پر عاشق نہ ہونا پڑے"

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے باوجود دُنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی یہ منٹو کا میدان ہے وہ دُنیا کی ٹھکرائی گھورے پہ پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکالتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اُسے شوق ہے کیونکہ دُنیا کے سنوارنے والوں پر اُسے بھروسہ نہیں۔ اُن کی عقل اور فیصلہ پہ بھروسہ نہیں۔ وہ اُن کی شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے۔ اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اُس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دلہن سے میلی اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھائن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے "بُو" میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھئے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش پرست طبقہ کی پھٹے ہوئے دُودھ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دُور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا۔ اور وہ اُس بُت کو جس کی دُنیا پوجا کرے زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخر یہ سُنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہدیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے اِن کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبروریزی کی۔ اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

"سب جھوٹ" میں دھاندلی کرنے لگی۔

"اسے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمّت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سُن کر چلے آتے ہوں گے"

"مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر"

"گانا سُننے" میں نے چڑایا۔

"جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے۔ اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے" پھر بھی میں نے کہا۔

"میں نہیں یقین کرتی"

"وہ کیوں؟" وہ اُٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس میری مرضی۔ آپ میرے اُوپر رُعب ڈالنا چاہتے ہیں"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں"

"خدا پہ آپ کو یقین نہیں بیکار اُسے نہ گھسیٹئے"

"اپنے مرحوم بچّے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ ......"

"مرحوم بچّے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں"

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ کہ آج تو منوا کر رہونگا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلوائی۔ میں نے دومنٹ میں صفیہ کو چت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا . . ." وہ عجب گو مگو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں۔ اور میں نے کہہ دیا آج ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جبلّی تلخی اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا۔ بھو ماں جائے۔ شاہد نے کہا بس اب گھر چلو۔ مگر منٹو نے شاہد کی ٹانگ بھی شروع کی۔ اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سؤر کا دودھ پیا۔ مگر میں نے اور چڑایا۔

" آپ جائیں وائیں گے نہیں یونہی بائیکلا برج پر گھوم کر آ جائیں گے۔ اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ "!

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

" پھر کیسے یقین دلایا جائے "

میں نے کہا " ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلئے "

" میں نہیں جاؤں گی " صفیہ بگڑی " تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ "

" جائے گی کیسے نہیں " منٹو غرایا۔

" چلو چلو "۔ صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں لوٹ آئے منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا " مگر اب تو مان جاؤ "

میں نے کہا " قطعی نہیں "

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا ہے وہ اس کے اپنے اصول اور ایمان کی بنا پر ہے۔ کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہوگا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہوگا جو باوجودیکہ موری کا کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور برے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیئے گئے ہیں وہ انھیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا۔ خوشیا جیسے ڈھیٹ اور نکمے انسان کی رگ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے۔ گرپو اللہ جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پہ بازی لے جا سکتا ہے۔ بلکہ وہ جہاں دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں۔ اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا دانت پیس کر بولا۔

" آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے "

" دل کا ارمان نکال لیجئے مروّت کی ضرورت نہیں " میں نے چڑایا۔

" اب جانے بھی دیجئے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے "

" بتا بھی دیجئے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجئے "

" آپ جھینپ جائیں گی "

"قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی"
"تو آپ عورت نہیں"
"کیوں کیا عورت کے لئے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ کی بات نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ؟ عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھی تھی آپ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں" میں نے مسکہ لگایا۔
"قطعی نہیں ... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا"
"تو پھر کہئے نہ وہ جھینپ دینے والی بات"
"نہیں۔ اب غصہ اتر گیا" وہ ہنس کر بولا۔
"اچھا دوستی ہی میں سہی بتا دیجئے وہ کونسی خطرناک بات تھی"
"کچھ نہیں ... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا"
"بس" میں نے ناامید ہو کر کہا۔
"یا شاید کس کے چھانپڑ مارتا" نادم ہو کر بولا۔
"مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا میں نے اپنی فخیم شمیمہ کا لیا۔ سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے چہرے پر بھی غصے زور کے پڑ چکے ہیں۔ مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار" اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملاد جاؤں۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھلائے بیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لئے شاست پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے۔ اور ناک پر کرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔
"یہ کیا کر رہے ہیں" میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔
"کرکٹ کھیل رہا ہوں" منٹو نے بڑی بڑی مورپنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔
"یہ لیجئے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔
"ارے! صفیہ اٹھ بیٹھی" "آؤ آؤ"
"کاہے کا جھگڑا تھا" میں نے پوچھا۔
"کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے الجھتے ہیں مجھ سے بھی الجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑنے کہنے لگے ایسا ہی ہے تو چلا تو رے لے" صفیہ نے بسور کر کہا۔
منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لئے میں نے بن کر کہنا شروع کیا "صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول جھونک میں جھونکی اب آپ ارمان نکال لیجئے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے"
جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا کھنگالنے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دلدار پر مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا۔
"اور سنائیے" اُس نے حسب عادت کہا۔ ہانڈی کے گھار سے مجھے زور سے اُبکائی آئی۔

"اُفوہ یہ صفیہ کیا مُردہ جلا رہی ہے۔" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا۔ باورچی خانے میں صفیہ چھینک رہی اور اُس نے بھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آکر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بیوقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اُسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے" جیسے بچہ میرے نہیں خود اُس کے پیٹ میں ہو۔ میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اُسے بھی بگھار سے اُبکائی آتی تھی۔"

"منٹو صاحب خدا کے لئے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو" میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واہ۔ اس میں کیا بُرائی ہے۔ ارے آپ کرکٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں" وہ لپک کر نیچے گیا اور کُرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ ارے صفیہ" وہ چلایا۔ صفیہ دھوئیں سے اَٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی۔ "کیا ہے منٹو صاب کتنا چلاتے ہو۔"

"ارے بیوقوف۔ ان کا پیر بھاری ہے۔" اُس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں۔" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب چہکا۔ اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے کھرونچے نہیں پڑیں گے۔"

"نہار منہ سیب کا مربہ کھانے سے ابکائیاں نہیں آئیں۔"

"کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔"

"جاپے میں برف نہ چاہیئے گا۔ نلے سوج جاتے ہیں کیوں صفیہ؟"

"ہٹو منٹو صاب کیسی باتیں کرتے ہو۔" صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس ہی بیٹھی کانپتی رہی۔ مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل کھِل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی نکہت پیدا ہو گئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا میں فوراً گئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھانڈ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا۔ منٹو نے اس لئے بدل لیا کہ اُس کا فرش گندہ تھا بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی۔ اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نکہت چند ہفتوں کی تھی۔

"مجھے بچے سخت ناپسند ہیں" منٹو سنجیدگی سے کہتا "جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لئے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انہیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔" وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی بتو اُسے بڑی پیاری تھی۔ گھنٹوں اُس کے ساتھ گڑیوں اور مہندی کلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لئے املیاں توڑ کر نیچے سے کُرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیما کو پاٹ پر بٹھا کر "شی شی" کرتا۔ اور بچوں کا بہت شاکی تھا کیونکہ وہ اُن کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی معلوم ہوا صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی "میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیئے مگر وہ کہاں سنتے ہیں" منٹو مع نند آجی اور خورشید انور کے آ گئے۔

" یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی" ہاتھ میں بوتل اور گلاس لئے تینوں در آئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گذر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھا لیں۔ بس آٹا دال دے دو خود باورچی خانے میں جا کر پکا لیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانہ پہ چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نند آجی انگیٹھی پر لوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیئے گئے جو وہ چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے۔ اور پھر لوٹل بھی باورچی خانہ میں آ گئی۔ لوگ پھسکڑا مار کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکالی۔ اور پھر محبت سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا ——

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی معقول آمدنی ہو۔ پینا پلانا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اُسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا۔ خوب دعوتیں اُڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت پھبنے لگے۔

" میرے پیر بڑے بھدے ہیں۔ میں نہیں خریدونگی اتنے خوبصورت جوتے" میں نے کہا۔

" اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے اُن سے شرم آتی ہے" مگر ہم دونوں نے کئی جوڑ جوتے خریدے۔

" آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں" میں نے کہا۔

" بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔

" بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں" میں نے رائے دی۔

" بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں" منٹو نے جھک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

" محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچوں بیوی سے محبت ہے"

" میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے"

" ہاں ...... میں سمجھ گیا۔ منٹو نے دورِ ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا "کشمیر میں ایک چرواہی تھی"

" پھر" میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارا دیا۔

" پھر کچھ نہیں" وہ ایک دم بچاؤ کے لئے تن گیا۔

" آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں"

"کرن گدھا شرما رہا ہے" منٹو نے واقعی شرما کر کہا۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

"بس جب وہ مویشی ہانکنے کے لئے اپنی لکڑی اُوپر اُٹھاتی تھی تو اس کی سفید کُہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔ روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اُوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اُس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔"

"کُہنی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ میں نے سوائے کُہنی کے اُس کے جسم کا اور کوئی حصّہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کُہنی کی جھلک دیکھنے کے لئے لپکتی تھیں۔

"پھر کیا ہُوا؟"

"پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دُور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا مجھے دکھاؤ۔ تو شرم سے اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ رُوہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی رد و کد کے بعد اُس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔

"کیا تھا اس کی ہتھیلی پر" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"مصری کی ڈلی! اُس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں دیکھتا رہ گیا" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

"پھر؟"

"پھر وہ اُٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دُور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اُسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔"

"اور لڑکی؟"

"کونسی لڑکی؟" وہ چونکا۔

"وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی۔"

"اُسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔"

"کس قدر پھُس پھسا ہے آپ کا عشق!" میں نے نا اُمیدی سے چڑ کر کہا۔ مجھے تو "بڑے" کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی اُمید تھی۔"

"قطعی پھُس پھسا نہیں" منٹو لڑ پڑا۔

"بالکل ردّی۔۔۔۔ تھرڈ ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔"

"تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلّا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا!" وہ بگڑا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔"

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ ذہن۔

جس نے 'بو' لکھی تھی۔
جس نے 'ٹھنڈا گوشت' لکھا تھا۔
لیکن مرزا غالب میں جو دعوت بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے۔ جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لئے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ نیا قانون لکھتا ہے اور دوسری طرف "بو"...... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟ ...... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے کے بعد اس کرشی کے وہاں اُس کرشی میں کئے جانے لگے۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اُس کی زندگی کا سہارا تھی اُسے ملتی تھی۔ کہ اُس کی فلم "آٹھ دن" کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اُسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مگر جی نے نہ جانے اُسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اُس کے خلاف ہو گیا۔

"بکواس ہے مکر جی۔ فراڈ ہے پکا!" وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اُس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لئے سینیر بورڈ ڈپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ "اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی اشوک کمار ہیرو۔ بس پھر دیکھئے گا!"

ایک کہانی منٹو کی زیر غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اُس سے پہلے اُسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اُسے میری کہانی ضدی پسند آ گئی۔ یہ منٹو کو ناگوار نہ گذرا اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے۔ اُدھر کمال امروہی "محل" کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے۔ لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ضدی کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ضدی بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا۔

"آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا!"

"آپ کی کہانی میں اُس کا رول رومنٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا!" اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر دبی زبان سے یہاں اپنی فکر پڑی تھی۔ اور وہی ہوا کہ "ضدی" اور "محل" بن گئیں منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی اُمید نہ تھی اور اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اُسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم بھی ہم ہوں گے

بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لئے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کئے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت۔ قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا۔ شندی ختم ہو گئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے اس نے بلایا تھا ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا۔ مگر اب تو اور بھی ماننا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیئے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو"

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر مکرجی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ تھر پاگل خانے سے آگے جو قدم بڑھتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سنیں کہ جی اوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا۔ اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک رہ گئی ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دکھتا ہے نہ رستا ہے خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اوطفلی چھپ چھپ کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لئے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہوا جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس پہ کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمھاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی۔ یا تمھارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمھیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے منٹو صاحب کی صفیہ رہیں۔ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدروی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش گھڑیوں کا تمھارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپروائی سے تمھارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دم تو نہ گھٹ جاتا تھا۔ کیا اس نے تمھاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا۔ کیا بچیاں اپنے باپ کو بالکل مفلس شرابی سمجھتی تھیں۔ اس نے تمھیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انھیں عیب کی طرح چھپایا۔ اسے غرّہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے۔ جبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اس کا قلم بیکسی سے گھسٹتا رہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آ گئیں ادیبوں سے! یونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں! ... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم و بیش یہی انجام۔ جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ہو اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گزر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے

منٹو ——— میرا دشمن

اوپندر ناتھ اشک

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے، ہم نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں پہنچائیں۔ کتب پبلشرز بمبئی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے معمار کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو اسکیچ کرشن چندر نے لکھا اس میں اس چپقلش کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی 'دشمنی' کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ ——— کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا ہی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت اچھے دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری افتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا ——— وہ لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دوکانوں کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب بھی تاش ہی کے دیکھتا تھا، اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ رند بلا نوش تھا اور میں نے شراب تو دور رہی، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا، جب میں تیس برس کا تھا۔ اس نے کٹڑہ گھنیاں ہو، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ ——— اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے ادھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف سخت نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سر انجام دیئے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی آئندہ دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کئے بغیر ان پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہیں کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ہم نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے، اس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھل کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا جی، جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے تو ملوکا نعرہ لگاتے تھے ——— کوڑی نہ رکھ کفن کے لئے! وہ حال میں جیتے تھے اور انہوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردعمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا ——— اور منٹو کو

میرے اپنے زہد، حسابیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اُس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

...... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لئے بمبئی بلایا تھا۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے۔ ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اُس نے انگریزی میں کہا۔ I LIKE YOU THOUGH - I HATE YOU

...... ڈیڑھ سال بعد ہم فلمستان کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسبِ دستور راجہ مہدی علی خان، واچا وغیرہ دو ایک دوست تھے۔ میں برابر کی میز پر اپنی یونٹ کے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے داہ کرم سنسکار اور کپال کریا ——— یعنی مردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت پیس کر کہا ——— "اشک جب مرے گا تو اُس کی کپال کریا میں کروں گا۔"

...... میں جب کے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علی خان مجھ سے ملنے آیا اور اُس نے کہا ——— "منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا۔"

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا، میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔ لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لئے جواب دے دیا تھا۔ ورنہ منٹو سے مجھے در اصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ رہا منٹو تو اس نفرت کے باوجود، جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا، اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے بھکڑپنے میں منٹو کو بنا دیکھے، بنا جانے، بنا پڑھے اُس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی 'خوشیا' ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اُس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے آکر سُنا جاتے اور میں لکھتا تو انھیں جا سُناتا۔ دونوں مل کر ہم عصروں کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے اور جیسا کہ نوجوانی میں ہوتا ہے، ہماری رائیں خاصی تیز اور حکمی ہوتیں۔ بیدی نے 'خوشیا' کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اُس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، نہ اُسے دیکھا تھا۔ 'سرگذشت اسیر' کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور میں نے کسی سے سُنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ بہر حال 'خوشیا' کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا۔ اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی میں تینوں سے بڑا ہوں اور اُس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے 'ڈاچی'، 'کونپل'، 'قفس'، وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبعزاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لئے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ 'خوشیا' پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی سے مصنف کے خلاف تھا۔ 'خوشیا' مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا۔ حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ 'خوشیا' حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اُس زمانے میں باقاعدہ اُس گلی کی سیر کرتے تھے اور اُن کی وساطت سے مجھے اُس کے آداب و قواعد سے

خاصی واقفیت تھی۔ نچلے طبقے کی طوائفوں کے (جیسی کہ خوشیا کی کانتا ہے) دلاّل عموماً اُن سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں، یہ بات یقینی طور پہ جانتا تھا۔ اسی لئے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اُس وقت غیر شعوری طور پہ یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں بھی پکڑ پکڑ پہنے کے دن تھے۔ کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی۔ جو منہ میں آیا، بک دیتے تھے، اس لئے میں نے کہا: "دو کوڑی کی کہانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا۔ لیکن بیدی نہیں بھولا۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد بیدی دہلی گیا اور وہاں منٹو نے (جو اُس وقت آل انڈیا ریڈیو دلّی میں آگیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اُسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے خوشیا کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلّی سے واپس آکر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سُنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے، اس لیے میں نے اس اطلاع کو سُنا اَن سُنا کر دیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے بلاوے پر میں دلّی ریڈیو اسٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہُوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لئے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدلہ لینا ملے گا۔ یعنی اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے، لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پاکر آیا تھا، اس لئے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقعہ ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، اس لئے ہم کیوں تماشہ بنیں۔ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اُس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا اور دوسرے وہ پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھا تھا، اس لئے میری کوششیں بار آور نہیں ہوئیں — ریڈیو کا دفتر اُن دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے اسٹیشن ڈائریکٹر، پروگرام ڈائریکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے (جو شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں راشد، دوسرے میں کرشن، اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہُوا تھا اور میں کوئی فیچر لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہُوا آیا اور اِدھر اُدھر کی بات کرکے اُس نے 'خوشیا' کی بات چھیڑی۔

"مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تمہیں میری کہانی خوشیا پسند نہیں آئی؟" وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا: "تمہیں اُس میں کیا پسند نہیں آیا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی مصلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں، میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو۔ فضول کے بحث مباحثے میں مت پڑو۔ لوگ تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کیوں تماشہ بنیں.....

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اُس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دُہرایا اور شاید کوئی سخت بات بھی کہی۔ مجبوراً میں نے کہا: "کہانی وہ اچھی ہے، لیکن حقیقی نہیں۔"

"کیوں حقیقی نہیں؟"

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا: "تمہیں ایک خیال سُوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلاّل کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردِ عمل کو قلمبند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلاّل ہوتا، کانتا اُس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اُسے وہیں دبوچ لیتا — تم نے جو کچھ لکھا

وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے، ان پڑھ دلال نہیں۔"

کچھ اسی طرح کی بات بڑے زوروں سے میں نے کہی۔ منٹو لمحہ بھر کو چُپ رہا۔ پھر تلملا کر بولا: "ہاں ہاں، میں وہ دلال ہوں، منٹو وہ دلال ہے۔ تمہیں افسانہ نویسی کا علم ہی ہے۔ تم خود کیا لکھتے ہو؟"

لیکن اُس وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے اڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہُوا، بہرحال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا۔

...... لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہُوا۔ دلّی میں جو چپقلش اس کے بعد رہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ بھول سکا۔ گذشتہ سال نقوش کے کسی خاص نمبر میں اُردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہُوا تھا۔ اُس وقت، جب اُردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (ادھر جو افسانے اُردو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہوئے ہیں) مجھے آٹھ برس ہونے کو آئے ہیں اور میرے احباب اور اُردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا۔ "خوشیا" کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی منٹو سے میری چشمک نہ ہو، میں اپنی میز بھی اُٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا، لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اُترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

اُن دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا۔ کرشن چندر ڈرامے کا انچارج تھا، میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اُس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا: "بولو بھئی، کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟" موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈرامہ آرٹسٹ ——— غلام محمد، رفیع پیر (جو اب فلم ایکٹر ہیں) تاج محمد وغیرہ اُسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انہیں ڈرامہ سنایا بھی کرتا تھا اور وہ سُن کر "منٹو صاحب، آپ ڈرامہ کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے غرور پہ جا کے اُڑایا کرتے تھے۔ جاوید اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا۔ اور اڈوانی اُس سے اس لئے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے سیکرٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہر وقت 'منٹو صاحب، منٹو صاحب' ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ لنچ کے وقت بھی اُس کے، اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ کھڑا ہوتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا، اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اُس کا ساتھ نہ دیتے، مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا: "دیکھو بھائی، تم منٹو کو سمجھا دو۔ وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے، میں طرح دیے جاتا ہوں۔"

"تم بھی اُسے تنگ کرو۔" کرشن نے کہا۔ "میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا؟"

اور اُس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اُس کی کہانی 'دھواں' شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تُلا ہُوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لئے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی

آکر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا — "میں نے تمہاری کہانی 'دھواں' پڑھی ہے"

"کیسی لگی؟"

"اچھی ہے، اب تم چپٹی پر لکھو۔"

منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دہرا دی "بس اب تم چپٹی پہ لکھو!"

اس وقت عصمت نے لحاف نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا۔ اس لئے اس نے کہا "تم کیا جھک مارتے ہو؟ میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

اس وقت میرا مجموعہ 'پاپی' چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لئے طرح دے کر میں نے کہا۔ "میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لئے میرے ڈراموں کی بات چھوڑ دو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو، جیسی جھک مارتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ 'کروٹ' میں تم نے اپنے نام سے افسانہ "دلہن" کی کہانی چرا لی ہے۔ روح کا ناٹک، پورے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے۔ (اس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا) اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا، لیکن طبعزاد تو لکھتا ہوں۔ میری اچھی بُری چیز میری اپنی ہے۔ کسی دوسرے کی چرائی تو نہیں۔"

منٹو جھلا اٹھا، لیکن میں وہاں نہیں رکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا، لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا، اس کے لئے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا آیا۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اس شام وشوامتر عادل اپنے دوست اور ریڈیو کے مسٹر مدن موہن بھلّہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اس نے آکر بتایا کہ منٹو نے انہیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ 'ادب لطیف' میں اس نے افسانہ کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا تھا اس سے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا، کیونکہ تماشائی بڑے جوش سے تھے۔ اور منٹو کیا کہتا ہے وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے، لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا، اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ نخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ 'خوشیا' کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے۔ 'نیا قانون'، 'ممی'، 'شوشو'، 'ڈرپوک'، 'موسم کی شرارت'، 'ہتک'، 'مسٹر ڈی کوسٹا' مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلی میں رہا، میں نے کبھی منٹو کے سامنے اس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی، اس لئے خوشامد کرنے پر وہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا۔ لیکن خوشامدی کے لئے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلی بلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا، لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا، اس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی، منٹو اس طرفداری کا فائدہ اٹھا لیتا تھا، لیکن کرشن کے لئے اس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ اسے بھی گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ ان دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے، اس لئے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کر لے، یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زور و شور سے کرتا حتیٰ کہ خاصی چپقلش رہتی تھی۔

جنسی دونوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن مکمل کرنہ سکے لیکن انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبرو ریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسند والے عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سمجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لئے تمہیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑھ ہانکی، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھونگا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا۔ لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع ——— یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی ——— پر افسانے لکھے۔ منٹو نے "بلاؤز" اور میں نے "اُبال" دونوں افسانے 'ساقی' دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے۔ 'اُبال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اُسے اُس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اُس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ 'بلاؤز' اور 'اُبال' اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں بلاؤز کے انجام کی حقیقت کریہہ حقیقت ہے وہاں اُبال کے انجام میں نوکر کی ٹریجیڈی کے ساتھ سماجی ٹریجیڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAL REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی بھی ہے، اُس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیئے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ بحث طویل ہے اور فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے پیرو اِس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں میں نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اُس کی بڑی تعریف ہوئی، لیکن پھر میں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا، تقریباً انہیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اُسی کے حربوں کو اُس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:-

> "میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا "منٹو
> بھائی ——— آگے راستہ نہیں ملے گا ——— کار موٹر روک لو ———
> اُدھر باجو کی گلی سے چٹ جاؤ ——— اور میں باجو کی گلی سے پاکستان
> چلا آیا۔"

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اُڑی تھی کہ اُسے فلم میں نوکری مل گئی ہے۔ لیکن دو سال بعد

اُس نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا —— باجو کی گلی سے —— آگل راستہ نہ ملنے پر —— بالکل ویسے ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے۔ کوڑی نہ رکھ کفنی کے لئے، کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا —— سرِ قائم جنگ دائم —— اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ اُن کا خیال تھا کہ اُن کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا، اس لئے وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا ہے۔ پیٹنے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو، لیکن پیٹنے والے کو نہ چھوڑو —— میری صحت لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی طرح تو میں کیا لڑتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہو گئی اور کشمکشِ حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے کو پیٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دلی میں میں نے اُسے زک دے دی، لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ برابر رہی۔

"دھواں" کے سلسلے میں ہم میں جو چشمک ہوئی اُس کے بعد میرے اور اُس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن اگرچہ مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لئے ڈھال بن جاتا تھا، اس لئے میرا وار اوچھا پڑتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو راشد سے بھی بگاڑ بیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جانے لگے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ اُنہیں دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ "ماورا" کے نام سے شائع ہوا، جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اُڑایا۔ اُس نے "نیلی رگیں" کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں راشد کی نظموں سے الفاظ لے کر اُن کا مذاق اُڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھئے :-

سعید ۔ (شاعر) کرشن، تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن ۔ ٹھنڈے ہاتھ ......؟

سعید ۔ ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو —— اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں —— ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں —— کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں یوں داخل ہو جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آ نکلے۔

کرشن ۔ (مذاق کے طور پر) اپنی دُم سے لالٹین باندھے —— نہیں —— چاند کی ڈلی جو سستا ہوا ادھر آ نکلے۔ نہیں آج ہو کیا گیا ہے سعید۔ یہ ٹھنڈی برف عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اُڑاتا رہا، پھر اُس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈھ لیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن راشد اسے نہیں بھولے۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لئے دیا۔ راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر اُنھوں نے مسودہ واپس کیا۔

"کیسا ہے؟" منٹو نے پوچھا۔

"نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔" راشد نے اُس استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو اُن کی اپنی چیز تھی۔

اور منٹو بقول خود کباب ہو گیا۔ اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور اُن کی نظموں کو کوستا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اُس نے راشد کی

نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

مہندی صلاح کار کی حیثیت سے بہں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لئے منٹو مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ تاہم مجھے پریشان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کرکے پروگرام ڈائریکٹر (پروگرام اگزیکٹو) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اُس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا۔ اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اُس کا کہنا مانتے تھے۔ پروگرام ڈائریکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لئے اُس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے، اور بہت سی باتیں کرشن براہ راست ڈائریکٹر سے منظور کرا لیتا تھا۔ راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل ہے۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن اُن کو نظر انداز کر جائے۔ اس لئے انھوں نے اُس کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے اُن کی غیر حاضری میں اُن کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور بخاری صاحب تک راشد کی براہِ راست رسائی تھی، اس لئے فوراً تبادلہ کرا دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد اُمید کرتے تھے کہ میں اُن کی تائید کروں گا، لیکن جب میں نے کرشن کی طرفداری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا بیٹھنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائریکٹر (مسٹر ایڈوانی) کو گانٹھ لیا۔ ایک کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اُسے پریزنٹ کیا اور یوں اُسے اپنی طرف بلا لیا۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لئے انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لئے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیڈول پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے مہندی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا ——— نہایت بدصورت۔ لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے صبح اُسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اُس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اُس دن کا کام نمٹانے لگا۔ لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اُس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اُسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیئے وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اُسے اچھی نہ لگی تھی۔ اُس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اُس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو، جواب دہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اُس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان مسودے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کی کرسی ہے" ساتھ ہی اُس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اِدھر آ جایئے"

میں نے نگاہیں اُٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا "میں اُوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آ جایئے گا"

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصّہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے اُن سے مل

چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں اُن کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل اُنھیں یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر اُن سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اِس کا شائق بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایک بار جب جنگل صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اُٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے، اُس کی انگیجنٹ پہ مجھے کھل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ اُنھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی ناگہانہ چمک میرے دل پر دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اُسی غصہ میں ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ استعفا دیدوں، پھر خود ہی اس پہ ہنسی آ گئی۔ جھلایا ہوا اُوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر سامنے آ گئی ـــــ خدا گواہ ہے اگر منٹو اُس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ نہ آیا ہوتا اور اُس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو دلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اُس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لئے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پہ غصہ آتا، اُس لکھنوی پی۔ اے پہ غصہ آتا، لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منٹو پہ۔ اُس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اُس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی۔ اے ہے نہ راشد۔ منٹو ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزہ چکھاؤں گا۔ میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا اُس میں منٹو ہی کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اُس میں ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ پہلے کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ، کام دام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا، ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے مہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان اُن سے وابستہ تھا یا بچپن سے والد محترم سے اُس مہرشی کے کارنامے سن سن کر میں نے اُسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہرحال ہمیشہ جب مجھ پر مصیبت آئی، میری سمجھ اور سوچ کی قوتیں اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اُونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا (اور یہ بات کتنی بھی بُری کیوں نہ ہو) اُس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچتے سوچتے مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اُسے بھڑکایا، لیکن جو منٹو کے کہنے میں آ گیا، اُس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اُس وقت بھی ہندی میں میرا کافی نام تھا۔ اُس نے میرا نام نہ سُنا ہو، ایسی بات نہیں۔ وہ سمجھدار ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں مجمع میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلۂ کار بنایا جائے۔ اور کچھ دیر بعد نیچے گیا۔ لکھنوی پی۔ اے سینہ تانے، چوٹی تاک چڑھائے، نتھنے پھلائے، لکھنؤ کے اپنے قصے سنا رہا تھا کہ کیسے چیپ صاحب (جو اس وقت لکھنؤ کے سٹیشن ڈائرکٹر تھے) اُسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اُس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ پاؤں کرسی پہ رکھے، گھٹنے بانہوں میں دبائے ہمہ تن گوش اُس کی لن ترانیاں سن رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چوپڑہ صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے اُن لکھنوی حضرت سے کہا: "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی۔" اور میں نے اُسے شام کو گھر پہ چائے کے لئے مدعو کر دیا۔

میں اُن دنوں تیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اُس لکھنوی احمق کو ریج پہ لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کئے جا رہا تھا کہ کس طرح اُس نے ڈرامے لکھے، کس طرح چیپ صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح اُنھوں نے اُس کی سفارش کر کے اُسے پروگرام اسسٹنٹ

بنا دیا۔ میں نے بھی اُسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اُس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اُسے سمجھایا کہ اگر شروع ہی سے اُس نے اپنا سکہ جما دیا تو سب اُس سے خوف کھائیں گے، نہیں آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو ہتھو بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈکاسٹ ہوں اُنہیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ (VETT) کرے۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک بھی چیز پڑھے اور ویٹ کئے بغیر براڈکاسٹ نہ ہونے دے گا۔ "اب جب آپ آ گئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں" میں نے کہا "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لئے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی تو اردو مسودے ہی آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سن کر ویٹ کیا کیجئے اور پوری اچھی طرح دیکھ کر براڈکاسٹ کیجئے، کیونکہ خراب ڈرامہ براڈکاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہو گی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔" اس پر اُس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہوا۔

اب شیڈول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا۔ میں مہینے دو مہینے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو ہی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) "آوارہ"! پلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے اُن دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن اُس لکھنوی پی۔ اے۔ نے اُس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اُسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اُسے سنانے لگا۔ اُس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا "کیوں صاحب اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے؟" اور وہ کہتا ــــ "ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیئے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا۔ یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائے گی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اُس کی جگہ تین اختتام تجویز کر دیئے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اُس لکھنوی پی۔ اے۔ نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اُس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ بڑا خام ہے۔ اُس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈکاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے، اُن کو اپنا پرانا بدلہ نکالنے کا موقع ہاتھ آیا اور اُنہوں نے وہ چند الفاظ بھی، جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیئے تھے، بدل دیئے۔

جب منٹو کو معلوم ہوا کہ اُس کا ڈرامہ ویٹ ہوا ہے تو اُس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گیا اور اُس نے راشد اور اُس لکھنوی پی۔ اے۔ کو بے نقط سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہو گا تو بنا ایک لفظ کٹے ہو گا، ورنہ نہیں ہو گا۔

میں اُوپر نوبی کلارک (انگریزی اناؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشندان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ میں اُٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ اُنہوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہو گا تو انہیں تبدیلیوں کے ساتھ ہو گا ورنہ نہیں ہو گا اور ڈیوی ایشن (DEVIATIN) یعنی تبدیلی کے انحراف کی ذمہ داری اُن کی نہیں ہو گی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے۔

اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تقریباً دہاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہو گا تو اسی روپ میں ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اُردو کا ٹائپ رائیٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لئے تھے اور اُوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا، اُس سب کا صلہ اُن چند لمحوں کی اس کی تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔ "سنار دی ٹھک ٹھک، لوہار دی اکو سٹ"، میں نے من ہی من پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں، اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً اُنھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرحال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے مخمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر اطمینان کی سانس لی۔
لیکن اُس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اُداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا —— آنکھوں کے سامنے منٹو کی جھلاہٹ، اُس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اُس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں —— سب کچھ گھوم گیا —— اور اس جھلاہٹ کا باعث میں تھا —— میں جو درحقیقت اُسے چاہتا تھا، اُس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اُس کے افسانوں کا اُس کے نام نہاد چاہنے والوں سے کہیں زیادہ مداح تھا —— میں، جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'چرواہے' اُس کے نام معنون کیا تھا۔
'چرواہے' کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام لکھا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اُس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قضیہ پیش ہوا۔ لکھنوی پی۔ اے۔ نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو۔ لیکن چونکہ ڈیوی ایشن کا سوال تھا، اگر وہ ڈرامہ نہ ہوتا تو اُس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چننے کی بات تھی اس لئے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اُٹھائی۔ لکھنوی پی۔ اے۔ نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی سو اُس نے پڑھ دی۔ بہرحال منٹو کی تنقید ہو اور وہ بھی بھری میٹنگ میں، یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ لکھنوی پی۔ اے۔ کی سمجھ کے بارے میں اُس نے دو تین تیز باتیں کہیں۔ اور تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے —— اور چونکہ سب قطع برید میں نے کی تھی اس لئے میں نے بڑی صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اُجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، منٹو نے کیا کہا، لیکن غصہ میں اُس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ ٹکنیک کے ضمن میں میں کچھ نہیں جانتا، اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمھیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اُوپر میرے کمرے میں آؤ تو تمھیں بتاؤں، ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور سن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں ہو گا اور چونکہ اپنے آرٹسٹ کا سوال ہے اس لئے جدول سے انحراف نہیں ہو گا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رُکا۔ اُس نے ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوپہر کو خورشید صاحب (سکریٹری انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ) کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈ کاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگایا تھا اور پھر اُنھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ راشد چونکہ تُلے ہوئے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لئے منٹو نے خورشید صاحب کے ذریعے اُسے کینسل کرا دیا تھا۔)

دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ ڈرامہ اس نے منگا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری وہ کری ہی اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بمبئی میں اُسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلمستان میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اُس کا دوست نذیر جا کر اُس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

" وہ تمھارا لال کیا ہؤا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے " اچانک منٹو نے کہا۔ یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصّہ تھا، نہ اُس لکھنوی پی۔ سے پر بلکہ منٹو پر غصّہ تھا، اسی طرح منٹو کو بھی اُن دونوں کے بجائے مجھی پر غصّہ تھا، اُس کا ڈرامہ میں نے کاٹا ہے، یہ بات وہ جان گیا تھا۔

" اب تمھارے کیا ارادے ہیں؟ " میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

" دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر یہیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے فلمستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں، آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور یہ چخ چخ رہی تو کیا فائدہ "

" نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا " اور اُس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اُس دن گھر واپس آکر میں نے صفیہ بھابی سے کہا " دیکھیے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں آ نہیں رہا تھا۔ دوبارہ تار دینے پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ 'آوارہ' کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دلّی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لئے تماشہ بنے ہیں۔ اب اُس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجیے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کریگا تو میں بھی تنگ کرونگا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے "

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کئے لیکن 'ہاں' کر دی۔ لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقعہ ہی نہ آنے دونگا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو۔ اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے اُن سے مل کر میں نے 'فلمستان'، اُس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریقِ کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر اُن لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

۱ - فلمستان کا باس مکرجی زمانۂ قدیم کے سادیت پسند اُن داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار کر اُن سے کام لیتے تھے۔

۲ - فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔

۳ - جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔

۴ - فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں ـــ ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے شاہد لطیف اور سنتوش کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اُس نے بھی مجھے وہاں بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلمستان میں کام کرنے کے لئے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی دے گی تو چونکہ [illegible] بھی بمبئی جا رہی تھی، لہذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اُس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اُس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اُس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس نتیجے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے، اس لئے میں اس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لئے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا۔ اور جب اُس سے پہلی ملاقات میں، جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے، وہ مجھے اچھا لگا تھا — گورا چٹا رنگ، پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پہ استہزا آمیز مسکراہٹ — منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں 'ممی'، 'نیا قانون'، اور شاید 'مسز ڈی کوسٹا' پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی۔ لیکن دلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لئے جو پارٹ وضع کئے گئے تھے اُن سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا، میرا جی اور راجہ مہدی علی خاں راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لئے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی، لیکن اچھے سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا — منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اُس کی اور اُس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اُسے ڈھیلا کر دیا — منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد — ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اُس کا افسانہ 'بو' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اُس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے اس کے بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے 'بو' کی خوب تعریف کی۔ مجھے 'بو' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی۔ میں اُس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے 'بو' میں سمویا ہے، وہ نہ صرف قابل داد ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر مبتدی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانے کی تکنیک کو جاننے کے لئے وہ 'بو' ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اُس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا 'لاجونتی' ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اُردو ادب میں اُس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاجونتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ 'بو' کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا، اُس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اُس کا خلاصہ اُسے بھیج دیا۔ کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رُخ کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائریکٹر نتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام تجویز کیا۔

لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بمبئی میں ہوئی۔ منٹو اگر شراب نہ پیئے ہوتا اور دہلی کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے "آوارہ" کے اُس مسودے کا ذکر نہ کرتا جسے میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ میری طرف سے منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دھل ہوگئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اُس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلمستان میں اُس کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اُس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا یا شاہد کا یا میرا یا ستنوشی کا گٹ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی۔ اس لئے اُس نے میری مخالفت کی۔ جس وقت اُس نے مجھے بلایا اُس وقت شاہد لطیف اور ستنوشی فلمستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو مکرجی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمہارے مکالموں کے پرخچے اُڑا دیگا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے لیکن تمہاری جان ضیق میں آجائے گی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اُس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اُڑائی تھیں اُس کا انتقام لینے کی ترکیب اُس نے یوں نکالی تھی۔ اور چونکہ میں ہاں کر چکا تھا اور دہلی میں مشہور ہوگیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لئے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحہ عمل طے کر لیا۔

میں نے اُس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کئے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی۔ (یہ پہلی احتیاط تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے) اور یہ طے نہیں ہوگیا کہ صرف میں ہی نتن بوس کے لئے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے مترا نے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے لکھے اور یوں فلمستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اُس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی عادت کو جانتے ہوئے نت جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا پہلا فلم "مزدور" خواہ باکس آفس پر کامیاب نہ رہا تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم "سفر" باکس آفس پر بھی کامیاب رہا، اور ظاہر ہے کہ میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکرجی مان گئے۔ منٹو کے دونوں فلم "چل چل رے نوجوان" اور "شکاری" دو دو سال لینے کے باوجود ناکام رہے تھے۔ اِس لئے اشوک کمار میرے پاس آئے اور اُنھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے اُن کو دو تین پلاٹ، جو میرے ذہن میں تھے، سُنائے۔ اشوک نے ایک پسند کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں۔ لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا —— میں اُس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا —— لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہوں، کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اُس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے لکھوں گا۔ اگرچہ اشوک کمار مکرجی کا سالا تھا لیکن اُن دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا "آپ مکرجی سے کہیئے"۔ لیکن مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کر دیا تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجئے گا، لیکن اس دوران میں آپ ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالئے۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اُس نے واچا کو ساتھ ملا لیا۔ واچا اشوک کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو اُنھوں نے اُس وقت تک نہ آنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اُس کا مہورت ہو جائے گا۔

چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لئے "آٹھ دن" کے فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں یہ ایک الگ لمبی

مانی ہے، لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لئے افسانہ لکھ دینا منظور کر لیا (یہ اور ت ہے کہ جب آدھی فلم بن گئی تو اُس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا) اور اچھی خاصی سازش کر کے میرا پتّہ ٹ دیا اس لئے مجھے بہت بُرا لگا ـــــ خصوصاً اُس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا ـــــ مورت ہو گیا۔ مکرجی مجھ سے خوش نہ تھے اس لئے سوا اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا، اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد ٹی نے منٹو سے بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ 'آٹھ دن' کا ڈائریکٹر فلمستان کا ایڈیٹر دتارام پائی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائریکشن تو اشوک ہی کرتا تھا، لیکن چونکہ پائی بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لئے اُس کی چلتی تھی۔ میں نے پائی کو ساتھ ملایا اور 'آٹھ دن' میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا، لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اُس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں دکھایا جائے۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا، اس لئے پنڈت کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو میں چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اُس کے دو بنا دیتا۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو علم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لئے وہ مضحکہ خیز رول میں کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے۔ اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو اُن کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں پنچ گنی سے الہ آباد آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اُس نے کہا کہ اُس نے کہانی لکھی تھی، لیکن ہم نے کمال امروہی کی کہانی 'محل' لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا، حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہاری والی کہانی بنائیں گے لیکن اُس نے نہیں سُنا۔

درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا۔ اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنہیں کبھی اُس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جب اُس نے دیکھا کہ آگے راستہ بند ہے، کار موٹر نہیں چلے گی تو وہ بالو کی گلی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چھٹیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگانا اور خود بیکار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا ثبوت نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چُنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا، منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس رن چھوڑیت اور باری صاحب کی رن چھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رنچھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا جبکہ منٹو کی رنچھوڑیت اُس کی زبردست انانیت کے باعث تھی، اور اُس کی اسی انانیت میں اُس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر اُن کی خوشنودی کے لئے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں، مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں، لیکن غالب کو سمجھنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر اُن کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!) اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے، اَن پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں

کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے ٹکراس کر نے سنا ہے (جسے منٹو ٹکراس اور دوسرے بزلہ سنجی کا نام دیتے تھے) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اس کی "انا" کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اول تو یہ کہ وہ ان کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو سنکی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈائیلاگ رائیٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں جہاں راشد نے، میں نے اور اس کلکھنوی پی۔ اے۔ نے اس کے ڈرامے کی "تنقید" کی اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا اس کے جگری دوستوں نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی، اور جب اس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لئے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہیں جما رہتا، لیکن منٹو کی انانیت کے لئے وہ ہتک ناقابلِ برداشت تھی، اور چونکہ پٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا، اس لئے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اس کی جان پر آ بنی، لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (نارمل یا اِنفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط نہ کئے تھے، اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں، اور میں مکرجی کو غالب کے بجائے مہادیوی ورما کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا، لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں۔ بمبئی میں امریکہ کا یا انگلستان کا، یہ مجھے یاد نہیں، ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چونی لال نے اسے فلمستان مدعو کیا۔ شام کو فلمستان کی کینٹین میں، جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میزیں لگا دی گئیں اور گیان مکرجی، اشوک، واچا، چٹلکر، برمن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم ایشن میں جانا تھا، اس لئے اسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے (BOSSES) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بزلہ سنجی ان پر ضائع کرتا رہا۔ میں، نیپالی، برمن، وغیرہ صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سا منہ ـــــ جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو کھینچ ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ ان کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے بٹھا یا تھا۔ بہرحال اس کے آگے آگے رائے بہادر چونی لال اور مکرجی آ گئے۔ کینٹین میں ایک بڑی میز بن گئی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لئے تھی۔ اور چھوٹی میزوں پر دوسرے ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا، لیکن منٹو، اشوک اور واچا کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن زیادہ تھے، دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اٹھ کر چھوٹی میز پر چٹلکر کے پاس منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے، منٹو چپ چاپ پاس سے گزرا تو میں نے کہا "کیوں؟"

دیکھنے
ہو
ماتھا ہیں بھی بدھو
مشدھر مکرجی،
پروڈیوسرز کی اسپوسی
منٹو حسب معمول باسز
کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر
ہیں کس کر کھینچا کر دیا ہو، بالکل
حور کو اس لنگور کے پہلو میں لا
کا میز بچھی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی
لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ
ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ
بھی ملکوں میں سے تھے، مکرجی نے واچا اور منٹو
جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا لیکن
کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا جب وہ میرے

"چلو چلیں۔"

"کیوں؟"

"سب بکواس ہے۔"

"بیٹھو" میں نے کہا "جہاں اس بکواس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔"

لیکن منٹو نہیں رکا، خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

"گنجے فرشتے" میں منٹو نے شیام پر جو سکیچ لکھا ہے، اس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ لاہور میں شیام آیا تو اس کو ملنے والے اتنے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی انا کو بار بار ٹھیس لگتی تھی ——— منٹو لکھتا ہے :-

"شیام نے مجھ سے کہا ——— میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اس سے وعدہ کرکے کہ رات کو میں اس سے فلیٹیز ہوٹل میں ملونگا، چلا گیا۔"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اس کے ساتھ رہے،) اور کچھ نہ تھی، اس کی انا تھی۔ اس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ مرجی نے جب منٹو کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ یکلخت اداس ہو گیا، اور پھر وہاں بیٹھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا ——— منٹو، شیام سے ملنے فلیٹیز بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً شیام نہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا۔ لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے اور منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہوگی۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا، لیکن پٹنا نہیں، چڑانا جانتا تھا لیکن چڑنا نہیں، اسی طرح مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات چبھ سکتی ہے، ایسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا، لیکن انسان کی یہ عام خامی ہے۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے، لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں انھوں نے اس کے خلاف لکھا، بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ انھیں روپیہ بے دریغ اور بچکانی چیزوں پہ نہ خرچ کرنا چاہیئے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیئے ——— صفحۂ قرطاس پہ زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی کی بعض عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ لیکن ان دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعوے کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا ———

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا ——— اس کا نام تھا "ترقی پسند" ——— چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ

دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لئے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ سب مجھے معلوم تھا، کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سُنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو۔ بہر حال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح شام اُسے افسانے سُنانے لگے۔ بیدی اُس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اُس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی، پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا اور بھی مشکل ——— بیدی شام کو تھکا ہارا آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سُنانے کے لئے تیار رہتے۔ سُن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اس میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اُٹھتا تو اُسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا ——— مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔

منٹو کی کہانی "ترقی پسند" کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی ٹچ دیا ہے کہ ترپاٹھی (ترقی پسند میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اُس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب جب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لئے بھی غسلخانہ ہی بہتر جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے مُنہ سے سُنا ہوا) منٹو نے قلمبند کر دیا، اس لئے مجھے بُرا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا۔ یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیئے تھا کہ دیکھو یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں تمھیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو سے افسانہ نگار کو اِتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اُسے قلمبند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا۔ اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات و اطوار، شکل و شباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا، اُسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھ کر منٹو کی ذاتی زندگی اور اُس کی خامیوں کو اُجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ اُنھوں نے ہی لکھی ہو گی۔ بیدی نے اُس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے ——— "نئے دیوتا"۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن (نئے دیوتا میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہو گا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لئے اُس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی ——— غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بُنتا رہا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اُس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں ——— ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے۔۔۔۔"

اور یوں شروع کر کے "نئے دیوتا" کے لکھنے والوں نے نفاستِ حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، سفلے پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اُڑایا کہ منٹو بلبلا اُٹھا۔ (بعد میں جیسا کہ اُس کی عادت تھی، اُس نے خود اپنی سنک اور سفلے پن کی تشہیر شروع کر دی[1])

---

[1] جوگیشوری کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا: "البتہ جب میں میٹھا میٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔" (لذتِ سنگ)

"نئے دیوتا" کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلّی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت بھی وقت اتار کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لئے یار دوستوں کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ دوست احباب جب بیٹھے ہوتے، کسی نہ کسی بہانے اس کہانی کا، یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے ——— منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا۔ دنیا جہان کا مذاق اڑاتے ہوئے، مذاق کئے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے۔ گپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کئے، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ راشد، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور میراجی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید پیچھے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے ادھ لیٹے، ادھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی، اس لئے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پہ ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ نہیں جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا "لیکن 'نئے دیوتا' تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔"

"وہ ......" کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس وقت اس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی بپھرا ہوا بیٹھا تھا اور کرشن کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

اور تب کسی نے منٹو کو بناتے ہوئے کہا "ارے یار ستیارتھی کیا لکھا کرے گا اور کیا افسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔"

"بیدی کا تو نہیں" تیسرے نے کہا "لکھا تو ستیارتھی ہی نے ہے، بیدی نے اس میں پیچ لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے۔"

"ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے ......"

اور اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کئے اور سب کی آوازیں دبا کر جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڈھوں سے نکالتے ہوئے کہا "بیدی اور فیض کیا، اس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، رستم کا ہاتھ ہے، سنت سنگھ سیکھوں اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے، منٹو ... ایک انسٹی ٹیوشن ......"

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا۔ منٹو کو بات ختم کرنے کا موقعہ دیئے بغیر میں نے کہا "اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے، وہ شیام لال کپور تھا نہ، گرو گھنٹال کا ایڈیٹر، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا"

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو تلملا کر اٹھا اور اس نے غصے سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیئے۔

کوئی دوسرا موقعہ ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیتا۔ لیکن لڑنے کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق مذاق میں جو چڑ جاتا ہے، گالی دیتا ہے، یا ہاتھ اٹھاتا ہے دراصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زور سے ہنس دیئے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "کیا کرتے ہو؟" اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے انگریزی میں کہا "ڈو نوٹ مائنڈ اٹ!" (DO NUT MIND IT)

اس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اٹھاتا۔ لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ

اُٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے۔ "آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا تھا۔ چونکہ دن کو سٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی یہ ڈکش سے لی تھی اس لئے "آٹھ دن" کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو رات کو سیٹ پہ آنے کا عادی نہ تھا۔ اُس کے اشغال دوسرے تھے۔ لیکن جب سے میں نے تکرام بھڑا کر "آٹھ دن" میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں ردّ و بدل کرنے لگا تھا۔ تو منٹو رات کو بھی سیٹ پہ آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیا پلا یا کرتا تھا اور سیٹ پہ آنا اُسے بہت شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اُس کے مکالموں کو مسخ نہ کر دوں، اس بات کا اُسے ڈر تھا۔ اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اُس نے جو زیادتی کی تھی، اُس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا، اور اُس کو تنگ کرنے کے درپے تھا۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر ہے۔ اس موقعہ پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سننے والوں کو غلطی اُسی کی معلوم ہوئی۔

'آٹھ دن' کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنچ گنی چلا گیا تھا، اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لئے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرانی تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے، سر پہ پنڈتوں سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے (یہ پارٹ ایلا مصرا کر رہی تھیں) میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آ گیا "تو کیا میں جھک مار رہا ہوں"۔ یا شاید یہ فقرہ تھا "میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا"۔ بہرحال جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہار پان لئے رہے تھے۔ منٹو پہنچے ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا سین شوٹ ہونے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا "میں یہ ڈائلاگ نہیں بول سکتا"

"کیوں؟" اشوک نے پوچھا۔

"جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے۔ ویدی پہ بیٹھا ہوا، ویدوں کا وکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا"

"لیکن یہ تو محاورہ ہے" منٹو تنک کر اُٹھا۔

"بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں، لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا" میں بولا۔

"لیکن محاورے کا مطلب تشدّد بھرا نہیں"

"جھک کیا ہے، مچھلی۔ جھک مارنا، مچھلی مارنا — مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا"

"بنگال کے پنڈت مچھلی مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں"

"لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے"

"تم بکواس کرتے ہو" منٹو جھلا اُٹھا "تمہیں یہی فقرہ بولنا ہوگا"

"میں نہیں بول سکتا۔ میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں"

"میں بھی برہمن ہوں" منٹو گرجا۔

"برہمن تمہارے اجداد ہوں گے۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو"

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اُس وقت بھی ہنسی آ رہی تھی، لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پر بیٹھ کر ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت لچر تھا، لیکن جو لوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اعتراض لچر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے آتے ہی ایک دم وزن عطا کر دیا۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ناستک وہاں مہورت کرتا ہے (حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثے ہوتے ہیں، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اٹھاتے ہیں) میری بات اشوک اور واچا کو ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی تو میرا پلہ اور بھی بھاری ہو گیا۔ اور چونکہ میں محض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لئے میں نے کہا "دیکھو منٹو، میں پہلوان نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو، اور تم نے اب بھی بولے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دونگا۔"
معاملے نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رُک گئی۔ انہیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں اڑے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈز پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے (یا شاید مجھے لے گئے، یہ مجھے یاد نہیں) لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔
اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ پھر کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں، مناظر تک بدل ڈالے، لیکن پھر اُس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے (سالے والے تو وہ کہتا ہی رہتا تھا) لیکن کرشن کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا تھا۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اُس نے اور مجھے گالی دی۔ اُن دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ (مکھرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لئے سنتوشی کو پھر بلا لیا تھا اور "آٹھ دن" کے لئے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن منٹو سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا، اس لئے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا) ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آ رہے تھے، کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم تو نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ہمیشہ لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا، اور اپنے ہیڈ ایڈیٹر جناب ساگر چند کوہاٹا کے ساتھ (جو بعد میں روزنامہ پرتاپ کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں) میلے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لڑکپن کا دوست موہن سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ دور ہی سے اُس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اُس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اُس سے بغلگیر ہو گیا۔ کوہاٹا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انہیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیر مقدم کی یہ پرانی رسم ہے۔ آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے، اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے، لیکن جالندھر سے لاہور آنے والے اشک اور الہ آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے، کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا اور ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے۔ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اُس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی،

آپس میں بے تکلفی نہ تھی، یارانہ نہ تھا، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا: "دیکھو منٹو، تم امرت سر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں۔ میں گالیاں دوں گا تو تمہاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔ دوبارہ تم مجھے کبھی مت گالی دینا۔"

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کھال کھینچنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر معافی مانگ لیتا تھا، اتنا مادہ اس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے۔ میں نے خود اس بات پہ غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہے اور ہم لڑنے پر مجبور ہیں۔ اگر کہیں برابر مل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایک دوسرے کے مہرے کو کاٹ کر کشت دینے والے مہروں کی طرح!

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو، ایسی بات نہیں۔ لیکن ہماری اتنی احتیاط کہ ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تن رہا۔ ٹھیک سن یاد نہیں، لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا۔ راشد پروگرام ڈائرکٹر کی کرسی پر جا براجے تھے، اپوپڑا صاحب کو ابھی منٹو نے پھانسا نہیں تھا، منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دیئے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ اچانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی ——— "اشک!"

"منٹو!" ——— مجھے خیال آیا ——— اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اس کے گھر (۹ حسن بلڈنگ کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا حالانکہ میں بس ہزاری میں بھیروں کے مندر کے سامنے رہتا تھا، اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو دور رہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ آیا تھا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے۔ (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا)۔

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ نہ اٹھ کر دروازہ کھولا، کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

"اشک!" وہی کرخت، تیکھی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو، صفیہ بھابی اور ان کے ساتھ ایک گورا چٹا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے والا نوجوان ——— تینوں اندر آ گئے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ "یہ مسعود پرویز ہے (میرا بھتیجا یا میرا دوست منٹو نے کیا کہا، مجھے یاد نہیں) تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا چلو ملا لائیں۔"

میرے پاس اس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال بھارگو میونسپل کمشنر دہلی نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لئے بارکوں جیسے ۲۶ کوارٹر بنا رکھے تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے، راشد ایک نمبر میں، میں تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں میں نے ایک کرسی میز کام کرنے کے لئے رکھ چھوڑی اور بیٹھنے کے لئے ایک دری اور جاجم فرش پہ بچھا رکھی تھی ——— اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا، "بیٹھو بیٹھو" اور کوشلیا کو آواز

دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آ گئے ہیں۔ منٹو اور پرویز بیٹھ گئے، صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ کرشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آ گئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں۔ سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں، اس کا ناک نقشہ بےحد دلکش تھا اور میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہوگا۔ (شاید وہ اس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا جانے کی کوشش کر رہا تھا) منٹو ادھر ادھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پرویز سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کونسی میری چیز پڑھی ہے، وہ کب دلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا۔ وہ بات چیت کو میں نے ذاتی پیچ نہیں دیا۔ منٹو کو باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ جب کرشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغل کے نوش کو چھوڑ کر اسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابی کرشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آ سکتی تھی، صفیہ کرشلیا کو چاہتی تھیں اور کرشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی۔ لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اس نے بنایا، اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں، اس کے اس طرح آواز دینے میں، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آ کر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکرگزار ہونا چاہیے تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی یہ کیفیت مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ میں اکھڑ آدمی ہوں، منٹو بھی اول درجے کا اکھڑ رہا ہے، لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ وہ بےساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا اور پاس ہی دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابی اور کرشلیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا، جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور چونکہ میں منٹو کے آنے کا صحیح مقصد جانتا تھا، جسے اس نے احساس برتری کے پردے میں دبا رکھا تھا، اس لیے میں کھل نہیں سکا۔ ہلکا سا رحم کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے ذرا نیچے اترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا، لیکن ان بلندیوں سے اسے اتار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا —— دلی میں ہی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں، اور اس نے دلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اترنا اسے منظور نہ ہوا۔

جو بِک نہ سکا

ہاجرہ مسرور

یہ غالباً ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ لکھنؤ میں ایک صبح کو ایک پولیس والا میرے گھر کا دروازہ اپنے ڈنڈے سے کھٹکھٹا رہا تھا، اور مجھے میرے نام سے پکار رہا تھا۔ پولیس والے کا یہ رعب داب، میرے لئے بڑی دہشت ناک شکل اختیار کر گیا کیونکہ میں جس ماحول کی باسی تھی، وہاں کسی لڑکی کا نام گھر کے افراد بھی اونچی آواز سے پکارنا بے حیائی سمجھتے تھے۔ میں ان دنوں جگر کی تکلیف میں مبتلا تھی، اور بستر پر پڑے پڑے چٹپٹے قورمے کے لئے ضد کر کر کے رویا کرتی تھی۔ پھر حال معلوم ہوا کہ لاہور کی کسی عدالت کا سمن میرے نام آیا ہے۔ بظاہر بہادر بنتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے سمن لیا اور پڑھا۔ منٹو صاحب نے "دھواں" کے مقدمے میں گواہ صفائی کے طور پر مجھے بلوایا تھا۔ میں نے گھبرا کر دستخط کر دیئے لیکن سمن کی خوفناک عبارت نے حواس غائب کر دیئے تھے۔ ایک قانون دان عزیز کو فوراً بلوایا تو کہیں جا کر "عدم حاضری کی صورت میں وارنٹ گرفتاری" کا خوف دل سے نکلا —— انہی قانون دان عزیز سے معلوم ہوا کہ میری گواہی عدالت تسلیم نہیں کرے گی۔ کیونکہ گواہ کے سلسلے میں کچھ عمر وغیرہ کی بھی قید ہوتی ہے —— اس بات سے اوس سی پڑ گئی۔ میرے بجائے میڈیکل سرٹیفکیٹ گیا —— لیکن اس سارے قصے سے خواہ مخواہ مارے اہمیت کے برا حال ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ "ادیب پن" اپنے اوپر طاری کر کر کے سب سے کہے جا رہے ہیں، کہ "جناب یہ منٹو بھی عجیب ہیں" "مجھ سے تو پوچھا ہوتا" (کچھ یوں جیسے منٹو صاحب اپنے لئے انتہائی روزمرہ قسم کی چیز تھے) اس قصے کے تیسرے یا چوتھے دن جبکہ مجھے لاہور میں ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے منٹو صاحب کا خط اور ان کے عدالتی بیان کی نقل ملی۔ انھوں نے نہایت پُر تکلف انداز سے بلا اجازت میرا نام گواہانِ صفائی میں رکھنے پر معذرت کی تھی۔ یہ ان کا میرے نام پہلا خط تھا —— (دوسرا اور آخری خط لاہور میں ملا، جبکہ وہ "اردو ادب" مرتب کر رہے تھے)

منٹو صاحب کو اس وقت تک میں نے بہت کم پڑھا تھا، حتیٰ کہ "دھواں" بھی اس کے بعد پڑھ سکی۔ مگر "نیا قانون" میرے دل پر بری طرح نقش تھا اور میں اس زمانے میں محض اسی ایک افسانے کی وجہ سے انھیں بہت بڑا افسانہ نگار مانتی تھی —— منٹو صاحب کو میں نے معذرت کا ایک طفلانہ سا خط لکھ ڈالا، جس میں میں نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا، لیکن عمر وغیرہ کی قانونی باریکی کو ٹال گئی۔ اس خط[۱] کا کوئی جواب نہ آیا، مجھے دکھ سا ہوا کہ

۱؎ کافی عرصے بعد جب کہ منٹو صاحب ترقی پسندوں سے بہت ناراض تھے۔ میرے اسی طفلانہ سے خط کو نقل کر کے ایک کتاب اس خط کے نام معنون کر دی۔ وہ خط شائع ہوا مگر میرا نام غائب تھا۔

شاید منٹو صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار میرے عدالت میں حاضر نہ ہونے سے ناراض ہو گئے ہیں۔

پھر جب مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے وہاں مقیم کئی مشہور ادبی شخصیتوں کو خط لکھے جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ آپ جیسے بڑے افسانہ نگار سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے ——— سب کا جواب آیا، مگر منٹو صاحب کا جواب نہ آیا ——— میں اس بات کو بھول سی گئی۔ کچھ روز بعد ایک صاحب نے مجھ سے نہایت بے تکلفی سے جارحانہ انداز سے سوال فرمایا "آپ نے منٹو کو ملنے کے لیے خط لکھا ہے ———" ان کا لہجہ کچھ اس قدر تعجب آمیز تھا کہ لیکن تم کا تھا کہ میرے منہ سے بلا ارادہ "نہیں" ٹپک پڑا۔ ——— اپنے مخصوص قسم کے "چار دیواری ماحول" سے باہر آ کر بھی ہوا کا ایسا اوپر حملہ آور سی لگتی تھی ——— "ہیں نہیں" پہ اڑی رہی۔ اور ان صاحب نے قصہ یوں پاک کیا کہ "میں نے خط اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" میں اس بات پر بہت چڑچڑائی کہ منٹو صاحب بھی کیسے عجیب آدمی ہیں۔ آخر بڑے ادیبوں سے ملنے کا شوق نئے لکھنے والوں کو ہوتا ہی ہے۔ اس میں عجیب بات کیا تھی جو انھوں نے سب سے تذکرہ کر ڈالا ——— اس کے بعد منٹو صاحب سے نہ تو میری ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت ——— [illegible] وہم میں نہیں ہے تو ان کی یہ بات بھی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ [illegible] آکر میں نے کئی بار انھیں دور سے دیکھا، مختلف ادبی جلسوں میں ——— وہ ہمیشہ اتنے زرد نظر آتے کہ بے ساختہ ان کی زندگی کی دعا کرنا پڑتی۔ بڑی بڑی بے چین آنکھیں، اور بھوؤں کے درمیان سلوٹیں جیسے ان کی نظریں ایسی چیز کی تلاش میں ہوں جسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ ایک دفعہ ایک ادبی مجلس میں جہاں منٹو صاحب کے فن کے بارے میں ایک صاحب مضمون پڑھ رہے تھے۔ مجھے بحیثیت صدارت صحیح الفاظ میں ایسی حماقت پر بیٹھنا پڑا۔ یہ شرف خود اپنی جگہ، ہم جیسے کم نظروں میں چھپ کر بیٹھنے والوں کے لیے بے حد اذیت بخش ہوتا ہے، اس پر وہاں کا تناتنی کا ماحول، اور سب پر مستزاد منٹو صاحب کی موجودگی ——— میں نے بہت لوگوں سے سن رکھا تھا کہ منٹو صاحب اپنے فن پر کسی قسم کی تنقید نہیں سن سکتے۔ اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منٹو صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک لفظ بات نہ کہے۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے اپنے چہرے کو زرد ہاتھوں میں لئے بیٹھے رہے ——— ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی ——— ادھر بولنے والے کی طرف ان کی بے چین آنکھیں یوں جھپٹتیں جیسے کچھ پانا چاہتی ہوں ——— لیکن جب بات ختم ہوتی تو یوں ہٹتیں جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ پائی ہو ——— اس دن منٹو کے اکیلے بہت سے نقاد کچھ آپے میں تھے ہی نہیں، اور منٹو صاحب کا چہرہ اس کا شاہد تھا ——— منٹو صاحب کی اس دن کی مضطرب خاموشی سمجھ کے لیے حیرت انگیز تھی ——— منٹو صاحب ضبط بھی کر سکتے ہیں، یہ بڑی عجیب بات تھی۔

آخری بار میں نے انھیں ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ جس وقت اپنی بیوی صفیہ کے ساتھ آئے، تو کسی مضمون پر تنقید ہو رہی تھی ——— سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ اور ذرا سے گھٹے ہوئے کمرے میں بغیر پنکھے کے بہت سے لوگ چند موم بتیوں کی روشنی میں بیٹھے تھے ——— منٹو صاحب آتے ہی اپنے مخصوص انداز سے آستینیں چڑھا کر اور ایک پاؤں بنچ پر رکھ کر بیٹھ گئے اور تنقید میں حصہ لینے لگے ——— ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بے حد زرد اور دبلے ہو رہے تھے ——— صفیہ کے قریب بیٹھے بیٹھے، مجھے ادیب منٹو کے بجائے صرف صفیہ کے شوہر سعادت حسن کا خیال آنے لگا۔ صفیہ ان کی صحت کے بارے میں بہت فکر مند تھیں اور بڑی مایوس تھیں ——— لیکن آج جبکہ منٹو صاحب اپنے افسانوں کی طرح اچانک موت کی وادیوں میں جا کر ختم ہو گئے ہیں تو میں سوچتی ہوں، اب صفیہ کی ایک نگہ موت نے لوٹ لی تو وہ اپنی تین بچیوں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر کتنی ڈھیر سی فکروں میں مبتلا رہتی ہوں گی ——— منٹو صاحب کے مداحوں کو یہ بات بھی ضرور سوچنا چاہیئے۔

مجھ سے منٹو صاحب پر مضمون لکھنے کو کہا گیا ہے ——— مگر ذاتی طور پر ان سے میرا کتنا واسطہ رہا ہے، میں ابھی تک یہی کچھ بتا رہی تھی۔ ان کی ذات کے بارے میں متضاد قصے ہیں لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق منٹو صاحب کو دیکھتے اور پرکھتے ——— ان باتوں میں خود منٹو صاحب کس حد تک سچے تھے۔ میں کیا سمجھ سکتی ہوں ——— اس لئے ان کی ذات کا معاملہ اسی جگہ چھوڑتی ہوں۔

اب رہا منٹو صاحب کا فن تو اگر اس کا تجزیہ ہی درکار ہو تو اس خدمت کے لئے باقاعدہ نقادوں کی کمی نہیں کیونکہ وہی لوگ فنی اصطلاحیں برتنے

سلیقہ رکھتے ہیں سیدھے سادے انداز سے کہی ہوئی بات کا شمار تنقید میں نہ ہوتا نہیں۔ اس لئے منٹو صاحب کے فن پہ اگر میں کچھ کہوں تو اس کی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ منٹو صاحب کے فن پر لکھنے کا جواز اگر یوں ڈھونڈھوں کہ میں نے بھی چند افسانے لکھے ہیں تو یہ قطعی ضروری نہیں کہ جس نے افسانے لکھے ہوں وہ منٹو کے فن پر کوئی عالمانہ رائے بھی دے سکے ——— ہاں فنی ردِ عمل دوسری چیز ہے۔ اور میں چند سطروں میں اس ردِ عمل کو بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ جو منٹو صاحب کے افسانوں سے میں نے قبول کیا۔

منٹو صاحب حد درجہ "شدید" افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کو ان کے فن کے مدِ نظر "نرم"، "متین"، "شریف" اور "لطیف" افسانہ نگار کہنے کی جرأت ہو تو میں منٹو صاحب کو "شدید" افسانہ نگار کہوں گی۔ منٹو صاحب اپنے دور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اس چیز کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انہیں کھٹکتی تھی۔ اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو نظر انداز بھی کر ڈالتے تھے۔ ریشم کی لچھیوں میں اگر سوت کا ایک ننھا سا تاگا بھی نظر آ جاتا تو وہ اس کے گرد اپنے ردِ عمل کا ایک ایسا جال تیار کرتے تھے کہ ان کی بنت کی خوبی اور نفاست تک اردو افسانہ نگاری کے بہت کم استاد پہنچ سکتے ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ منٹو صاحب موضوع کے انتخاب میں تو اتنے شدت پسند تھے مگر موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجے کے شعوری اور متوازن فن کار بن جاتے تھے۔ مختصر افسانہ نگاری کی تکنیک کو پوری تکمیل اور احتیاط سے برتنے کے فن میں اگر اردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار منٹو کے مقابل لایا جا سکتا ہے تو وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔

منٹو صاحب بے حد جری افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی مخالفت سے کبھی شکست نہ کھائی۔ انھوں نے حکومت کی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ نقادوں کی مخالفت پڑھتے سے منہ پھیر لیا۔ ادیبوں کی مخالفت پر حقارت بھری نظر ڈالی۔ معاشرت کے ٹھیکیداروں اور اخلاق کے اجارہ داروں کی مخالفت کو ٹھکرا دیا اور زندگی کے کسی لمحے میں بھی کسی سے ہار نہ مانی ——— یہ ضرور ہے کہ یہ پھر یا کسی قسم کا نقطۂ نظر فن کار کو نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ کیونکہ ہر مخالفت کی بنیاد بدنیتی پر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات خلوص بھی نکتہ چینی کی بنیاد بنتا ہے۔ اور اس قسم کی نکتہ چینی میں فن کار کے اپنے کام کی چیز بھی نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ کہ ہر مخالفت کو ٹکرا کر واپس ہو جانے پر مجبور کرنے کے لیے کسی شخصیت کو اپنے ارد گرد ایک حصار سا بنانا پڑتا ہے۔ اور یہ حصار نہ صرف مخالفت کا منہ پھیر دیتا ہے بلکہ بسا اوقات مشاہدات اور محسوسات کو بھی محصور کر کے ٹھنڈی تازہ ہوا سے محروم کر دیتا ہے ——— لیکن اگر یہ "حصار" محض اس لئے بنایا گیا ہو کہ "فن" کو کہیں اس سے کمتر درجے کا خون مجبور نہ کر ڈالے تو اس قلعہ بندی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ منٹو صاحب کی اکل کھری ضد بڑی حد تک اسی زمرے میں آتی ہے ——— انھوں نے معاشرت کے چہرے پہ داغ دیکھ لئے تھے۔ اور اس لئے وہ معاشرت کے حسن پہ ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو جھٹلانے سے انکار کرتے تھے۔ اور اخلاق کی اس اٹوٹ قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ داغوں کو نظر انداز کر کے معاشرت کے حسن کا قصیدہ کہو ——— یا پھر داغوں کو بھی لوازمات حسن قرار دو۔ یہ درست ہے کہ منٹو صاحب آئے دن کی نصیحتوں سے کچھ ایسے بلا کے متنفر مزاج بن گئے تھے۔ اس لئے وہ معاشرت اور اخلاق کے ان مطالبات کا مذاق اڑانے کے لئے شدت پر بھی اتر آتے تھے۔ لیکن اس انتہا پسندی میں بھی شرارت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ شدت ضرور موجود ہے۔ اور فن میں شدت کوئی جرم نہیں ——— بعض رنگوں کو گہرا کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ زندگی کا کوئی بھی رخ سپاٹ نہیں۔ جو لوگ ہلکے خوابیدہ رنگوں کو فن کا اوج قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی دراصل رنگ کے ہلکے پن کو بالواسطہ گہرا کرتے ہیں۔

منٹو صاحب سے پہلے بھی طوائف اور بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ان کے دلال، اردو ادب میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں ——— لیکن ان میں (امراؤ جان ادا الگ رکھنے کے بعد) بہت کم اصل تصویریں تھیں۔ طوائفیں یا تو نہایت بقراط تھیں یا محض سماج کا کوڑھ، جن پہ ادیب تھو تھو کر کے آگے بڑھ جاتے ——— دلال بھی جھلک دکھا جاتے، اگر صرف اپنے لباس کی۔ منٹو صاحب کا سب سے بڑا اور زندہ رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب

میں پہلی بار سنجیدگی سے، اس گرے ہوئے طبقے کو داخل ہونے دیا ——— اور فتویٰ صادر کرنے کے بجائے، اس طبقے کے ساتھ ساتھ نظر آئے۔ وہ تو جو کچھ ہوتا ہے، جو کچھ ہے، جیسا کچھ ہے اسے بغیر کلیاں پھندنے ٹانکے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اور پھر پڑھنے والے کو اجازت تھی، وہ جو رائے چاہے قائم کرے جو علاج مناسب سمجھے کرے۔ منٹو صاحب کی طوائفیں، بگڑی ہوئی لڑکیاں اور دلّال، بدمعاش، غنڈے، ہمارے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں آتے ہیں۔ اور ہم آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہیں۔ اور ہماری ہی طرح ان کے بھی لطیف انسانی احساسات ہیں۔ انھیں بھی دکھ پہنچتے ہیں، ان کی بھی ہتک ہوتی ہے۔ یہ محبت بھی کر سکتے ہیں اور قربانی بھی دے سکتے ہیں ——— یہ روزگار کا زخم بھی کھاتے ہیں، دوسروں کے امین بھی ہوتے ہیں، اور مددگار بھی ——— اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو صاحب نے ان "گرے" ہوئے لوگوں کو پہلی بار اردو ادب میں پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ——— اسی سلسلے میں منٹو صاحب پر الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ عریانی پہ اتر آتے تھے ——— اب یہ الگ بحث ہے کہ عریانی کیا ہے اور کیا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ آرٹ اور ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ الزام عائد ہوتا ہے ——— مگر للہ کوئی اتنا تو بتلائے کہ کیا "عریانی" میں ایک دلکشی، ایک بے داغ سی معصومیت، ایک رنگ، ایک راگ سا نہیں ہوتا جو تخلیق اور نسلِ انسانی کی بقا کے مقدس تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی محترم یا محترمہ دس بچوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت اور عریانی کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو "سفلی جذبات" یا اسی قسم کے دوسرے نجس الفاظ کا نتیجہ قرار دیں ——— مگر یہ بحث بھی منٹو صاحب کے مخصوص فنی رنگ سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی، کیونکہ منٹو صاحب کو میں جس قدر پڑھ سکی ہوں (کچھ کو چھوڑ کر) اس میں خصوصاً طوائف سے متعلق افسانوں میں) اکتسابِ لذت یا ویسا ہی بننے کی اکساہٹ کہیں نہیں پائی ——— اب ذرا "ہتک" کی ہیروئن ہی کو دیکھ لیجئے۔ اپنے غلیظ بستر پر ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔ ایک بازو سر کے گرد رکھے ہوئے۔ منٹو نے اس عام انداز کے لئے چاند کے گرد ہالے کی خوبصورت تشبیہ لکھ کر ساری عورتوں کو یوں بغیر آستین کے کپڑے پہن کر سونے کی ترغیب نہیں دی۔ بلکہ تشبیہہ دی بھی تو بغلوں کی کھال کے متعلق یہ کچی مرغی کی کھال کی ——— خدا جانے وہ کس دل گردے کے بزرگ ہیں جنہیں یہ کچی مرغی کی کھال دیکھ کر لذت کا دورہ پڑ سکتا ہے ——— یا پھر کاغذ کی طرح سفید انجان کی نسکار، ٹھوڑی کھوئی ہوئی آنکھوں والی سراج کو دیکھئے، جو واہیات سے واہیات جنسی حرکتوں پر اتر کر بھی بے جان ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو بکنے کے لائق بنانے کے لئے چرس والی سگرٹ کے دم لگاتی ہے ——— کیا کسی کو یہ ادا آگے بڑھنے کی اجازت دے سکتی ہے ——— میں نے جہاں تک منٹو صاحب کے مشہور و معروف "عریاں" کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نارمل انسان انھیں پڑھ کر لذت حاصل نہیں کر سکتا بلکہ جنسی فعل کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے ——— جو ایک سادہ انسان کے لئے ایک مسئلہ بن سکتی ہے ——— جس کے خلاف یہ نفرت اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ منٹو صاحب ان جنس میں ڈوبے ہوئے کرداروں پہ تشبیہوں اور استعاروں کا رنگ و روغن نہیں پوتتے ——— یہ لیپ پوت منٹو صاحب کی فطرت کے خلاف تھی، اس لئے وہ اتنی سچائی سے ان کی تصویر اتارتے کہ وہ بگڑی ہوئی تصویریں ہی نہیں بلکہ ایکسرے فوٹو بن جاتیں ——— ایکسرے فوٹو ڈاکٹر حضرات غور سے دیکھیں تو دیکھیں، ان سے لذت اخذ کرنا عام ذہن کا کام نہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد منٹو صاحب نے اقتصادی اعتبار سے اپنے بدترین دن گزارے۔ یہ عرصہ ہی زمانہ منٹو صاحب کی فنی بلندی اور ذہنی پختگی کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن افسوس کہ اسی زمانے میں اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک ایک دن میں تین تین افسانے لکھوا لئے ——— ہمارے مغرب زدہ نقاد جو اپنے ملک کی ہر چیز کو حقیر گرداننے کے عادی ہیں، ذرا بتائیں تو کہ کیا یورپ اور امریکہ کے ادیبوں نے پیٹ بھر روپے کمانے کے لئے ایک دن میں تین تین افسانے لکھے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہاں کے معمولی سے معمولی ادیب کی ایک کتاب بازار میں آجائے تو وہ بڑی شان سے سال دو سال کچھ نہ لکھ کر، صرف سوچ کر گزارہ کر سکتا ہے ——— منٹو صاحب نے تقسیم سے قبل اپنے اس قلم کے بل بوتے پر بہتر دن گزارے تھے، اور پاکستان آکر بھی وہ اپنی بیوی اور بچوں کا معیارِ زندگی قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ——— مگر ہمارے ملک میں صرف قلم ذریعۂ آمدنی

نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند روپوں کی خاطر نہایت گھٹیا قسم کے رسائل میں لکھتے رہے۔ منٹو صاحب کو اس زمانے میں کثرت سے لکھنا پڑا۔ اکثر موضوعات پر شاید، وہ بمبئی کے دورانِ قیام میں کبھی قلم نہ اٹھاتے۔ یا اگر اٹھاتے تو دوسرے انداز سے ـــ مگر لاہور آ کر ضروریاتِ زندگی کی طلب نے ان سے سبھی کچھ لکھوا دیا ـــ بہت سے افسانے جو لکھے گئے انہیں بہتر حالات میں شاید تھوڑا اور سوچ کر لکھا جاتا ـــ مگر ان تمام پریشانیوں کے باوجود منٹو صاحب کی عظمت سے کون منکر ہوگا کہ وہ دانستہ بکے نہیں۔ ایک دفعہ انہی دنوں کے دور میں چچا سام کے ایک نمائندے نے ان سے تین سو روپے فی افسانہ طے کر لیا، مگر منٹو صاحب کی رگِ طنز پھڑکی اور انہوں نے تین سو (غیر ملکی) روپیہ فی افسانہ کے بجائے (غالباً) پچیس تیس (ملکی) روپیہ فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے ـــ منٹو صاحب کبھی بک نہ سکے اور نہ ہی کوئی انہیں کھلے بندوں اپنے حق میں استعمال کر سکا ـــ وہ طبیعت کے کھرے تھے۔ اس لئے کسی قسم کی پابندی انہیں گوارا نہ تھی۔

آج منٹو صاحب ہم میں نہیں۔ وہ اپنی انمٹ بہادری کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن ان کا فن، اردو ادب میں ناقابلِ فراموش کارنامے کی طرح دھڑکتا رہے گا ـــ منٹو صاحب کے فن اور موضوع پر سینکڑوں اعتراض بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر منٹو صاحب کی ایک خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا۔ اور وہ خصوصیت تھی، انسانیت دوستی اور زندگی کو صاف اور بے داغ دیکھنے کا جذبہ جو ان کے فن کا مجموعی تاثر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کو "بو" بیکار کی چیز معلوم ہو، لیکن کیا قارئین کے دل میں "بو" کی گھاٹن کے لئے "کیوں" نہیں گونج اٹھتی۔ جس کا میل اور گندی ساری بھی ایک جنسی بدہضمی کے شکار نوجوان کے لئے باعثِ کشش ہوئے۔ کیا خوشیا سے کوئی شخص نفرت کر سکتا ہے۔ کیا "سرکنڈوں کے پیچھے" بکنے والی بھولی بھالی لڑکی سے آپ کو محبت نہیں ہو جاتی جسے یہی نہیں معلوم کہ وہ گناہ کرتی ہے ـــ یہ ہمدردی اور انسانیت دوستی کی لہر ایک دو افسانوں تک محدود نہیں ان کے زیادہ تر افسانوں میں موجود ہے۔

یہ انسانیت دوستی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے ـــ اور مختلف اشخاص میں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی سانچہ مقرر نہیں۔ کہ یہاں غالب کو رکھو، یہاں پریم چند کو، یا یہاں سعادت حسن منٹو نہیں سما سکتے ـــ یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ اس انسانیت دوستی پر کون سی مہر ثبت ہے۔ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت دوستی ہے۔ کلبیت نہیں ـــ انسانیت سے نفرت نہیں، انسان کو فطری اور جبلی طور سے کمینہ اور رذیل قرار دینے کی عادت نہیں۔ یہاں پیٹ بھری تھکن، اضمحلال اور مایوسی نہیں بلکہ یہاں تو یہ جذبہ کار فرما ہے کہ انسان بڑی ہی پیاری مخلوق ہے۔ یہ طوائف کے بازار میں بھی انسان ہی رہتی ہے ـــ اگر اس کے معاشرتی زخم مندمل ہو جائیں جن کی طرف فن کار اشارہ کر رہا ہے تو یہ دنیا کتنی پیاری اور یہ زندگی کتنی لطیف ہو جائے۔ اور منٹو کے فن کا مجموعی تاثر یہی جیتی جاگتی انسانیت دوستی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ذرا اتنا سوچئے کہ سعادت حسن منٹو اگر بہتر دنیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کے موضوعات کیا ہوتے، اور ان کا جاندار قلم کیا کیا حسن نہ بکھیرتا۔

رحمدل دہشت پسند

ابو سعید قریشی

آزادی کی تقریب سعید پر امرتسر میں جب پہلا فساد ہوا تو میں لاہور میں تھا سعادت بمبئی میں۔ غلاموں نے آزادی کی خوشی میں اپنے ہمسایوں کے گھروں کو آگ لگا لگا کر چراغاں کیا۔ اور اس اعلان سے قبل کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہوگا یا ہندوستان میں آدھا شہر ملبے کا ڈھیر ہو گیا۔ اس جشن کے ناٹک کا جب پہلا سین ختم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ جاؤ اور جو کچھ لا سکتے ہو لے آؤ۔ لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے چوک فرید میں ہی روک لیا۔ یہ مسلمانوں کا چوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا "وہاں جانا خطرناک ہے۔ اغلب یہی ہے کہ تم راستے میں ہی دھر لئے جاؤ گے ـــــ ہاں اگر مسلم لیگ کی لاری آ گئی تو شاید کچھ اُدھر جانے کا بندوبست ہو سکے"۔ لیکن مسلم لیگ کی لاری نہ آئی۔ میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا "کیا کٹڑہ جیمل سنگھ تک بھی نہیں جا سکتا؟" جواب ملا "صرف شہابے شیر فروش کی دکان تک"۔ اس کے آگے ہندوؤں کا راج تھا۔ میں نے یقین دلایا کہ شہابے کی دکان سے ادھر ہی رہوں گا اُدھر نہیں جاؤں گا ـــــ کٹڑہ جیمل سنگھ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر برلن کا نقشہ پیش کر رہا تھا ـــــ شہابے کی دکان سے اِدھر کوچہ وکیلاں کے سامنے ملبے کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ اس گلی میں منٹو کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر ملبے کا ڈھیر مجھے اپنے ماضی اور حال کے درمیان آئرن کرٹن کی طرح آویزاں نظر آیا جس کے اس پار دیکھنا محال تھا لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا "یار زندہ صحبت باقی" ـــــ میں نے اینٹ پتھر کے اُس انبار کی طرف سے منہ پھیر لیا جو کوچہ وکیلاں کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا آؤ چلیں۔ لیکن آج کہ میرا دوست دُنیا میں نہیں ہے ملبے کا وہ ڈھیر آپ سے آپ اٹھ گیا ہے۔

کوچہ وکیلاں منٹوؤں کا محلہ تھا ـــــ سعادت کہا کرتا کہ منٹ کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہمارے آباؤ اجداد کے یہاں دولت ترازو سے تلتی تھی۔ اس رعایت سے ہم منٹو کہلائے۔ میں نے منٹو کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی۔ دوستوں کو آدمی کھرے پن اور تعاون میں [illegible] پڑتا۔ بعینہ جس طرح چاہنے والا محبوب کے خد و خال کو کتابی معیاروں کے مطابق مسطروں سے نہیں ناپتا۔ لیونارڈو نے اگر مونا لیزا کے

ہونٹوں کو شیشۂ محدب سے دیکھا ہوتا تو مصوّری کی دُنیا اپنی حسین ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی ——— ان نوکرچہ وکیلاں منٹوؤں کا محلہ تھا۔
گلی میں قدم رکھتے ہی دائیں طرف مسعود پرویز کے والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ اس سے آگے خواجہ عبدالحمید ڈی۔ ایس۔ پی کا مکان۔ اس مکان کے سامنے ایک حویلی تھی۔ خواجہ عبدالحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہوگی۔ وہ امرتسر کے بچے بچے کو جانتے تھے۔ انھوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا کس کے بیٹے ہو؟ میں نے بتایا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں: "ارے ارے تو تو اپنا بچہ ہے۔ تیرے دادا جب گاؤں سے اٹھ کر شہر آئے تھے۔ تو شروع شروع میں یہیں تو لیا تھا مکان۔ جیسے گھر کے سامنے جو حویلی ہے نا۔ لسّی منگوایا کرتے تھے ہم تمہارے گھر سے۔ او ہو ہو کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے ......"
اس حویلی کے سامنے شمال کی طرف سعادت کا مکان تھا۔ اس کا ایک دروازہ جنوب کو کھلتا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف۔ اور یہی سعادت کے کمرے کا راستہ تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دائیں ہاتھ۔ یہی کمرہ منٹو کی تحریروں میں "دارالاحمر" کے نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ "دو" کھوکھے رکھ کر ان پر گدا اور گدے کے اوپر ملتانی کھیس بچھا دیا گیا تھا۔ سامنے شمالی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی الماری۔ جو کتابیں الماری میں نہیں سما سکتی تھیں میز پر دیواروں کے سہارے پڑی رہتیں۔ کتابوں کے علاوہ قلم دوات، کاغذ، پنسلیں۔ میز کے بائیں جانب آتشدان تھا۔ جس پر بھگت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمے کے ایک طرف نیل کا ٹیبل لیمپ تھا۔ اور دوسری طرف پرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسیور۔ ایک پبلک ٹیلیفون سے جب متعدد کوششیں کرنے کے بعد بھی اُسے مطلوبہ نمبر نہیں مل سکا تھا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کو کھینچ کر اور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ "یہ کیا فراڈ ہے"۔ اس نے خود اپنے لئے بھی کئی بار "فراڈ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی ایک چیز تھی۔ جو اُسے نہیں آتی تھی۔ اس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ وہ بڑا صاف شفاف آدمی تھا۔ اس آنچل چاندنی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے پاس بچھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار ۱۹۳۱ء میں گیا۔ میں اُن دنوں ہندو سبھا کالج میں سائنس سٹوڈنٹ تھا۔ ایک روز میں نے اُسے کالج کے جنوب مشرقی برآمدے میں دیکھا۔ اس نے سرخ دھاریوں کی بوسکی کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اور سفید بوسکی کا پائجامہ۔ پاؤں میں چپل تھی۔ اور قمیض کے اوپر اونچا سا (فیشن کے مطابق) گرم کوٹ۔ وہ میرے ایک ہندو ہم جماعت پرکاش کی تصویر اُتار رہا تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر کالج کے فارسی دان سینئر "بہ خالِ ہندواش بخشم سمرقند و بخارا را" کے حال میں مبتلا ہو جاتے۔ اور مصرع اولیٰ کے "اگر" کی خاطر لڑکیوں سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کو تیار نظر آیا کرتے۔ پرکاش کو منٹو کے کیمرے میں اُترتے دیکھ کر تصویر و مصوّر دونوں کو چشم حور نے گھیر لیا۔ میں نے منٹو کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا۔ جواب ملا "ٹامی"۔ میں نے یہ نام سن رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول، محلے اور پھر کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اس کی شرارتیں تھیں۔ خیر یہ "ٹامی" جو اس وقت گویا پری کو شیشے میں اُتار رہا تھا۔ مجھے کچھ عجیب وضع قطع کا آدمی نظر آیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی معقول آدمی بوسکی کا پائجامہ اور لال دھاری کی قمیص گویا نائیٹ سوٹ میں کالج بھی آ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تصویر کی اینلارجمنٹ کے لئے میں عاشق علی فوٹوگرافر کی دکان پر گیا۔ جس کے نام کا اُن دنوں بہت چرچا تھا۔ اس کے پاس ایسے ایسے کیمرے تھے۔ جو ہمارے شہر کے فوٹوگرافروں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ بمبئی کی فلمی دُنیا سے [illegible] تھا اور اس کے شوکیس میں فلمی ستاروں کی تصویریں۔ روشنیوں اور سایوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاروبار سے [illegible] آرٹ کی زیادہ فکر تھی۔ اس کے سٹوڈیو میں گاہک کی تسلی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر اپنی تصویریں بھی پھاڑ [illegible] خوشی سے لے جاتے۔ لیکن وہ تصویر ہی کیا ہوتی کہ مصوّر کا اپنا جی خوش نہ ہو۔ وہ اعلانیہ شراب پیتا [illegible]

اس کی پھبتی۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تین تصویریں بنائیں اور پھاڑ ڈالیں: "کچھ بات نہیں بن رہی یار" بات بنانے کے لئے وقت درکار تھا۔ اس لئے میرا اکثر وہاں پھیرا رہتا۔ یہیں تامی سے میری ملاقات ہوئی۔ "کینیڈے پر کاش کی تصویر کیسی آئی" میں نے پوچھا۔ جواب ملا "فلم ہی کب تھی کیسے بنی"

ہماری یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ مارلین ڈیٹرخ کی ٹانگوں پر مرتا تھا اور میں گاربو کے حسین اداس کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔ جس مقام پر میں اب پہنچا تھا وہ اسے چار برس پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا تھا اور میں مئی ۱۹۱۶ء میں۔ خیر فلمی ستاروں کی کشش ان کے دو مفلوک الحال غائبانہ عشاق کو دونوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالب نے کہا تھا ؎

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا"

لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ "ذکر اس پری وش کا" رقیبوں کو رازداں بنا دیتا ہے۔ منٹو سے میری دوستی کے لئے میں گریٹا گاربو اور مارلین ڈیٹرخ کا احسان مند ہوں۔ ان کی تصویروں کی کشش مجھے پہلی بار کوچۂ وکیلاں میں لے گئی۔ ہال روڈ سے امرتسر کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے ہو گئے۔

سعادت کی میز کے پاس الماری میں رنگا رنگ کے فلمی رسالوں کے انبار لگے تھے۔ اس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی پر بچھا دیا۔ "دیکھو جو تصویر چاہو لے سکتے ہو۔"

ہم نے چیدہ چیدہ تصویروں کو فریم کروانا شروع کیا۔ فریم کے لئے ان دنوں بائنڈنگ پیپر ابھی نیا نیا چلا تھا۔ فلمی قسم کی فوٹوگرافی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے امرتسر میں رواج دیا۔ ہمارا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ ہال روڈ کی پنڈلیاں اس پہ کوڈک کی گرٹ۔ نتیجہ اور خود مصور کر لیتے۔ لیکن یہ عشق ہمیں بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود بائنڈنگ کریں گے۔ مگر گرٹ اب بھی مہنگی تھی۔ سوچا کہ پیسٹل پیپر (PASTEL PAPER) آزمانا چاہیئے۔ تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا ان دنوں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر بھگت سنگھ، مارلین ڈیٹرخ اور جون کرافورڈ کے سامنے کی دیوار پہ آویزاں تھی۔ بند کالر کا کوٹ۔ سر پہ کشمیری وضع کی پگڑی۔ خشخشی داڑھی۔ بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے بیٹے کے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید ان کی غضب آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لئے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بمبئی چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ کہا کرتا "میاں جی اللہ بخشے بڑے سخت گیر آدمی تھے"۔ سعادت کی بہن بتاتی ہیں "جان خطا ہوتی تھی اس کی میاں جی کے ڈر سے۔ پتنگ اُڑا رہا تھا ایک روز کوٹھے پر۔ میاں جی آ گئے اتنے میں ——— چھت سے کود پڑا یہ برابر کے کوٹھے پہ۔ چوٹ آئی۔ لیکن کیا مجال ہے جو سی تک کی ہو"۔ وہ سیڑھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہیں تھا۔ رحم کی پکارنے والوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر پتنگ اُڑاتا رہا۔ اور اسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں کے سروں پہ بھی آن گرا۔ لوگ بلبلائے جھلائے، گالیاں دیں۔ قانون کو مدد کے لئے پکارا۔ لیکن منٹو نے کہا مجھے بھی پتنگ اُڑانے کا حق ہے۔ آسمان کی وسعتوں پر کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سر پہ کود جاؤں گا جو میرے پتنگ پہ "کاٹی" پھینکے گا میں اس کی کھوپڑی پہ مٹی کی بیٹ مار دوں گا۔

سعادت نے اس کھیل کے دوران میں اس نے متعدد چوٹیں کھائیں۔ لیکن رحم کی درخواست کبھی اس کی زبان پہ نہ آئی۔ وہ داد طلب تھا فریاد کرنے سے اس کے لب ناآشنا تھے۔

اس کے والد منصف تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد

کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی اولاد ——— سعادت اور اس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کیلئے کچھ باقی نہ بچا۔ تلخ یادوں کے سوا۔ منٹو کی تحریروں میں یہی کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے۔ جیسے قند کی گولیوں میں یکایک کونین کا ٹکڑا آجائے۔ یہ تلخی کتنی دیرپا تھی اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا۔ اخلاق کے ٹھیکیدار اُسے عمر بھر کچہریوں میں لئے لئے پھرے کہ یہ عریاں نویس ہے۔ فحش نگار ہے۔ یہ جنسی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ انھوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدم سب سے پہلے تماش بین تھے (نعوذ باللہ)۔ لیکن منٹو کے ہاں جنسی تلذذ تھا ہی کہاں۔ اس نے قوام کی گولیاں کبھی نہیں بیچیں۔ اس کی دکان میں کونین تو ضرور تھی کریم نہیں تھی۔ اس کا منہ کڑوا تھا۔ کڑواہٹ کے احساس کو کند کرنے کیلئے اس نے اور کڑواہٹ اپنے اندر انڈیلی۔ بوتل کو منہ لگا لیا ؎

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

دو سال سے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔ وہ ہر وقت مدہوش رہتا تھا۔ شراب سے اُس کا جگر چھلنی ہو چکا تھا۔ ۵۳ء کے اواخر میں وہ مرتے مرتے بچا۔ ڈاکٹروں نے اسے معجزہ سمجھا۔ اور کہا "سال یا دو سال اور ——— اگر اب بھی نہ چھوڑی تو"۔ ——۔ لیکن اس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا۔ گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی تھکی ہوئی روح کو سبو سے ساغر تک فاصلہ بھی بہت نظر آیا۔ اپنے اور ابدیت کے درمیان وہ بلور کا پردہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ وہ گذرِ زیست کا تھکا ہوا راہی جس پر معاشرے نے قدم قدم پہ سنگباری کی تھی جلد از جلد اس منزل پہ پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں درد کو "لذتِ سنگ" کے نام سے نہیں بہلایا جاتا۔ جہاں چٹانیں نہیں ہوتیں۔ پتھروں کے سوداگر نہیں ہوتے۔
۱۸ جنوری ۵۵ء کی صبح کو اس کی طبیعت یکایک بگڑ گئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اُسے خون کی قے آئی۔ ایمبولنس کار رستے سے ہی واپس لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے سائے میں جیا اور صلیب کے سائے میں جان دے دی۔

مئی ۵۳ء میں کراچی سے پشاور آتے وقت جب میں اس سے ملنے گیا تو لحظہ بھر کے لئے مجھے بھی نہ پہچان سکا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں اس کی بہن نے کہا "سعادت! سعید آیا ہے"۔ اس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اور آنکھیں جو کہیں خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں یکایک میرے چہرے پر اُتر آئیں ——— "آآآ ——— خواجہ . . . . " میری نظریں گلاس پر گڑ گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "ٹھیک ہے یار سب ٹھیک ہے۔ کچھ اس [illegible]ت کہ!" اس کی میٹھی میٹھی گلابی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں کہ "تو بھی ناصح بن گیا! ۔ اُسی کمبخت سے بھاگ کر تو میں نے یہاں پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے نیک سلوک کی توقع تھی!"

اس کی بڑی بڑی بے چین آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ ایک زمانے میں اسے پنجاب کی دیہاتی بولیاں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا۔ جنھیں وہ اپنے جاننے والوں کے سامنے اکثر دوہرایا کرتا۔ ان کے مقابلے میں باقی سب شاعری فراڈ تھی۔ آنکھوں کی تعریف میں یہ شعر اس نے کس کس کو نہیں سنایا ہو گا ؎

گورا رنگ نشے شربتی اکھیاں   کھنڈ وچ قبد کیلنیاں

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی یہی شربتی کیفیت تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیلیں دکھائی دیتیں جن کی تہ میں جانے کتنی حسرتوں کے سفینے دفن تھے۔ وہ عمر بھر اس محبت اور ہمدردی کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خلوص اور مداحوں کی قدردانی بھی اس کی تلافی نہ کر سکے۔

بھگت سنگھ کے بُت کے سامنے آویزاں تصویر کی آنکھیں پھر پھری چشم تصور میں اُبھر رہی ہیں۔ اُن خشمگیں نگاہوں کے سائے میں پھر بڑی معصومیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوع گفتگو بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کی بجائے ادب و انقلاب زیر بحث ہیں۔ گہرے سانولے رنگ کا ایک بھاری آدمی کارلائیل اور گبن کے انداز تحریر میں گفتگو کر رہا ہے۔ تین نوجوانوں کے تمتماتے ہوئے چہرے اُس کی تاثیر سخن کے شاہد ہیں۔ کمرے کی فضا ایکٹروں کے قصیدوں کی بجائے والٹیر۔ روسو۔ ڈانٹن۔ مارکس۔ لینن۔ ٹراٹسکی۔ سٹالن اور گورکی کے تذکروں سے گونج رہی ہے۔ اس بزرگ کا نام باری علیگ ہے ـــــ اس کے مریدوں کے نام سعادت حسن منٹو، حسن عباسی اور ابوسعید قریشی۔

باری صاحب سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ یہی احساس ہوتا ہے جیسے میں انھیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ بہرحال یہ منٹو سے ملاقات کے بعد کی بات ہے۔ ان سے ہمارا تعارف علم و ادب اور حب الوطنی سے تعارف تھا۔ فلمی رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدتے۔ متحرک تصویروں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچتے۔ دہشت پسندی کی داستانوں میں ہمیں لطف آتا۔ مستبد حکمرانوں کا تختہ اُلٹنے والوں کے آئینوں میں ہمیں اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشم تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں کی باقاعدہ مورچہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں رود بار انگلستان تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ یاجوج ماجوج کی طرح قید کر دیا۔ تاکہ پھر دنیا کو تاخت و تاراج نہ کر سکیں۔ اور عظمت افرنگ کے لازوال آفتاب کو تانبے کے پرانے پیسے کی طرح گردش سے نکال پھینکا۔ انقلابات روس و فرانس کی داستانیں بچوں کی کہانیاں بن گئیں۔ منٹو اُس زمانہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"اب سوچا جائے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے۔ اور امرتسر کی خونین تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ جو اب خلوص دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ تھا لیتے تو ڈرتے رہتے تھے کہ توند نہ نکل آئے۔ حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز نہیں بھاگتے تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اس رئیس عضو نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سرخ لغاتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے۔ اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے تھے ـــــ اشتراکی ادیب باری تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جماتا رہا۔ لیکن وہ ان کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو اس کے ذہنی سر میں پرورش پاتے تھے۔"

(باری صاحب از منٹو۔ مجموعہ گنجے فرشتے)

اگر ہمارا مرشد بزدل نہ ہوتا تو دارالامرکے آتشدان پر رکھے ہوئے بھگت سنگھ کے بت کے سائے میں جا ایسے بچے کھیل رہے تھے جن کے جسمے ڈانٹن، روبسپیئر۔ میزنی۔ لینن اور ٹراٹسکی کی گیلری میں کھڑے ہوتے۔

لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی دبی نہ رہ سکی۔ باپ کی بے رُخی۔ بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں

کی ستم ظریفی سے جو شعلہ بھڑکا تھا، زمانے کے حوادث نے اسے ہوا دی۔ اور وہ معاشرے کے دیمک خوردہ شہتیروں کو چاٹنے لگا۔ اس کے قلم کی روشنائی لاوا بن کر بہہ نکلی۔ جن لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ چیخ اُٹھے۔ انھوں نے قانون کو مدد کے لئے پکارا۔ مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے۔ لیکن لاوا نہ رُکا۔ آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدّت میں اس کی اپنی زندگی کے سوتے بھی سوکھ گئے ——— وہ آتش فشاں پہاڑ اب خاموش پڑا ہے۔ اس کی آگ سے ڈرنے والے اب اس کے دامن میں پھول لگا رہے ہیں۔ لاوے کی مٹی بہت زرخیز ہوتی ہے۔

منٹو پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ آج ہر کوئی اس کا شناسا ہے۔ ہر ایک کو اس کی دو ایک باتیں ضرور یاد ہیں۔ ہر کوئی اس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال لکھ رہا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کو نفسیاتی اور جمالیاتی کسوٹیوں پر پرکھا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پر دو صفحے سیاہ کر دیئے ہیں۔ ایک نے اس کا موازنہ مرپاساں سے کیا ہے۔ ایک اور بزرگ نے لسے سمرسٹ کا رتبہ دیا ہے۔ ان تعزیتی تحریروں میں حفیظ ہوشیارپوری کے ہاں مجھے بہت خلوص نظر آیا ہے۔ لکھتا ہے:-

"منٹو کی زندگی موت اور اس کے فن کے بہترین ترجمان اس کے محبوب شاعر غالب کے یہ اشعار ہیں:-

جز در آئینہ ندیدم اثر سعیِ خیال ہر قدر بہر طلبگاریِ انساں رفتم
سازِ ہنگامہ نہ اندر خورِ طاقت کردم راہِ مستی نہ بہ اندازۂ ساماں رفتم
تا سبک روی ہمی رنجِ گرانی نکشد شب وصل شدم و زود بپایاں رفتم
نگہم نقدِ گنجینہ دنیا می زد مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم

حفیظ نے آگے چل کر لکھا ہے:-

"اس نے اپنی تاریخ وفات کی فرمائش کی تھی۔ آج میں اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں:"

چوں سعادت زجہاں رفت ہمی گفت حفیظ تشنہ از شکدۂ عالم امکاں رفتم
خواند ایں مصرعِ تاریخ زغالب باآہ "مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم"
۶ ۱۳۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ

اپنی نوکِ قلم سے وہ عمر بھر ریاکاری کے پیراہن تار تار کرتا رہا۔ ان میں ایک پیراہن مذہب کا بھی تھا۔ ہمارے ملک میں راسپوٹین کے بھی باپ بستے ہیں۔ جلالت مآب بزرگ، جن کی شرعی داڑھیوں، نورانی چہروں، مقدس دستاروں، بے داغ عباؤں اور دُور رس نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بھی بہروپ بھرنا بھول جائے۔ خوش عقیدہ عوام ان کے دامِ فریب میں اس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ یہ دلوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ راکھ کا سونا بناتے ہیں۔ ان کی خاکِ پا لاعلاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے امپلائمنٹ ایکسچینج بے روزگاروں کو روزی دلواتے ہیں۔ ان کی دکانوں پر حسب کے تعویذ فروخت ہوتے ہیں جن سے سنگدل محبوب رام ہوں۔ ان کے کاٹے علم سے دشمن زیر ہوں۔ اور مقدمے جیتے جائیں۔ یہ بانجھ کو بچے دیں اور کنواریوں کے آسیب اتاریں ——— منٹو کا "صاحبِ کرامات" (مجموعہ: سڑک کے کنارے) بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو ایک سادہ لوح کسان کو، جو جلدبازی میں اپنی بیوی بھاناں کو طلاق دے چکا ہے۔ لیکن اب اسے دوبارہ بسانا چاہتا ہے۔ صاحبِ کرامات اسے جُل دے کر پہلے اس کی کنواری بیٹی جیناں اور پھر اس کی بیوی بھاناں (لڑکی کی ماں) کو نشہ پلا کر

اپنے سالوں کی آگ بجھاتا ہے۔ اس کے کندھے پر زرد رومال ہے (جو حاجی لوگ تحفتہً لاتے ہیں) اس کی لال لال آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہے۔ وہ دراز ریش بزرگ۔ لمبے لمبے پٹے۔ ان کے اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ... ہاتھ میں چاندی کی مٹھ والا عصا ...... مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اسکی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور موجو سے کہا۔ چودھری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اٹھا۔" لیکن اس روز جیناں کا نصیب سو گیا۔ یہی بھاگاں؟ وہ طلعت ہے اور مولوی صاحب فرماتے ہیں: جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے --- اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے۔ پھر جائز ہے --- ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے ... موجو چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہوا (خدا کی طرف سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے) "تو ہم اس کی محبت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لیے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کر دے" ... مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی۔ اور بھاگاں سے کہا "تم آج کی رات میری بیوی ہو" ..... "صبح جاتے وقت مولوی صاحب اپنی داڑھی اور پٹے بستر پر تکیے کے نیچے چھوڑ گئے" ..... منٹو کا یہ خاص ہتھیار ہے، مذہب کی آڑ لیکر ہمارے ہاں کتنے ایسے جرائم کئے جاتے ہیں۔ مہذب اخبار ایسی خبروں کو گول کر جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی آنکھیں تہذیب کی سطح کو نہیں اسکی تہہ کو دیکھتی ہیں۔ وہ چیزوں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیمیاگر دھات کی ماہیت اور اس کے عناصر ترکیبی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ ملمع سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی بھٹی میں کھوٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اسے کٹھالی سے نکال کر دوکاندار کے منہ پر دے مارتا ہے۔ کہ یہ لو بنا سونا۔ اپنی تہذیب۔ منٹو اپنی تحریروں میں اپنے خاص ڈرامائی انداز سے جگہ جگہ معاشرے کی جعلی داڑھیاں نوچتا نظر آتا ہے۔ کہ یہ لو تمہارا میک اپ۔ اس میک اپ کے پردے سے کبھی وہ صاحب کرامات "اپنی تمام تر عریانی سمیت نمودار ہوتے ہیں اور کبھی وہ شیاطین جو حوروں کو ورغلا کر لاتے ہیں۔ اور انہیں چوک میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ واپس جانا چاہتی ہیں لیکن وہاں رضوان کھڑا ہے جنت کے دروازے ان پر بند ہو چکے ہیں۔ چودہ سو سال کی بت شکنی کے بعد بھی لات و منات دنیا میں موجود ہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

منٹو کا فن اسی فلسفۂ حیات کا ترجمان تھا۔ اقبال نے شکایت کی تھی ؎

کارگہِ حیات میں کیا کوئی غزنوی نہیں
کب سے ہیں منتظر کھڑے دیر و حرم کے سومنات

منٹو اسی سوال کا جواب تھا۔ یوم اقبال پر منٹو نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

"اقبال نے خدا سے دعا مانگی تھی کہ مرا نور بصیرت عام کر دے ——— یہ دعا جو ایک دردمند دل سے نکلی تھی ضرور قبول ہوگی۔

..... "منٹو اس وقت بھول گیا تھا کہ یہ دعا قبول ہو چکی تھی۔

لیکن محمود و ایاز کو الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم کے ساتھ آزر کا نام بھی ضرور آئے گا۔ بت شکن منٹو نے اپنے خاک و خون سے اپنے نحیف و ناتواں جسم کی خاکستر کو آنسوؤں میں گوندھ کر بہت سے بت بنائے اور انہیں اولادِ آدم کے سامنے خالی شدہ شبینوں اور طاقچوں میں چن دیا۔

"یہ بُت گوپی ناتھ اور ممی کی مورتیاں ہیں۔ مجھے آدم و حوا کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا گناہ آدم و حوا کا گناہ ہے۔ لیکن ان کی روحیں آلودگی سے پاک ہیں۔ منٹو ہمیں یاد دلاتا ہے۔ کہ ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ منٹو کے مذہب میں انسان اپنے بارِ عصیاں کے باوجود انسان ہے۔

معبودِ ملائک! اِن بتوں کا خالق - ان کے آستانے پر اپنا سر جھکانے کو کفر نہیں گردانتا - غالباً یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اقبال نے —

" آدم خاکی نہاد بندۂ مولیٰ صفات "

کا نام دیا تھا - ان سے مجھے " میلادِ آدم " کی یاد آتی ہے - منٹو نے اپنے کتبہ میں لکھا ہے " یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے . . . . وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا " . . . . . کیا ہم اسے اتنے بھی غلو کی اجازت نہیں دے سکتے ؟ - وہ کشمیری تھا - جرم و عصیاں کے آتشکدوں سے وہ ان قدیم عورتوں کی طرح جو ریل کی پٹڑیوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں - یاس و حرماں کی راکھ میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چن چن کر " اپنی کانگڑی " بھرتا رہا تاکہ رسوم و قیود کے پالے کی ماری ہوئی روحیں اپنا سینہ گرم کر سکیں - سرآج کی سرد مہری - بسم اللہ کی اداس آنکھوں اور نشار دا کے سگرٹ کے ڈبے میں اسی آگ کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں - سڑک کے کنارے کے چولھے جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر دال ہانڈیاں چڑھی ہیں - اسی ان دھیمی آگ سے گرم ہیں - وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ میں بھی کانگڑی چھپائے ہوئے ہے . . . . . وہ خود بھی اسی پالے کا شکار تھا - اس نے پرومتھیس PROMETHEUS کی طرح دیوتاؤں کے آستانے کی آگ چرا لی - اس جرم کی پاداش میں اسے چٹان سے باندھ دیا گیا - اور محاسبہ کے گدھ اس کا جگر نوچنے لگے - آتشِ گل سب سے بڑا گناہ ہے ——— منٹو کا آتشکدہ اسی آگ سے روشن ہے - لیکن اس کے اوپر بھگت سنگھ کا بت کیا کر رہا ہے ؟ ——— تخریب و تخلیق کہ شاید ساتھ ساتھ چلتے ہیں -

منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی - پہلا ترجمہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) ایک پُراسرار طویل افسانہ ' دستِ بریدہ بھوت ' تھا - اپنی قسم کا یہ پہلا اور آخری ترجمہ اور تجربہ تھا - باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے - انھیں افسانوی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا - مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے برے کی پہچان نہ بتا سکتے - ذوقِ سلیم نے مدد کی اور دارالاحمر میں وکٹر ہیوگو - لارڈ لٹن - گورکی - چیخوف - پوشکن - سلوگب - گوگول - دوستووسکی - اندریف - آوسکر وائیلڈ - اور موپاساں کی کتابیں نظر آنے لگیں - وکٹر ہیوگو، باری صاحب کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ تھا - ہم نے اس کی تصانیف دُور دُور سے منگوائیں اور انھیں درسی کتابوں کی طرح پڑھا - باری صاحب چاہتے تھے کہ اس کی LES MISRABLE کا ترجمہ کیا جائے لیکن اس کی ضخامت دیکھ کر ہمت نہ ہوئی - منٹو نے البتہ سرگذشتِ اسیر کے عنوان سے LAST DAYS OF A CONDEMNED کا ترجمہ کر دیا - یہ کتاب سزائے موت کے خلاف پُرجوش احتجاج ہے - مصنف صاحب کا چھوٹا بیٹا ہر نا انصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے - آسکر وائیلڈ کی " ویرا " کا ترجمہ بھی اسی دور کی یادگار ہے - منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی اشاعت کا مفصل ذکر کیا ہے ——" یہ ڈرامہ روس کے دہشت پسندوں اور تراجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا - جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے - امرتسر میں ان دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو توپ دم کر دیا جاتا " چنانچہ جب اس کے اشتہار شہر کی دیواروں پر نظر آئے اور لوگوں کو " مستبد حکمرانوں کے عبرت ناک انجام - روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام کی خبر دی گئی " اور " زاریت کے تابوت میں آخری کیل " گاڑا گیا تو کوچہ وکیلاں میں بھگت سنگھ اور دت کے ان جیالوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی - جو امرتسر کے گلی کوچوں میں ماسکو کا ناٹک کھیلنا چاہتے تھے - اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہیت کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے تھے - لیکن خواجہ عبد المجید صاحب ریٹائرڈ ڈی - ایس - پی - نے پولیس کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ تو اپنے بچے ہیں میاں جاؤ اپنا کام کرو - اور بلا ٹل گئی - میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر پولیس نے بچوں کے اس کھیل کا اپنی روایتی تندہی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں - اس کا افسانہ " تماشا " (مجموعہ: منٹو کے افسانے) انہی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے -

اس میں ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگامے کو ایک بچے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے اس کا ہیرو خود منٹو ہے۔ اس وقت وہ کوئی سات برس کا تھا۔ قارئین کی بے اعتنائی نے اس بچے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔ عزیزوں کی بے اعتنائی کیا کم تھی کہ وہ ادھر کا رُخ کرتا۔ اس کے علاوہ اُسے پیٹے ہوئے راستوں سے نفرت تھی۔ لیڈروں کی خود غرضی سے یہ نفرت اور بڑھ گئی۔ وہ خلوص کا بھوکا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں خلوص کہاں تھا۔ وہ چیخ اٹھا: "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ"

"ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں ...... ان کے ہر سانس میں آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفن محسوس کرتے ہیں لمبے لمبے جلوس نکال کر منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر۔ چوراہوں پر طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر یہ نام نہاد رہنما اپنے لیے راستہ بناتے ہیں۔ جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے ....
یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں۔ مگر کیا انھوں نے آج تک بے کاری کا حل پیش کیا ہے .....
یہ لوگ جن کی روح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں۔ ملک و ملت کی رہبری کیسے کر سکتے ہیں ..... ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاق رکھتا ہو۔ جس کے سینہ میں اتاترک کا سپاہیانہ جذبہ ہو۔ ...."

(منٹو کے مضامین مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے۔ آزادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منٹو کی زندگی میں بمبئی کے پہلے دَور کی پیداوار ہے دارالاحمر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈروں کی دُنیا کے بارے میں اس کا کیا ردِعمل تھا اسی مجموعہ میں آگے چل کر اس نے اپنا خیال اور واضح کر دیا ہے۔

"سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی دونوں پیشے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے۔ گاندھی جی سینما نہیں دیکھتے میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔"

(بابیں۔ منٹو کے مضامین)

بادی النظر میں یہ چند سطور "شوخیٔ تحریر" ہیں اور بس۔ درحقیقت گاندھی جی اور فلموں کا بُعد لیڈروں میں ذہنی توازن اور SENSE OF HUMOUR کے فقدان کے 'نشان' ہیں۔ گاندھی جی اور فلم محض علامتیں۔ سعادت نے اپنے خاص منٹوی انداز میں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو بے نقاب کرنے کا کام لیا ہے۔ تضاد کو اُبھارنا طنز کی خاص ٹیکنیک ہے منٹو اس کا ماہر تھا۔

"وہی بمبئی تھا۔ جہاں کانگرس نے امتناعِ شراب کا قانون پاس کر کے ان ہزارہا مزدوروں کو بیکار کر دیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے وہی عروس البلاد تھی۔ جس کے گھونگھٹ کا ایک حصہ حریر کا ہے اور دوسرا کھردرے ٹاٹ کا ——— وہی بمبئی جہاں اونچی اونچی خوبصورت عمارتوں کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزارہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔

———

"مسلم لیگ مسجد ہے۔ کانگرس مندر ہے۔ کانگرس سوراج چاہتی ہے۔ مسلم لیگ بھی۔ لیکن
دونوں مل جل کر کام نہیں کر سکتے ۔ ان کے خون کا ملاپ موریوں اور بدروؤں میں ہوگا۔"
(باتیں)

ایسے میں سیاسیات سے اس کی برگشتگی قدرتی بات تھی ——— لیکن جب امرتسر سے بمبئی پہنچ گیا ——— جلیانوالہ باغ کے شہر میں ماسکو کا منصوبہ اپنے اشتہار کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کی سبز سبزی اپنے پٹلنے ڈائریکٹر کے گھر میں منتقل ہو گئے اور بعد میں کباڑیے کے بھاؤ لاہور کے ایک کتب فروش نے خرید لئے۔ دنگلوں، مویشیوں کے میلوں، منشیات کے ٹھیکوں، عصمت فروشی اور اس طرح کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک تماشہ تھا۔ اور یہ کتاب (ویرا) تو سٹیج کا ناٹک تھا۔ جس کے لئے لائسنس ضروری تھا۔ لیکن لائسنس نہ ملا۔ اور "پروڈیوسر" بھاگ گیا۔ باری صاحب غائب تھے! انہیں اس ناٹک کا انجام بھی یاد نہیں رہا تھا وہ بھول گئے تھے کہ PICTURE OF DORIAN GRAY کا مصنف دہشت پسندی سے اتنا ہی دور تھا۔ جتنے گاندھی جی سینما سے۔ ناٹک کے اختتام پر ویرا آسکر وائلڈ کی ہیروئن وہی خنجر جسے وہ زار روس کے سینے میں گھونپنے کے لئے لائی تھی۔ اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے ——— اسے زار روس سے عشق تھا۔ محبت فتح یاب ہوئی۔ فرض منہ دیکھتا رہ گیا۔

لیکن تماشہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ "بچوں کا کھیل" ابھی جاری ہے ——— پندرہ دن غائب رہنے کے بعد "ویرا کے" "پروڈیوسر" باری صاحب پھر آ موجود ہوئے۔ اب کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر پبلشر کے "میک اپ" میں۔ اخبار کا نام خلق تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ فوراً کام شروع کیا جائے تاکہ اخبار کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا افسانہ "تماشا" "خلق" کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا۔ "مزدور" جس میں جذباتیت کی خام کاری بدرجہ اتم موجود تھی۔ اور سرمایہ دار کو خوب لوٹے لوٹے "مفترس و معرب الفاظ" میں کوسا گیا تھا۔ یہ مضمون "آدم" کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ منٹو نے بھی مارے ڈر کے اپنے افسانے کے مصنف کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے ہیگل اور مارکس کے بارے میں اپنے حامی جلیبیانہ انداز میں کچھ لکھا۔ جسے شاید میں آج بھی نہ سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پیر و مرشد تھے۔ جن کے روحانی فیض نے ہمیں اپنے تمام ہم عمروں سے ممتاز و ممیز کر دیا تھا۔ اور تو اور کالج میں ہمارے پہ دنیا بسر بھی (جن میں فیض احمد فیض۔ اور صاحبزادہ محمود الظفر جیسے لوگ بھی شامل تھے) ہمیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیتے میں ہمارے استاد باری صاحب کچھ کوئی بے معنی اور بے مصرف بات کیونکر کہہ سکتا تھا۔ اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ ہو۔ اتنا ضرور ہوا کہ مارکس کے نام سے پولیس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن "خلق" کا اپنے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اور باری صاحب کا اخباری دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب ابھی جکنا چور ہو گیا۔

باری صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے اور پھر چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے۔ وہ عجیب غریب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ جذبہ انقلاب کو جلا دینے کے لئے قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سعادت کہا کرتا تھا "باری صاحب آپ بکواس کرتے ہیں۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے" لیکن باری صاحب کا خواب شیط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "تم دیکھ لینا۔ وہ دن دور نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کرو گے" ——— "جیل میں" وہ اپنی ڈائری لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلکے گلابی ——— (مجھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں) رنگ کا نہایت ہی عمدہ کاغذ لے کر شہر کے بہترین جلد ساز سے کالے ملی چمڑے کی ایک ڈائری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے ورق پر آہنی سلاخوں والے دروازے کی ایک کٹنگ نہایت نفاست سے چپکائی گئی۔ اس تصویر کے اوپر کاتب سے "دریچۂ زنداں" کا عنوان نہایت ہی عمدہ خط میں لکھوایا گیا ———

اشتراکی ادیب باری کی بہت بڑا رومان پسند تھا!

اس کے چیلے اپنے گورو کی طرح مارکس اور اینگلز کا چلا نہ کھینچ سکے۔ مادہ پرستی کا یہ وظیفہ ان کی سبک اور نازک روحوں کے لئے بہت ثقیل تھا۔ ان کی انفرادیت اجتماعیت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی ——— منٹو کی "انا" ہجوم کو خدا نہیں مان سکتی تھی۔ مگر "انا الحق" کی منزل ابھی دور تھی ۔

منٹو ماموں کی موت

حامد جلال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اٹھ کر گھر چلے آئیں تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے تجربے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف اتنا کہوں گا: ”منٹو ماموں۔ آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت تھی۔“

بہاولپور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈرنگ سٹینڈ میں بیٹھا طالع یار خاں کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے نڈھال ہو گیا یا یہ کہ مجھ میں شدید افسردگی پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پر انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا ”کہاں انتقال ہوا؟“ جواب ملا ”گھر پر“ اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور نامناسب صورت میں فوت نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تانگے پر یا کسی ریستوران میں یا کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آ گئی ہو۔

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو میچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا ”امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔“

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لئے امپائر سے کئی بار اپیلیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار یہ اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ اب ان کی بے صبر اور ڈانواڈول اننگس ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی حنیف محمد کی طرح ہوشیار اور محتاط کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے جسے وہ لاہور کے تیسرے ٹسٹ میچ میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ اس کا غم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ درحقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔

اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک ریسٹوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا "حامد جلال کو واپس آجانے دو۔ میں اسی کے ساتھ ٹسٹ میچ میں حنیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا۔"

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مددگار عورت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ لاش گجرات میں سڑک کے کنارے پائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی ننھی سی بچی کو بس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کڑکڑاتی سردی میں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹے نے منجمد کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو ماموں بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گجرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی پیک ہے۔ انھوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسبِ معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے نے منٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو ماموں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا جگر پھٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورتِ حال کا تن تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا۔ اور انھیں موت کے منہ سے نکالنے کی جد و جہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علالتوں کے بعد وہ شفایاب ہو چکے تھے اس لئے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ دینے کے لئے امپائر کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہونی شروع ہو گئی تھی جب منٹو ماموں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔

منٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے میں بھی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلافِ معمول نہیں سنبھلی۔ ان کی نبض برابر ڈوبتی گئی اور درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی قے بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ماموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ماموں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سنتے ہی وہ بول اٹھے "اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لئے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر منٹو ماموں فوراً مشتعل ہو گئے۔ اور انھوں نے غضبناک آواز میں کہا "خبردار جو کوئی رویا!" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا، وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اسے مرتا ہوا دیکھیں۔ منٹو ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے ـــــ جو اُن کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔

ایمبولنس آنے سے پہلے صرف ایک یا دو بار اُنھوں نے اپنے منہ سے رضائی ہٹائی۔ انھوں نے کہا "مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور رضائیاں ڈال دو"۔ کچھ دیر توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی اُنھوں نے آہستہ سے کہا: "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وِہسکی منگا دو......"

شراب کے لئے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لئے ایک پوا منگا لیا گیا۔ انھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے "میرے لئے دو پیگ بنا دو" اور یہ کہتے ہوئے درد اور شدید تشنّج دورے کے باعث وہ کانپ سے اُٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لئے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آپہنچا ہے۔ لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لئے بھی انھوں نے اپنے اوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہِ واپسیں یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لئے زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے ـــ وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ محبّت کرتے رہتے ہیں۔

بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پا سکتا اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لئے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کوئی انھیں مرتا نہ دیکھ سکے۔ جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں۔ اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزا و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مرنے سے پہلے وہ منفعل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن منٹو ماموں ریاکار نہیں تھے۔ اُنھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر۔ لیکن اس کا فائدہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

میں اس وقت موجود ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے۔ اور یہ کچھ مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ انھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ بھولنا۔ میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا

آخری جام انھیں پینے کو دے دیا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لئے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کہانی صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اُتار دیا، تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔

ایمبولنس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اُتر سکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایمبولنس میں لٹا دیا گیا۔

ایمبولنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لئے اندر گئے تو منٹو ماموں مر چکے تھے۔ دوبارہ ہوش میں آئے بغیر راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

معذرت

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پریس مین کی نا اہلی سے اس نمبر کی طباعت بے حد خراب ہوئی ہے۔ چونکہ ہم اس سلسلے میں بالکل ہی بے بس و مجبور تھے۔ اس لئے کچھ بھی نہ کر سکے —— یہ صدمہ نقوش کی نفاست پسندی کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس حادثہ پر ادارۂ نقوش اہلِ قلم اور قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

مدیر

منٹو کی موت

غلام عبّاس

منٹو کی موت پر مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ کچھ دنوں پہلے ہی سے میں نے یہ بُری خبر سننے کے لیے جی کڑا کر رکھا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اُس کی کیفیت سچ مچ سرکس کے اُس تماشہ گر کی سی ہو گئی تھی۔ جو عمر بھر بہت بلندی پر تار پر چلنے کا خوف ناک کھیل دکھاتے دکھاتے تھک چکا ہو۔ اور ہر لحظہ اُس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ منٹو مُصر تھا کہ وہ کبھی نہیں گرے گا، مگر اُس کے پاؤں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ قضا سے کھیل رہا ہے۔ اور یہ کھیل عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔

منٹو زبان سے خواہ کچھ بھی کہتا ہو مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اِس کھیل سے اُکتا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے مخلصی پا جائے۔ فحش نگاری کے سلسلے میں کراچی میں اُس پر جو آخری مقدمہ چلا۔ اُس کی کارروائی چند ہی لمحوں میں ختم ہو گئی۔ منٹو نے نہ اپنی مدافعت میں کوئی دھواں دھار تقریر کی۔ اور نہ قانونی مشیروں سے ہنگامہ ہی برپا کرایا۔ یہاں تک کہ احتجاج میں ایک لفظ بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ چپکے سے جرمانہ ادا کیا۔ اور گھر کی راہ لی۔

وہ مقدمہ بازی ہی سے نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی اُکتا گیا تھا۔ وہ گھریلو بندھنوں، سماج کے رکھ رکھاؤ اور عام دُنیوی علائق سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ گراوٹ کا یہ وہ درجہ ہے۔ کہ کم زور انسان خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ مگر منٹو کا رہا سہا دم خم آڑے آ گیا۔ اُس نے خودکشی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اُس نے اپنے کو ایک ایسے راستے پر ڈال لیا جو انجام کار خودکشی ہی کا مترادف بنا۔

ادب کے متعلق یہ حکم لگانا کہ کونسی چیز زندہ رہے گی۔ اور کونسی مٹ جائے گی بہت مشکل ہے۔ مگر منٹو کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ وہ ایک باغی کی حیثیت سے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور اُس کے کردار کے بغیر اِس دور کی داستانِ ادب مکمل نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے۔ کہ اُس کے ہم عصروں کو باوجود

بسیار نویسی اور شہرت کے حاصل نہیں ہو سکا۔

منٹو نے آزادیٔ تحریر کے لئے جو بغاوت کی وہ سب ادیبوں کے لئے، خواہ وہ کسی گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ایک تو ادب پر احتساب کی گرفت اتنی کڑی نہیں رہی، جتنی کہ پہلے تھی، دوسرے لکھنے والے چاہے کمتر درجے کا ادب ہی کیوں نہ پیش کر رہے ہوں، مگر جہاں تک فن کے ساتھ خلوص اور صداقت برتنے کا تعلق ہے، وہ پہلے سے کہیں نڈر اور بے باک نظر آتے ہیں۔

منٹو کی ایک اور خصوصیت جو اُسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ تھی کہ اُس نے عمر بھر کبھی سیکنڈ فِڈل (SECOND FIDDLE) بجانے یعنی کسی کے ماتحت محض سنگت کا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے خود کو کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک نہ ہونے دیا۔ وہ اپنا راگ، بلند یا پست جیسا بھی وہ تھا، اکیلا ہی الاپتا رہا۔ اُس کو نہ کسی کی اعانت کی ضرورت تھی نہ پروا۔ یہی وہ بے نیازی تھی جس نے زندگی میں اور ادب میں اُس کے بہت سے مخالف پیدا کر دیئے تھے۔ مگر اُن کی مخالفت اُس قبولِ عام کے سامنے ہیچ ثابت ہوئی، جو اپنی زندگی ہی میں اُسے حاصل ہو گیا تھا، اور جس میں آج اُس کے مرنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

منٹو کا ایک خط

محمد طفیل

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گذر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لئے نیا تھا۔ بہرحال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے۔ جس میں میں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی۔ —— وہاں جب تک رہا سولی پہ لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں۔ نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نگہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ابا فلاں چیز لا دو۔ فلاں چیز لا دو۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا۔ تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی۔ اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لئے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا۔ بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔ میں بھی تمہارے دُکھوں اور غموں کو اس لئے رقم کر آیا ہوں۔ تاکہ آنے والی نسلیں تم سب کو مظلوم کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔

میں یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں۔ کہ یہ زندگی میرے تمام معاصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لئے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔ جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ جانے وہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں۔ جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آ جائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لئے ہیں۔ اس لئے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی۔ تمہیں علم ہے۔ اگر ہم لوگ تمہارے ہاں نہ ہوتے۔ تو سوائے علم، ادب [illegible]

کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے۔ مزے میں ہے۔ اکثر فنکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح بھولے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمہارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں۔ کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے۔ سُنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں۔ تو تمہارے ہاں کے بعض سرپھرے سرِ بازار پٹیں گے۔

بہر حال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا۔ تمہیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اُس پر تبصرہ کر دینا۔

تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی اُمیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی اُمیدوں کے پیٹ میں تو صرف بھن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے۔ تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا۔ اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ تو یقین جاننا میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے۔ کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اِس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا۔ تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو۔ وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جاتا۔ تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ کہ میں ساری عمر نقادوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں۔ جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہی ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ تو تنقید میں علّامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے اِن سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لئے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن اِن حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے مجھے ان بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں۔ اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اُس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے۔ تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے اِن تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالامال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہوگا۔ اور نہ واقعیت کے ساتھ خلوص، جب فنکار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا۔ تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا۔ اس پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ (۱)

یہاں شرابِ طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجئے شرابِ طہور نوش کر لیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی۔ اور اُس جگہ پاشس شراب کے لئے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لئے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر

(۱) نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں۔ مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔ (محمد طفیل)

جاتا تھا۔ احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا۔ کہ میری جیب میں دھیلہ تک نہیں ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا۔ کہ اس کی جیب میں دھیلہ چھوڑ اتنے روپے ہیں۔ کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شراب کو خانہ خراب اس لئے کہا ہے۔ کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں۔ وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لئے کہ تم اس سلسلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُر وقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے۔ کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے۔ تو اس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بھی کہ میرے مقابلہ ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا چھچھورا ہے۔ کہنے لگا۔ تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے افسانوں کے عنوان چنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا۔ اور محسن کشی ایسی کی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی۔ اس میں بجائے میری شکر گذاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ الٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں۔ کہ میں بڑا دھ تھا۔ رنڈی باز تھا۔ جوا کھیلتا تھا۔ اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

تمہیں علم ہے۔ کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہیں تو میں نے دل میں کہا۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان۔ میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں۔ اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری نا بیداری ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے۔ میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ اور میں اس سے کہتا ہوں۔ شعر کہنا کونسا کمال ہے مرزا صاحب۔ میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے —— بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں۔ کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبرِ بد بھی سنی ہے۔ کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں۔ اور تم سب اُلوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں۔ ورنہ پچھتاؤ گے —— حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آ جائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں تو ان سے نمٹ ہی لوں گا۔ زاڈکر ذرا بھی کچھ پاؤ سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے۔ کہ جب سے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لئے کہ جب تک میں وہاں رہا۔ سب نے لُٹی کہ مجھے اپنے ہاں سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آ گیا ہوں۔ تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں۔ جو مجھے اپنے ہاں ناک تک صاف نہیں

کہہ دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک تھا ــــ اِن حالات میں تمہیں اپنے اِس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیئے۔

یہاں میرے کچھ قدردان پیدا ہو گئے ہیں۔ اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا۔ کہ میں یہاں کے جلسے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کر دوں۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لئے ہوا تھا۔ کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ اُس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے۔ وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لئے اس کی اجازت ہونی چاہیئے۔ کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا۔ خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دیتا۔ تو میری زبان گدی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب 'گنجے فرشتے' کافی پسند کی گئی ہے ــــ ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء

منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط

احمد ندیم قاسمی

میرے اور منٹو مرحوم کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا بھی خط لکھا ہے تو میں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی پیار تھا اور اس کے فن سے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں کچھ اس طرح یکجان ہو کر رہ جاتی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ (مجھے بھی نصیر انور نے بتایا ہے کہ جن دنوں میں نے رسالہ "سنگِ میل" میں منٹو کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی تھی تو منٹو نے اس چٹھی کو پڑھے بغیر ایک روز میرے ان خطوط کا بنڈل نکالا جو میں نے گذشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انھیں ایک ایک کر کے نذرِ آتش کر دیا۔)

۱۹۳۷ء میں اختر شیرانی مرحوم کے توسط سے ہمارا تعارف ہوا اور چار برس کی خط و کتابت نے ہمارے درمیان خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو ۱۹۴۲ء تک یہ ڈر لگا رہا کہ اگر کہیں ہم دونوں کی ملاقات ہو گئی تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے۔ شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور اخلاق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگا لیا ہو اور اسے محسوس ہوا ہو کہ ہم ایک ہی راہ پر تو کیا ——— متوازی راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (۱۹۴۰ء میں) منٹو بمبئی سے دہلی آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا بھیجا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آ گئے جن میں اس نے ہماری ملاقات کی خطرناکی کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور تانگے والے کو اپنی "منزل" کا پتہ بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں سمجھا یہ شخص میری بڑی سی "گھیرے دار" شلوار اور میرے اس کوٹ کے تضاد سے محظوظ ہو رہا ہے جسے اگرچہ پتلون پر پہننے کے لئے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلوار پر لٹکا رکھا ہے۔ ان دنوں میری صحت پہلوانوں جیسی تھی اور کوچوان "منحنی" قسم کا آدمی تھا اس لئے میں نے سوچا ممکن ہے اس جسمانی تقابل نے اس کے پھیپھڑوں میں ارتعاش پیدا کیا ہو۔ مگر کوچوان کی مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا جب ہم اپنی "منزل" کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلی بار آیا تھا اس لئے کوچوان کے رحم و کرم پر تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے یہ کوچوان کوئی غنڈا ہے اور میرے اجنبی اجنبی تیوروں کی شہ پا کر اس بازار میں آ نکلا ہے جہاں ہر طرف ہارمونیم بج رہے ہیں۔ بکھرے بالوں اور لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں کی

چھاؤنی چھا رہی ہے۔ خواتین کھڑکیوں اور دریچوں میں یوں بیٹھی ہیں جیسے نمبردار اپنی چوپال پر اور کبڈی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھلے چبوتروں کے نیچے مانوس قہقہے اور پان کی پیکیں اور مرجھائے ہوئے پھول بکھر رہے ہیں اور کوچوان کہہ رہا ہے "یہ کیوں میاں! کیا آپ دلی میں پہلی بار آئے ہیں! یہ چاوڑی ہے۔ آپ نے چاوڑی بازار جانے کو کہا تھا نا۔ کہاں اُتریئے گا؟"

منٹو نے مجھے چاوڑی بازار ہی کا پتہ لکھا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ کیا پنڈت کرپا رام کو رسالہ "موویز" کے دفتر کے لئے ساری دلی میں چاوڑی سے بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکی! لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ "میاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں" تو میں سوائے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا۔ میں نے سوچا کھاری باؤلی میں رسالہ 'ساقی' کا دفتر ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔ مگر اچانک "موویز" کا بورڈ نظر آگیا اور میں تانگے سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا۔ وہ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے اس گاڑی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اُتر کر میں چاوڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ عام جسمانی صحت یونہی سی تھی مگر آنکھوں میں چمک اور رنگت میں سنہرا پن تھا۔ شام کو ہم نئی دلی کے ایک الٹرا ماڈرن سینما ہال کی چوتھی منزل پر بذریعہ لفٹ منتقل کر دیئے گئے۔ یہاں میں نے ایک مرہٹہ ادیب کھانڈیکر کی فلمی کہانی "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گیت لکھنا شروع کئے اور منٹو نے ان مکالموں اور گیتوں کو ٹائپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر ہم یہ "تخلیقی اور ٹکنیکی" کام کرتے اور شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں "پوٹیٹو چپس" کھاتا۔ دو تین دن کے بعد اس نے کہا "معاف کرنا احمد ندیم قاسمی۔ تم میری شراب کے مقابلے میں آلوؤں کی یہ کترنیں کھاتے ہوئے بھلے نہیں لگ رہے۔" اور دوسرے دن اس "تنہائی" کو ختم کرنے کے لئے شاہد لطیف کو جو اُن دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے، دہلی بلا لیا اور ہم سینما ہال کی چوتھی منزل پر دس بارہ روز تک مقیم رہے۔

میں اس دوران میں سوچتا رہا کہ آخر منٹو محض میری خاطر اتنی محنت کیوں کر رہا ہے۔ کہانی کھانڈیکر کی ہے، مکالموں اور گیتوں کا معاوضہ مجھے ملے گا مگر منٹو کیوں دن بھر بیٹھا درجنوں صفحے ٹائپ کر ڈالتا ہے اور اکثر فلمی ٹکنیک کے سلسلے میں میری رہنمائی کرتا ہے اور بعض بعض سین تو اس نے خود ہی لکھ کر ٹائپ کر ڈالے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بحیثیت سب انسپکٹر آبکاری صرف ساڑھے بہتر روپے ماہانہ ملتے ہیں مگر میں بھی تو یہ جانتا ہوں کہ منٹو بمبئی کے ہفت روزہ "مصوّر" کی ادارت کا حق الخدمت صرف پچاس روپے ماہانہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ کون سا جذبہ ہے جس نے منٹو کو بمبئی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اندھا دھند مشقت پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اس بے لوث خلوص کا تھا جو منٹو کی اور میری افتادِ طبع میں واحد قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے سے پیار اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ طبائع کے اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور رہیں اور ان شکایتوں کا علی الاعلان اظہار بھی ہوتا رہا۔ مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملے۔ میل دُھل گیا اور ہم آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کے منٹو اور ندیم بن گئے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے اگلے سال ہوئی۔ وہ بمبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آگیا تھا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور نکلسن روڈ پر مسن بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت، شاید نیوز سیکشن سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر، میراجی، اوپندر ناتھ اشک اور ن۔م۔ راشد بھی موجود تھے۔ اُردو شاعری کے نئے رجحانات کے نمائندہ شعرا کو ریڈیو والوں نے مدعو کیا تھا۔ تاثیر مرحوم اس محفل کے صدر تھے۔ اور شرکائے محفل میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، راشد، میراجی، مجاز، تصدق حسین خالد، سیماب مرحوم، روش صدیقی اور ساغر نظامی کے ناموں کے علاوہ اپنا نام یاد رہ گیا ہے۔ منٹو کا فن ان دنوں انتہائی عروج پر تھا۔ صحت بھی بُری نہیں تھی۔ طبیعت میں شوخی اور بے باکی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دنوں

اس کی شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے۔ ایک دن اچانک بولا "آؤ یار۔ ذرا حفیظ صاحب کو چھیڑیں" پھر وہ بھری محفل میں حفیظ صاحب کے پاس گیا اور نہایت ادب سے بولا "شاہنامۂ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گہرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفے کا کوئی نکتہ نظم فرمایا ہے۔ میں نے ہزار سر مارا۔ پڑھے لکھے دوستوں سے بھی مشورہ لیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آپ کا وہ شعر یہ ہے ؎

یہ لڑکا جو کہ بیٹھا ہے وہ لڑکی جو کہ بیٹھی ہے
یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے"

ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی اور حفیظ صاحب بھی مسکرا کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منٹو نے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کا پروگرام بنایا۔ مولانا شاید میراجی کے کمرے میں رہتے تھے۔ کرشن، اشک اور میں منٹو کے ہمراہ ان کے پاس پہنچے اور منٹو نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برسنا شروع کر دیا۔ "بانگِ درا کے پہلے حصے سے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ فلسفے کے نظریات کو بغیر کسی مقصد کے نظم کرتے جاؤ اور ہر نظریے کے کوٹ کے کالر میں خودی کا پھول سجاتے پھرو۔" پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی حمایت میں چند نہایت ٹھوس باتیں کیں مگر انھیں منٹو کے تیوروں سے اس کی نیت کا جلد ہی پتہ چل گیا اور انھوں نے ایسی ایسی شگفتہ چٹکیاں لینا شروع کیں کہ منٹو کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے سچ مچ بھاگ آئے۔

میں چند روز منٹو ہی کے ہاں رکا۔ منٹو کے گھر میں مجھے سلیقہ صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی محض ذوقِ لطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منٹو کے لکھنے پڑھنے والے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا رہتا۔ فٹ ڈیڑھ فٹ اونچے ڈیسک میں منٹو کے مسودے بند ہوتے۔ اتنی ہی بلند تپائی پر منٹو کا ٹائپ رائٹر رکھا رہتا۔ کتابیں نہایت سلیقے سے ایک لمبے شیلف میں سجی رہتیں اور خود اچھا منٹو سفید براق لباس پہنے وہاں بیٹھا لکھتا اور ٹائپ کرتا نظر آتا۔ وہ اپنی شراب کی بوتل کو بھی اسی ڈیسک کے نیچے "چھپاتا" تھا۔ اس لئے کہ ان دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں مقیم تھیں اور منٹو کہتا تھا کہ "میں اپنی بہن سے ڈرتا ہوں اور پھر آجکل کے بچے اتنے تیز ہیں کہ انہیں ہزار سمجھایا جائے کہ اس بوتل میں تیل بھرا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے گھورتے رہیں گے۔ سو ان سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ رہی صفیہ تو جب اس نے دیکھا ہے کہ میں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ اور اس پیمانے سے میری سیری نہیں ہوتی۔ سو یہ فراڈ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

منٹو کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے ۱۹۴۸ء کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے۔ منٹو میرے پاس آیا۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا "معلوم ہوتا ہے اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی ہے۔" میں نے اسے بتایا کہ سفیدی کو بس ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا۔ وہ بولا "تم شاعر ہو کر ایسی بھونڈی سفیدی کو برداشت کئے بیٹھے ہو!" میں نے اسے اطلاع دی کہ سفیدی خود میں نے کی ہے اس لئے عدمِ برداشت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بولا "سفیدی اسے کہتے ہیں!"

تیسری مرتبہ خود منٹو نے مجھے دہلی بلا بھیجا۔ منٹو اور کرشن چندر نے بنجارا کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور مجھے اس کے گیت لکھنا تھے۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منٹو کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں منٹو نے مجھ سے ریڈیو کے لئے ایک طویل اوپرا، اور چند منظوم ڈرامے بھی لکھوائے اجرت کے معاملے میں ریڈیو کے حکام سے خوب خوب لڑائیاں کیں۔ پھر جب مجھے خاصی معقول رقم دلا چکا تو مجھے چاندنی چوک میں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک امرتسری دکاندار سے میرے لئے نیلونوں اور کوٹوں کے کپڑے خریدے۔ دو تین دنوں میں میرا یہ لباس تیار ہو گیا اور یوں میں نے

زندگی میں پہلی بار پتلون پہنی اور ٹائی لگائی۔

چوتھی ملاقات "بُو" پر مقدمے کے سلسلے میں ہوئی۔ جب منٹو بمبئی میں تھا اور میں ادبِ لطیف لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ پانچویں ملاقات انارکلی بازار میں محض اتفاق سے ہوئی جب میں "سویرا" کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور منٹو مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا۔ چند روز کے بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں پندرہ بیس روز مقیم رہا۔ ہمارے نظریاتی اختلاف کی ابتدا وہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ریڈیو اسٹیشن میں گزارتے شام کو منٹو کسی نہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا۔ اور پھر شراب کے دور چلتے۔ ادب میں حقیقت اور جنس پر بحثیں ہوتیں۔ منٹو کو ان تمام مقدمات پر عبور حاصل تھا جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں مختلف ادیبوں پر عریانی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی مثالیں دیتا اور اس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہو جاتی کہ اس پر ایک شعلہ نوا مقرر کا دھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا "ٹالسٹائی نے موپساں کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موپساں کو اپنی ننگی ہیروئن کو نہاتے ہوئے دکھانا تھا تو کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ نہا رہی تھی۔ یا چلئے یہ بھی کہہ دیجئے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے لپٹے رہ گئے۔ لیکن موپساں کو یہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہیروئن کے جسم کی رنگت کی طرح ہلکا سنہری یا ہلکا گلابی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذتیت کی ابتدا ہوتی ہے"۔ اور یہ سن کر منٹو بھڑک اٹھا۔ بولا "تم کیا جانو عورت کے جسم کے راز۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چکھی۔ تم تو اس روز جاؤ رڈی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوا گھس آئے۔ تم کیا جانو موپساں نے قطروں کی رنگت کا اظہار کیوں ضروری سمجھا۔ اگر وہ رنگت کا ذکر نہ کرتا تو یہ عورت کیسی پھیکی پھیکی اور سپاٹ لگتی۔ ان گلابی قطروں ہی نے تو اسے زندگی کی شگفتگی دی ہے۔ تم کسانوں کی کہانیاں لکھ لیتے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو۔ عورت پہ لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے۔ اور کبھی تم تخلیق کے لمحوں میں عورت بنے ہو؟ تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی اجنبی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے؟ کوئی جھرجھری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب کبھی اس اجنبی لمس کے مضراب سے بھی جھنجھنائے ہیں؟ سو میری جان۔ ٹالسٹائی کبھی کبھی اسی طرح گاندھی پنے پر اُتر آتا تھا مگر کیا تمہارے خیال میں اس نے اپنی اینا کرینینا کے ننگے پاؤں پر لکھتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہو گی جو موپساں نے اپنی ہیروئن کے جسم پر پانی کے گلابی قطرے دیکھتے ہی محسوس کی؟ سو احمد ندیم قاسمی۔ بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیرِ خارجہ اور ہم ادب کے وزیرِ داخلہ ہیں۔ ہماری اپنی اپنی راہیں اور اپنی اپنی منزلیں ہیں نہ ندیم منٹو بن سکتا ہے نہ منٹو ندیم۔ ٹالسٹائی ٹالسٹائی ہے اور موپساں موپساں ہے۔ اور میرے خیال میں میں نے ایک پیگ زیادہ چڑھا لیا ہے، چلو اب سو جائیں"۔

ان دنوں میں نے تہیہ کر لیا کہ منٹو سے اس کے بعض افسانوں کے عریاں ٹکڑوں کی عریانی کی حقیقت تسلیم کرا لوں۔ میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور آخر ایک روز منٹو ایسی تلخ کلامی پر اُتر آیا جس کا میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنگ آ کر بولا "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا"۔

دوسرے ہی دن اسے اپنے اس خوبصورت فقرے کی تلخی کا احساس ہو گیا کیونکہ اس کی باتوں اور تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منا رہا ہے۔ پھر یہاں لاہور میں، جب ہمارے درمیان مہینوں تک کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک دن میرے ہاں آیا۔ مجھے اپنے گھر لے گیا اور اندھا دھند پی کر سنہ ۱۹۳۴ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۴ء تک کی تمام باتوں کو اتنی تفصیل سے دہراتا رہا کہ میں اس کی بے پناہ یادداشت پر حیران رہ گیا۔ پھر وہ بولا "یہ باتیں نوٹ کر لو میری جان۔ شاید چند دنوں بعد تمہیں یہ باتیں مرحوم منٹو کی یاد میں لکھنا پڑیں"۔ یہ سن کر میں خلافِ معمول آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے یہ سوچے بغیر کہ منٹو نشے میں ہے کہنا شروع کیا "اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر آپ کو شراب چھوڑنی پڑے گی۔

آپ تو پاگلوں کی طرح چیختے ہیں۔ کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس گھر میں آپ رہ رہے ہیں اس میں نکہت بیٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی بچی ہے جس کی ایک نہایت پیاری تصویر آپ نے بمبئی سے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو ادب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ نکہت کے اس داخلی ردِ عمل کو ابھی سے محسوس نہیں کر سکتے جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دیکھ کر اس کے ذہن پر وارد ہوگا؟ اور اگر آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو آپ اپنے آپ کو ادب کا وزیر بے قلمدان کہا کیجئے کیونکہ جو ادیب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے ——" اور منٹو نے کہا: "اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔" اور اس کے بعد اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی ذات کے معمولات میں دخل دینے کا مجھے کوئی دُور دراز کا بھی حق حاصل نہیں۔ میں خفا ہوئے بغیر چلا آیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آ کر ان باتوں پر پچھتائے گا۔ مگر وہ نہیں پچھتایا بلکہ چند روز بعد سرِ راہے ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرفِ آخر تھا اور وہ نشے کی نہیں، ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس دوران میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ نہ منٹو کو اپنی انتہا پسندیوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے دیکھوں اور کچھ نہ بولوں۔ میں نے بول کر دیکھ لیا تھا۔ مگر اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بزدلی دکھائی تھی۔ میں اس کا پہرہ دار بن کر کیوں نہ بیٹھ گیا۔ میں اس کی جھڑکیاں اور گالیاں تک سہتا مگر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اسی مہم میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے چند نیک نفس دوست میرا ساتھ دیتے۔ اور ہم سب مل کر قوم کی اس متاع کو اتنی جلد نابود ہونے سے بچا لیتے۔ اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی تو لکھا تھا کہ "مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔" سو اب دو ماتم میرے سپرد ہوئے ہیں۔ ایک منٹو کا اور دوسرا اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے ڈھونگ کا۔

آج میں منٹو کے چند خطوط ایک عظیم فن کار کی ایک نہایت پیاری یادگار کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ منٹو کے کوئی ایک سو خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے منٹو کی نہایت سچی جھلکیاں جمع ہیں۔ میں انہیں کتابی صورت میں بھی چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہوں (اور ان کے حقوق منٹو ہی کے نام محفوظ ہوں گے) مگر یہ سب خود فریبیاں اور جی بہلاوے ہیں۔ کیونکہ یہ بات کسی وقت بھی میرے ضمیر سے نہیں نکل سکتی کہ میں نے اور میرے جیسے کتنے کم ہمت اور شکست خوردہ "خیر خواہوں" نے منٹو کو زندگی کے ویرانے میں یوں اکیلا چھوڑ دیا تھا کہ۔ ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(۲)

معرفت ہفت روزہ 'سماج'
۳ پیر خان اسٹریٹ، بمبئی ۸
۱۰ مئی ۳۸ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ اس سے قبل میں آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کر چکا ہوں۔ امید ہے وصول فرما لیا ہو گا۔
ناسک سے واپسی پر میں مصور سے علیحدہ ہو گیا تھا اور یہ بات کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کے متعلق میں کچھ کہوں یا سنوں۔ مالکِ مصور سے میرے تعلقات دوستانہ ہیں۔ علیحدہ ہونے پر بھی میں اُن کے قریب ہوں ـــــ یہ میری عقیدت ہے۔
آپ کی اسٹوری میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ "فلمی" نہیں۔ وہ فلمی کس طرح نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے کئی صفحات درکار ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ صفحات لکھ کر بھی میں آپ کو اپنا مدعا بطریقِ احسن نہ سمجھا سکوں گا۔ شاید میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ فلمی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لئے اسٹوڈیو بہترین اُستاد ہے۔ آپ پردے پر فلموں کو بغور دیکھ کر بھی کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں مگر پھر بھی سیلیولائیڈ میں چند ضروری نقطوں پر روشنی ڈالنے والا موجود ہونا چاہیئے۔
آپ اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آپ کے "بے گناہ" سے ہو گیا تھا۔ مجھے بہت کم افسانے یاد رہتے ہیں مگر آپ کا "بے گناہ" مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ چند معمولی خامیوں کے باوصف آپ کا بہترین افسانہ تھا۔
گو میں خود حوصلہ ہارتا رہتا ہوں مگر میری استدعا ہے کہ آپ ہرگز حوصلہ نہ ہاریں۔
مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں، اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ انہی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی صدمے اُٹھانے پڑے ہیں۔ میں اسی تلخ حقیقت کے پیشِ نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی رائے مرتب نہ کریں۔
میں بمبئی میں پچاس روپیہ ماہوار کما رہا ہوں اور بے حد فضول خرچ ہوں۔ اگر آپ یہاں چلے آئیں تو میرا خیال ہے کہ ہم دونوں گزر کر سکیں گے، میں اپنی فضول خرچیاں بند کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا کامل احساس ہے، اس لئے کہ میں ان مجبوریوں سے خود گزر چکا ہوں۔ میں آپ کو کرایہ روانہ کر دیتا اور روانہ کر سکتا تھا، اس لئے کہ ابھی آٹھ روز ہوئے میرے پاس پانچ سو روپے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ صرف بیس روپے باقی ہیں۔ مجھے کتابیں خریدنے اور یونہی روپیہ فضول برباد کرنے کا خبط ہے اور میں اس سے لطف اُٹھاتا ہوں۔ خیر! زندگی ہے تو روپیہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا سکتے ہیں مگر یہ بات یاد رکھیئے کہ آپ کو میری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں رہنا ہو گا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا

کرسکتے ہیں جس میں ہم دونوں رہ سکتے ہیں۔ کھانے کو ملے نہ ملے مگر آپ کو کتابیں پڑھنے کے لئے مل جایا کریں گی اور اگر آپ کوشش کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ ابھی کتابوں کے ساتھ اچھے اچھے کھانے بھی مل جائیں۔ اگر میرا یا آپ کا لکھا ہوا افسانہ کوئی فلم کمپنی خریدلے تو دو تین مہینے عیش میں گزر سکتے ہیں۔ کہئے کیا ارادہ ہے؟

"سماج" نمبر کا پرچہ نہیں۔ یہ پرچہ دراصل میرے ایک عزیز دوست یہاں سے نکال رہے ہیں۔ پہلی جلد شائع ہوگئی ہے، آپ کے پاس پہنچ جائیگی۔

آپ کی نظم میرے "ہمایوں" میں پڑھی ہے۔ افسوس ہے کہ نہ مجھے شعر پڑھنا آتے ہیں اور نہ میں ان APPRECIATE کر سکتا ہوں۔ چونکہ آپ نے لکھی ہے اس لئے یقیناً اچھی ہوگی۔ تشغل کے متعلق رائے عالیہ کا شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے

خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈلفی چیمبرز

کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸

نومبر ۳۸ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا لفافہ ملا۔ گیتوں اور تصویر کا شکریہ۔ آپ کو ناحق اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔

"مردم پتی کے آنسو" آپ نے پسند کیا۔۔۔ شکریہ۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اسے پسند کریں گے۔ میں نے اس کو لکھتے وقت انتہائی کوشش کی تھی کہ کوئی [redacted] غیر ضروری نہ ہو اور جیسا کہ آپ نے اپنی رائے میں لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔

ہمارے "ادبی رسائل" صحیح ادب کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔

پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کے آغوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ ایسے دیکھ رہا ہو گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا۔

زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہئیے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسے ہوگی اور یا جیسے ہونی چاہیئے۔

"دیوالی نمبر" میں کیا آپ نے "دیوالی کے دیئے" پڑھا۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ کے گیت خوب ہیں خاص کر جوگی سوگی والا۔ اس میں ایک مصرع ہے ~ تو کیا جانے کس کی خاطر ۔۔۔ اگر "کس کی خاطر" کے بجائے "کس کے کارن" ہو جائے تو میرا خیال ہے کہ آپ کے گیت میں "خاطر" کا تیز تر نکل جائے گا۔

مجھے آپ کے افسانے کا انتظار رہے گا۔

میری صحت اب قدرے اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

میں نے فلم کے لئے ایک افسانہ "کیچڑ" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ آدھا افسانہ لکھ کر رک گیا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے مطالعہ کے لئے بھیجدوں، شاید آپ کوئی رائے دے سکیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈیلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸
۳۰ جنوری ۴۲ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام۔ جس روز آپ کا خط ملا، میرا مُوڈ بہت اچھا تھا۔ آپ کے تعریفی الفاظ سے مجھے فداوہ ہوگیا —— میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو واللہ میں مخمور سا ہوگیا —— مگر کسی سے کہیئے گا نہیں کہ مجھ میں یہ کمزوری ہے۔

کل رات سے میرا مُوڈ ٹھیک نہیں۔ طبیعت پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب تکان سی طاری ہے۔ میں اس اضمحلال کا سبب جانتا ہوں مگر اس سبب کے پیچھے اتنی چیزیں کارفرما ہیں کہ میں فرداً فرداً ان پر غور نہیں کر سکتا اور اجتماعی صورت میں یہ ایک دھند سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں دراصل آج کل اُس جگہ پہنچا ہُوا ہوں جہاں یقین اور انکار میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ سمجھتے بھی ہیں اور نہیں بھی سمجھتے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا ساری کی ساری مٹھی میں چلی آئی ہے اور بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے ہم ہاتھی کے جسم پر چیونٹی کی مانند رینگ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا (COMPLEX) ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اِس سے رُوح اور دماغ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس ایک ایسا سوچ بورڈ آجائے جس سے میں حسبِ خواہش روشنیاں پیدا کر سکوں۔ جس وقت چاہوں گھپ اندھیرا کر دوں اور جس وقت چاہوں روشنی کا سیلاب بہا دوں۔ کیا ایسی چیز مل جائے گی؟ —— کچھ کہا نہیں جا سکتا!

کچھ بھی ہو مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر شئے میں مجھے ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں خود اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں، جو کچھ میرے اندر ہے، وہ نہیں ہونا چاہیئے، اُس کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیئے۔

عشق و محبّت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ نیچر کی ایک موونی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں، میں جانتا ہوں، نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے؟ —— کیا ہونا چاہیئے؟ —— اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہوگا؟

لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے اِن سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہُوا ہے۔ عورت کا وہ تصوّر جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا —— کس قدر افسوسناک چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے ہو کر بھی ہم اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لئے روکے!....... مگر....... مگر کیا؟ —— کچھ بھی نہیں! —— سب بکواس ہے۔

آپ کے عزیز کی ناگہانی موت سے بہت صدمہ ہُوا۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے۔

آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اگر ہو سکے تو اس خط کا جواب جلد لکھ دیجیئے گا۔

"MUD" میں نے لکھ لیا ہے۔ مگر مکالمہ لکھنا باقی ہے جو دیر میں لکھا جائے گا۔ آجکل میں اپنے افسانوں کی ترتیب میں مشغول ہوں۔ کتابت شروع ہے۔

فیض صاحب آپ کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ آپ کی نظمیں بہت پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاص طور پر اُس کا ڈیزائن بناتے ہیں۔ تازہ پرچے میں انہوں نے آپ کی نظم کو بہت خوبی سے (ILLUSTRATE) کیا ہے۔

ادب لطیف میں آپ کا منظوم مکالمہ پڑھا۔ بہت خوب ہے۔ آئندہ پرچے میں اس پر ریویو شائع ہو رہا ہے۔

یہ راجندر سنگھ صاحب بیدی کون ہیں؟ —— یہ بھی مٹی کے ڈھیلے معلوم ہوتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ اِن کے افسانے آپ غور سے پڑھا کریں۔ ادب لطیف کو آپ اور بیدی صاحب پر نازاں ہونا چاہیئے۔

دفتر میں "کمال اتاترک نمبر" کی ایک کاپی بھی نہیں تھی۔ بہرحال آپ کے لئے بڑی مشکل سے ایک پرچہ حاصل کیا گیا ہے۔ جو کل بھیجا جائے گا۔ دفتری کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ آپ کے پرچے کا پیکنگ احتیاط سے کیا کرے۔

نذیر صاحب اور خلش آپ کو آداب عرض کرتے ہیں۔ یہاں ہم سب لوگ آپ کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

افسانہ ضرور بھیجئے گا:

"ہمایوں" کے تازہ پرچے میں (فروری) میں میرا "منتر" پڑھ کر اپنی رائے سے آگاہ فرمایئے گا۔

میں بخیریت ہوں۔ امید ہے کہ آپ بھی بصحت ہوں گے۔ خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸
۱۲ فروری ۳۹ء

برادر عزیز

محبت نامہ ملا۔ غزلوں کا شکریہ —— میں اس کے آگے اسی قسم کے چند اور رسمی الفاظ لکھنے والا تھا کہ آپ کے خط کی مندرجہ ذیل سطور پر نظر پڑی۔

"کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کیوں نہ اپنی زندگی کو بدپرہیزیوں کی نذر کر دوں" —— میں اپنی زندگی کا ۳/۴ حصہ بدپرہیزیوں کی نذر کر چکا ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے پرہیز نہیں کیا۔ اب تو یہ وقت آ گیا ہے کہ پرہیز لفظ ہی میری ڈکشنری سے غائب ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز میں گزاری جائے تو بھی قید ہے، اگر بدپرہیزیوں میں گزاری جائے تو بھی قید۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اس اُونی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے جانا ہے اور بس۔ میں اپنا کام آدھے سے زیادہ کر چکا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ کر دوں گا۔ اس لئے کہ میں بہت جلد مرنا نہیں چاہتا۔ جس روز مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کیا ہوں تو موت کو بلانے میں کوئی پس و پیش نہ کروں گا۔

میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں، کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔ اسی ادھیڑبن میں لگا رہتا ہوں۔ دماغ ہر وقت کام کرنے کے باعث تپتا رہتا ہے، میرا نارمل درجہ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے، جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر نقاہت، —— وہ مستقل تھکاوٹ جو میرے اوپر طاری رہتی ہے کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اگر مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو تو میں وہ بکھرے ہوئے خیالات جمع کر سکتا ہوں جو برسات کے پتنگوں کے مانند اُڑتے رہتے ہیں مگر .... اگر مگر ...... کرتے ہی کسی روز مر جاؤں گا اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں گے "منٹو مر گیا! ...... منٹو تو مر گیا صحیح ہے ...... مگر افسوس اس بات کا ہے کہ منٹو کے وہ خیالات بھی مر جائیں گے جو اُس کے دماغ میں محفوظ ہیں۔

اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار ہے۔ منٹو، منٹو کے لئے زندہ نہیں ہے۔۔ ۔۔۔ مگر اس سے کسی کو کیا! ——— منٹو سے کیا ملا؟ ——— چھوڑیئے اس فضول قصے کو ——— آئیے کوئی اور بات کریں۔

کرشن چندر صاحب خوب لکھتے ہیں۔ ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ میں اُن کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

آپ کا افسانہ پڑھا۔ بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ کا یہ فقرہ مجھے بہت پسند آیا۔

"اُس کے دل سے آواز آئی اور اُسے شبہ ہونے لگا کہ شاید انسپکٹر نے بھی یہ آواز سن لی ہے"

آپ کے اس افسانے میں مجھے "چیخوف" کا رنگ نظر آیا۔ تازہ پرچے میں چھپ جائیگا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھی اپنا افسانہ بھیجدیا کریں۔

آپ نے "منتر" پسند کیا۔ شکریہ!

رفیق صاحب آپ کی ایک غزل اس مہینے ریڈیو پر گا رہے ہیں۔ "انڈین لسنر" میں آپ کا نام دیکھا تھا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خلش صاحب اور نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈیلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی نمبر ۸
۲۶ر جون ۳۹ء

پیارے ندیم

تمہارے دونوں خط ملے۔ سوچ رہا ہوں کہ تم میں اتنا اخلاص کیوں ہے؟ ——— میں ڈرتا ہوں۔ اندھیرے میں رہنے والا زیادہ تیز روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ تمہارا ہر خط مجھے ڈرا دیتا ہے۔ کیا کروں، عمر بڑھنے کے ساتھ مجھ میں بچپن آتا جاتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں گھٹنوں کے بل چلوں گا اور تتلا تتلا کے باتیں کرونگا۔ لوگ پھیلتے ہیں، میں سکڑ رہا ہوں۔

زندگی کے جن ادوار سے میں گذر رہا ہوں اُس پر نظر کرنے کی میرے پاس فرصت نہیں۔ کئی اسٹیشن آتے ہیں جن پر میری زندگی کی گاڑی ٹھہرتی ہے مگر میں تھکاوٹ سے چُور سفر کے آغاز ہی سے تنگ آیا ہوا وہ بورڈ ہی پڑھ سکتا جس سے مجھے اسٹیشن کا نام معلوم ہو جائے۔ عجب حالت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں آئے بھی کیسے جب کہ سمجھنے کی فرصت ہی نہیں۔

کرشن چندر کہتے ہیں میں اُن کے لئے نیا افسانہ لکھوں ——— جی چاہتا ہے اُن کو اپنا تازہ فوٹو کھچوا کر بھیجدوں۔ آنکھوں والے اُسے دیکھ کر کئی نئے افسانے پڑھ لیں گے۔

تم نے بہت تاکید کی ہے کہ میں "نئے زاویئے" کے لئے کچھ غیر مطبوعہ افسانہ لکھوں۔ مجھ سے پوچھو تو یہ افسانہ نگاری بالکل بکواس ہے جس کے عوض صرف شکریہ ملے ——— میرا ڈاکٹر جو ہر روز مجھے دوا بھیجتا ہے شکریئے کے علاوہ روپے بھی مانگتا ہے۔ کل اُس نے ایک روپیہ واپس بھیجدیا تھا اس لئے کہ اُس میں کھنکھناہٹ کم تھی۔ خیال تھا کہ کل افسانہ شروع کرونگا مگر اس کم کھنکھناہٹ والے روپے کو ہتھیلی پر رکھا تو میری سب کھنکھناہٹ غائب ہو گئی ———

بہر حال افسانہ لکھ دوں گا اس لئے کہ تمہاری سفارش ہے اور کرشن چندر سے بھی مجھے پیار ہے۔ کرشن چندر صاحب کو اتنا ضرور لکھ دو کہ میری

ماں مرگئی ہے اُس کا ماتم کرنے کے لئے مجھے جو فرصت مل سکتی ہے وہ میں اُن کے حوالے کر دوں گا۔

مکتبہ اُردو والوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دس جون کو ۵۰۰ روپے میں سے پہلی قسط، پچاس روپے کی بھیج دیں گے مگر اب تک منتظر ہوں —— مجھے اس تانبے ملی ہوئی چاندی کی آمد کا شدید انتظار ہے۔ دیکھئے وہ مجھ پر کب کرم کرتے ہیں۔

"قاضی جی کا فیصلہ" لکھنؤ بھیجا تھا مگر واپس آیا۔ اب دہلی بھیجا ہے، دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔ حیدر آباد والوں نے ابھی تک رسید سے مطلع نہیں کیا۔ "پیلی کمرے پر" جولائی میں بک ہو گیا ہے۔ "قاضی جی کا فیصلہ" اگست میں ہوگا۔ (یہ دونوں بمبئی سے براڈکاسٹ ہوں گے۔)

طبیعت بہت اُداس رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ کروں —— یہ "کچھ" کیا ہے؟ —— سوچ رہا ہوں۔

اس وقت کرپارام صاحب کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ بارش ہو رہی۔ پنڈت جی سلام لکھواتے ہیں۔ وہ علیحدہ خط بھی لکھیں گے۔

صفیہ بصحت ہے۔ آداب عرض کرتی ہے۔ اس وقت سامنے بیٹھی بچے کے لئے دودھ بنا رہی ہے۔

میں بہت دُکھی ہوں۔

(۱) "پیلی کمرے پر" ۲۳؍ جولائی کو بمبئی سے براڈکاسٹ ہوگا۔ اس کا حق الخدمت بیس روپے ملے گا۔ خواجہ ظہیر الدین کے نام سے نشر ہوگا۔

(۲) مکتبہ اُردو والوں نے آج ۵۰ روپے منی آرڈر کے ذریعے سے بھیج دیئے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

دہلی

۱۲؍ جولائی ۱۹۴۱ء

برادرِ عزیز

السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ مل گیا تھا۔ افسوس کہ اس دوران میں میری طبیعت ناساز رہی۔ پرسوں سے پھر شدت کا درد ہو رہا ہے۔ مالی حالت اس قدر خراب ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں کے سول سرجن کے زیر علاج ہوں۔ وہ کہتا ہے ہسپتال میں داخل ہو جاؤ مگر اِدھر چھٹیاں ملتی ہیں تو تنخواہ نہیں ملتی۔ عجب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایک صرف کرشن کی ہمدردی مجھے یہاں میسر ہے مگر اکیلی ہمدردی کیا کر سکتی ہے۔

آپ کا خط ملتے ہی میں نے بمبئی لکھ دیا تھا۔ وہاں سے آج جواب آیا ہے۔ انھوں نے پندرہ روپے بھیجے ہیں، باقی پندرہ وہ اگلے مہینے بھیجیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ سوچتا ہوں یہ پندرہ میں خرچ کر لوں اور آپ کو کچھ نہ بھیجوں۔ اگلے مہینے جب پندرہ آئیں تو اکٹھے تیس روانہ کر دونگا۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکا۔ میں خوفناک طور پر مفلس ہو رہا ہوں۔ اس کا عملی ثبوت میں نے آپ کو دے دیا ہے۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے "ڈرپوک" پسند کیا۔ میں علالت کے باعث آپ کا کوئی تازہ افسانہ نہیں پڑھ سکا۔

صفیہ بمبئی گئی ہوئی تھی، اب واپس آ گئی ہے۔ آپ کو سلام لکھواتی ہے۔

خط لکھتے رہا کریں۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔

جواب آل انڈیا ریڈیو کے پتے سے دیجئے گا۔ یہاں خط مجھے آسانی سے مل جاتے ہیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸
۲۱ فروری ۴۳ء

پیارے ندیم

مجھے معاف کر دینا بھائی۔ میں سخت شرمندہ تھا اسی لئے خط نہ لکھ سکا۔ تمہارے گیت منگوائے، مگر یہاں وہ صاحب ہی غائب ہو گئے جو لینا چاہتے تھے۔ ناچار مصور میں چھاپنا پڑا۔ میری تقصیر معاف کر دینا۔ میں بہت شرمندہ ہوں بخدا۔

یہاں ہر روز تمہاری باتیں ہوتی ہیں۔ صفیہ کہتی ہے کہ ندیم بھائی کو یہاں اپنے پاس بلا لو۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ شاہد لطیف اور عصمت بھی چاہتی ہیں۔ میں نے تمہیں خط بلکہ تار بھیج دیا ہوتا مگر ادھر اس کم بخت گاندھی نے روزہ رکھ لیا اور یہ بات کھٹائی میں پڑ گئی۔

ہاں، تم یہ لکھو کہ لاہور میں تمہارے گزارے کی کیا صورت ہے۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم تم دونوں ایک جگہ رہ سکیں۔

ہاں بھئی۔ وہ تم نے ماہنامہ مصور کے لئے جو مضمون شروع کیا تھا بھیجا ہی نہیں۔ پہلا نمبر شائع ہونے میں اب بس کچھ دیر نہیں۔ خدا کے واسطے اپنا مضمون جو کہ شاید گیتوں پر تھا اپنی چند تازہ غزلوں یا نظموں کے ہمراہ فوراً بھیج دو اور مجھے ممنون کرو۔ تمہارے مضمون اور تمہاری غزل کے بغیر پرچہ شائع نہیں ہو گا۔ اس نمبر میں تم اپنے تمام دوستوں کو پاؤ گے۔

ندیم صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔
مضمون اور غزلیں جلد بھیجو۔
صفیہ سلام لکھواتی ہے۔

تمہارا بھائی
سعادت

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸
۱۰ مئی ۴۳ء

ندیم بھیا

آپ کا محبت نامہ ملا۔ مجھے آپ کے خلوص پر نہ پہلے کبھی شک تھا اور نہ اب ہے۔ اگر میرے دل میں ذرہ برابر میل بھی آپ کی طرف سے موجود ہوتا تو مجھ سے پہلے آپ کو شاید اس کا علم ہو جاتا۔ میرے دل کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں۔

چند روز ہوئے جبکہ صفیہ بستر علالت پر پڑی تھی، دلیو ندر ستیارتھی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے اُس کو گالیاں دیں۔ میرے دل میں اُس کے متعلق جو خیالات بھی تھے اُن کا اظہار کر دیا اور اُس سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اُس نے اس کے بعد کمال ڈھٹائی سے دو تین مرتبہ پھر فون کیا لیکن میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا بلکہ اُس کی اس ڈھٹائی نے مجھے اور متنفر کر دیا۔ اگر وہ جواب میں مجھے گالیاں دیتا اور اُس حملے کا جواب دیتا جو میں نے اُس پر کیا تھا تو بہت ممکن ہے میں خود اُس کے پاس جا کر اپنے یہاں مہمان ٹھہرا لیتا۔ صفیہ نے فون پہ میری یہ تمام باتیں سنیں، مجھے بڑا بھلا کہا لیکن میں نے اُس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار محبت کے الفاظ نہیں لا سکتا۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ اگر مجھے آپ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں نے سب سے پہلے اس کا اظہار کر دیا ہوتا۔

بات یہ ہے کہ اب میری دماغی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں بیک وقت سوچنے سے میں بڑا افراتفری کے عالم میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں میں کوئی قابل قدر چیز نہیں لکھ سکا۔

بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔ در اصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈ رہا ہوں جو لکھنی ہے۔ اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو یہ کچھ بھی نہیں یعنی کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ اگر مجھے ایسے ہی افسانے لکھنا ہیں تو پھر میں ایک خاص لائحہ عمل مرتب کر دونگا اور اس کے مطابق کام کرونگا۔ زیادہ مغز دردی کی کیا ضرورت ہے۔

مگر چھوڑیئے اس قصّے کو۔

آپ گانے جلد از جلد بھیجئے۔ میں نے آپ کے لئے ہمیشہ کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ مصیبت یہ ہے کہ میری کوششوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہوتی رہی ہے۔ خدا کرے کہ اب نہ ہو۔

کہانی کے چند مناظر اور بھیج رہا ہوں۔ اس میں ٹائپ کی بے شمار غلطیاں ہیں مگر آپ فوراً سمجھ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ایک گیت کی ضرورت ہے۔ وہ آپ لکھ دیں۔

یہ گیت بھی خاص طور پر اچھا ہونا چاہیئے۔ آپ منظر کو ایک دو بار پڑھیں اور غور کریں تو آپ مطلب کی چیز لکھ سکیں گے۔ سوال و جواب جذباتی قسم کے ہیں جو SITUATION کے ساتھ چسپاں ہو جائیں۔ یاد رکھیئے کہ چمپا ایک لولی لنگڑی عورت ہے اس کو سہارے کی ضرورت ہے لیکن یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ ممکن ہے یہ سہارا جواب نہ دے جائے اور وہ اور زیادہ گہرائیوں میں غرق ہو جائے۔ محبت میں ٹھوکر کھا کر جسم کے ساتھ اس کی روح بھی مغلوج ہو جائے ——— دوسری طرف شنکر کو یقین دلانا چاہیئے کہ وہ ایماندار آدمی ہے۔ یہ مضمون آسان اور جذباتی لفظوں میں اگر آپ نے باندھ دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ فلمی گیت لکھنے کا گر پا گئے۔

صفیہ آپ کے خلوص کی بہت شکر گزار ہے۔ اب اس کی طبیعت اچھی ہے۔ سلام عرض کرتی ہے۔

جونہی مصوّر کا ماہنامہ چھپا میں آپ کو نئے پتے سے بھیج دونگا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

کرشن چندر مستعفی ہو کر یہاں بمبے آیا تھا دو روز رہ کر پونہ چلا گیا جہاں وہ ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گیا ہے۔

آپ کا رجسٹرڈ لفافہ مل گیا ہے۔ گیتوں اور کہانی کے متعلق پھر لکھوں گا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈلفی چیمبرز

کلیئر روڈ ——— بمبئی ۸

ستمبر ۴۳ء

پیارے ندیم

تم اپنے دل میں خدا جانے کیا سمجھتے ہو گے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ عرصے سے بہت ہی سست ہو گیا ہوں۔ کئی بار دل چاہا ہے کہ تمہیں خط لکھوں، بہت ہی مفصل خط لکھوں مگر لکھنے سے طبیعت اچاٹ سی ہو گئی ہے۔ جانے کیوں؟

تمہارے اخلاص پہ مجھے ناز ہے میری جان۔ خدا کے لئے دل میں کبھی اس خیال کو جگہ نہ دینا کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں۔ تمہاری یاد سے میرا دل ہمیشہ لبریز رہتا ہے۔ اور میں ہمیشہ ایسے موقعے کی تاک میں رہتا ہوں کہ ہم تم اکٹھے رہ سکیں۔

تمہاری علالت بہت افسوسناک ہے مگر یہ اور بھی زیادہ افسوسناک بات ہے کہ میں اب کسی کی علالت کے دکھ کو محسوس نہیں کر سکتا۔ شاید اس

...کہ میں خود جسمانی اور روحانی طور پر علیل رہتا ہوں۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔

میں اس کوشش میں ہوں کہ تمہیں یہاں بلا لوں۔ دعا کرو کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔

شاہد لطیف نے تمہاری حالت کا سنا تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ تمہیں سلام لکھواتا ہے اور تمہاری صحت کے لئے دعا کرتا ہے۔

صفیہ پچھلے دنوں بہت بیمار رہی ہے مگر اب خدا کے فضل سے صحت ہے، تمہیں سلام عرض کرتی ہے۔

میں آجکل "فلمستان" میں نوکر ہوں جہاں شاہد لطیف ملازم ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے جاتا ہوں اور رات کو گیارہ بارہ بجے لوٹتا ہوں۔ عجب زندگی ہے۔

"پھول اخبار" میں تم کیا کرتے ہو۔ اسے چھوڑو اور یہاں چلے آؤ۔ مجھے امید ہے کہ تم یہاں لاہور سے زیادہ کما لیا کرو گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے آج تک میری نہیں مانی۔

میری صحت اچھی تو نہیں لیکن ٹھیک ہے، یعنی سینے کا درد اب کچھ عرصے سے نہیں ہو رہا۔

امید ہے کہ تم اب بخیریت ہو گے۔ اپنی صحت سے فوراً مطلع کرو۔

ہمیشہ تمہارا

سعادت حسن منٹو

فلمستان لمیٹڈ۔ بمبئی

اکتوبر ۴۵ء

پیارے ندیم

میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ تو مجھ سے اتنی محبت کریں اور میں آپ کے خطوں کا جواب بھی نہ دے سکوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا عذر پیش کروں، سوائے اس کے کہ میں بے حد سست اور کاہل ہو گیا ہوں۔

جس روز آپ کے دوست چٹھی لے کر میرے پاس آئے میں اپنے مقدمے کی پریشانیوں میں غرق تھا۔ یہ کمبخت میرا لال نہایت ہی واہیات انسان ہے۔ اُس نے مقدمے میں ذرّہ برابر دلچسپی نہیں لی چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ صفائی کا کوئی گواہ پیش نہیں ہوا اور فیصلے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ ۲۲ اکتوبر کو حاضرِ عدالت ہونا تھا مگر میں بیمار ہوں۔ نومبر کے وسط میں اگر کوئی تاریخ مل گئی تو چلا جاؤں گا۔ میرا پروگرام یہی ہے کہ لاہور پہنچ کر آپ سے ملوں، کیونکہ آپ کے دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ نومبر میں لاہور آنے والے ہیں۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب پہلے سے آپ کی صحت بہتر ہے۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔

سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خط لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیگار کی جسمانی مشقت کر رہا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آدمی لکھے بغیر اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتا۔

لاہور آ کر آپ سے مفصل باتیں ہوں گی اور وہیں بیٹھ کر مستقبل کے متعلق کوئی پروگرام بھی سوچیں گے۔ اصل میں اس ایٹم بم نے میری زندگی کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شئے فضول ہے۔ مستقبل کے متعلق کیا سوچیں گے۔ میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ حال اور مستقبل اب بالکل بے معنی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال دیکھئے ہم کیا سوچتے ہیں۔

میں نے ابھی تک کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔ ارادہ ہے کہ ساقی کے لئے ایک افسانہ لکھوں۔ صفیہ مجھ سے سخت ناراض ہے کہ میں نے اتنی دیر آپ کو خط نہیں لکھا۔ یہ خط میں اُسی کے اصرار پہ لکھ رہا ہوں۔ پوسٹ کرنے کا ذمّہ اُس نے لیا ہے۔

خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کے اخلاص کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

آپ کا بھائی

سعادت

شخصیات نمبر
کے بارے میں
احباب کے تاثرات

(ابتدائیہ)

شخصیات نمبر، جو میری ایک برس کی محنتوں کا حاصل تھا پڑھے لکھوں کی منڈی میں جب دام لگانے کے لئے لایا تو داد اور بے داد سے اس کا استقبال ہوا ——— نہ میں داد سے اچھلا اور نہ بیداد سے آزردہ خاطر ہوا۔ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کا ہمیشہ کی طرح شکر گذار ہوا جو اپنی فناتی مصلحتوں کی بنا پر خفا ہوئے ان سے ہمدردی پیدا ہوئی۔

میں نے اعلان کیا تھا کہ منٹو نمبر کے بعد شخصیات نمبر (حصہ دوم) شائع کروں گا۔ یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکے گا۔ ایک تو میں لُٹے دن ہی نمبر نکال کر نڈھال ہوں۔ دوسرے حصہ دوم کے لئے میں نے اپنی عادت کے مطابق پھر ایسا لمبا چوڑا پروگرام بنا لیا ہے کہ اسے کسی صورت بھی جلد پیش نہیں کر سکتا جی چاہتا ہے کہ اس نمبر کے بعد اس موضوع پر (حتی الامکان) کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ جو نامور اہلِ قلم پر لکھنے والے موجود ہیں ان سے مخصوص زمینوں کے مضامین لکھواؤں اور جن پر اس نوع کا آج کوئی لکھنے والا نہیں ہے ان پر سوانحی انداز کے مضامین لکھوا کر دوسرے حصہ کو ابتدا سے اب تک مکمل کر دوں۔

شخصیات نمبر سے متعلق چند کرمفرماؤں کی آرا کو ان کی اجازت سے پیش کر رہا ہوں:۔

بابائے اردو:

تسلیم! آپ کی شکایت بجا کہ میں نے آپ کے نئے رسالے پر رائے ظاہر نہیں کی۔ یہ پورٹ کی پوٹ اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی پناہ!! اسے رسالہ کون سمجھ سکتا ہے۔ یہ تو ابو الرسائل ہے۔ اس پر اظہار رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں اور پھر ان لکھنے والوں کی شخصیتیں اور ان پر مقالے۔ ایک طومار ہے۔ یہ نمبر درحقیقت قاموس شخصیات ہے جو مدتوں یاد رہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لئے اسے ڈھونڈا کریں گے۔

آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں مگر تازہ نمبر شخصیات کا سب پر سبقت لے گیا ہے۔

اب صرف آپ کی ایک شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کہ سنہ پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔

عبدالحق

نیاز فتحپوری:

تسلیم! آپ نے سالنامہ پسند فرمایا، خوشی ہوئی۔ لیکن جس وقت نقوش کے سالنامہ کا خیال آتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے۔ کہاں شخصیات نمبر جس کا حجم قرآن سے بھی زیادہ ہے اور کہاں علماء اسلام نمبر جو کسی معمولی "درود شریف" کی کتاب سے بھی ضخامت میں کم ہے جس وقت میں سوچتا ہوں کہ آپ نے اپنے سالنامہ کی ترتیب میں کتنی روحانی اور ذہنی کوفت برداشت کی ہوگی تو سالنامہ سے زیادہ آپ کے صبر و تحمل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شخصیات نمبر پر مارچ کے نگار میں تبصرہ ضرور شائع ہوگا۔

نیاز

عبدالمجید سالک:

"نقوش" کا شخصیات نمبر اردو کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شخصیات کی تعداد، ان کی بوقلمونی، رسالے کی ضخامت، اس کی حسین طباعت غرض ہر چیز طفیل صاحب کی خوش ذوقی، ان کی بے پناہ محنت اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے۔ بلا شبہ بعض قابلِ ذکر شخصیتوں کا تذکرہ حذف ہو گیا۔ لیکن ادب و شعر کی تمام شخصیتوں کا ایک مجلد میں اس طرح جمع کرنا کہ کوئی بھی نہ چھوٹ سکے قریب قریب محال ہے اور طفیل صاحب آخر انسان ہی ہیں۔ کوئی مافوق الانسان ہستی تو نہیں ہیں۔ یہ نمبر اردو زبان کے آئندہ مؤرخین کے لئے قابلِ قدر مآخذ کا کام دے گا۔ اس لئے کہ ادبا و شعرا کا کلام تو ہر وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان کی شخصیتوں کی زندگی کے متعلق معلومات آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اس نمبر نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ یہ طفیل صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کی قدر نہ کرنا پرلے درجے کی سنگدلی ہے۔

سالک

امتیاز علی عرشی (رامپوری)

مکرمی! تسلیم۔ رسالۂ نقوش کا شخصیات نمبر ملا۔ اس گراں ارز تحفے کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے اس نمبر کو پہلی بار دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ اور جب اسے پڑھ لیا تو دہشت طاری ہو گئی۔ اللہ اکبر! اتنی شخصیتوں کے متعلق ایسی دلچسپ اور مفید معلومات اتنی کم مدت میں آپ نے جمع کر کے پیش کر دیں کہ میں اسے ادبی کرامت یا معجزہ تو کہہ سکتا ہوں سعی و کوشش کا نتیجہ کہہ کر اس کی غیر معمولی اہمیت کو کم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ان ادبی و علمی شخصیتوں میں سے جن جن سے شرفِ ملاقات حاصل ہے ان کے بارے میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انہیں اب تک زیادہ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ اس سے رتبے میں کہیں کم تھا جو اب معلوم ہوا ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا ہے کہ اس رسالے کو محفوظ کر لو اور وقتاً فوقتاً اس کے مضامین پڑھا کرو۔ مجھ بوڑھے سے زیادہ تمہارے لئے یہ کار آمد ہے۔

میری درخواست ہے کہ آپ اس کے دوسرے حصے کو ضرور اور جلد شائع فرمائیے۔ یہ ادبی و سیرتی ہر دو لحاظ سے بڑی کامیاب اور مفید کوشش ہے۔ اور جتنا زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اس مجموعے کی اہمیت برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ بعید نہیں کہ یہ مضامین آپ کو الگ کتابی شکل میں بھی چھاپنا پڑیں۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔ سبحان اللہ! کتنے سنجیدہ، کیسے علم افزا، کس درجہ عقل آفریں اور کس قدر تجربہ آموز!!

اگر نقوش میرے دماغ پر اپنا نقش بٹھاتا رہے تو نسبے قسمت! اگر ہوں مفت خور۔ نہ چندہ ادا کروں گا اور نہ مقالہ بھیجوں گا۔ ہاں! معلومات تنقید علم و صحت میں نذر کمیں کر سکتا ہوں۔ والسلام مع الاکرام۔

احقر:
امتیاز علی عرشی

رشید احمد صدیقی:

محترمی تسلیم! نقوش کا شخصیات نمبر بہت اچھا نکلا۔ اتنے بڑے پیمانہ پر جو کام کیا جائے گا ظاہر ہے اس میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی نقص بھی راہ پا جائے گا لیکن ان فوائد کو دیکھتے ہوئے جو اس نمبر سے اُردو داں طبقہ کو کچھ دنوں تک میسر آئیں گے۔ اس نمبر کے گراں بہا ہونے میں شبہ نہیں۔ اُردو کے خدمت گزاروں کے بارہ میں بڑی مفید، دلچسپ اور مستند باتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں اور آپ اس خدمت اور کارنامہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آپ مسرور و مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب:
رشید احمد صدیقی

مالک رام:

مکرم بندہ جناب محمد طفیل صاحب! آداب و تسلیمات۔ میں نے آپ کا شخصیات نمبر دیکھا ہے چشم بد دور، ماشاء اللہ۔ اگرچہ بعض ایسے مضامین شامل ہو گئے ہیں جو چھوڑے جا سکتے تھے لیکن جو کام آپ نے کیا ہے اس کی قدر اردو زبان کا آنے والا مؤرخ کرے گا۔

بعض زندہ شخصیتیں ایسی ہیں جن پر لکھوانے کی ضرورت ہے۔ اطہر، پرویز، دل شاہجہان پوری پر لکھوائیے۔ مرحوموں میں ایک اور اضافہ کیجیے کشن پرشاد کول، اور یہ بھی یاد رہے کہ ابھی چند دن ہوئے ان سے متعلق ایک مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ہفتہ وار اخبار صدق جدید میں لکھا تھا۔

بہرحال جو کام آپ نے کیا ہے اس کے لئے مبارک باد قبول فرمائیے۔ والسلام

خاکسار:
مالک رام

سید احتشام حسین:

برادرم طفیل صاحب! تسلیم۔ نقوش کے خاص نمبر کی داد کس طرح دوں۔ میں تو یہی حیرت کرتا ہوں کہ آپ نے یہ سات سو صفحوں کا رسالہ کس طرح شائع کیا، مضامین کس طرح حاصل کئے۔ یہ نمبر اردو ادب کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔
مضامین کے متعلق اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک جتنے پڑھے ہیں ان میں سے اکثر پسند آئے۔ مفصل تنقید تو اسی وقت ہو سکے گی جب تمام مضامین پڑھ لئے جائیں گے۔
میری صحت برابر خراب رہتی ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا۔

مخلص:
احتشام حسین

سید مسعود حسن رضوی:

مکرمی! تسلیم۔ نقوش شخصیات نمبر وصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ رسالوں کے خاص نمبر نکلا ہی کرتے ہیں، آپ بھی نکال چکے ہیں۔ لیکن مجھے افسانوی ادب سے زیادہ معلوماتی ادب سے دلچسپی ہے اور آپ نے شخصیات نمبر میں مفید اور مستند معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اگر اپنی حالت پر قیاس کرنا درست ہو تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا ہر خادم آپ کا احسان مند ہوگا اور اس قابل قدر تذکرۂ ادبا کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ اس نوعیت کا خاص نمبر نکالنے کے لئے آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اس کا تھوڑا سا اندازہ مجھے

اس طرح ہوا کہ صرف حضرت یگانہ لکھنوی پر مضمون حاصل کرنے کے لئے کتنے خط آپ نے مجھ کو لکھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب رسالہ چھپ کر سامنے آگیا ہوگا تو آپ نے جتنی محنت کی تھی اس سے زیادہ مسرت ہوئی ہوگی۔ آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دینا تو رسمی سی چیز ہوگی میرے خلوص کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے احسان مندی کے جذبات کا ہدیہ پیش کروں۔ والسلام! دعاگو:

سید مسعود حسن رضوی

کرشن چندر:

برادرم! تسلیم - آپ کا شخصیات نمبر بہت خوب رہا۔ ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔ فراق، مجنوں، منٹو، ندیم، عباس اور تسنیم پر مضامین پڑھ لئے ہیں۔ مستقل رائے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت تو اس تاریخی کام کے لئے مبارکباد قبول فرمائیے۔

آپ کا: کرشن چندر

ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

عزیزی طفیل صاحب! نقوش کا شخصیات نمبر کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور آپ مستحق مبارکباد ہیں۔ اس شمارے میں ماضی و حال کے ادیبوں کے نجی حالات و ذاتی خصوصیات سے مستقبل کے ادبی مؤرخ کو ایسا مواد بھی مل جائے گا جو ابھی تک دستیاب نہ تھا اور جو نفسیاتی مطالعے کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ان ادیبوں پر قلم اٹھانے والوں کے لئے یہ شمارہ چھوٹا موٹا کتب خانہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ مضمون لکھنے والوں کو دربدر نہ پھرنا پڑے گا۔ ایک ہی جگہ بہت کچھ حالات مل جائیں گے۔ میں ابھی تک پورا نمبر نہیں پڑھ سکا اس لئے کہ اول تو اس کی ضخامت ایسی ہے کہ جلدی نہیں ختم ہو سکتا دوسرے یہ کہ جن ادیبوں کا ذکر اس نمبر میں آیا ہے ان میں بہت سے جانے پہچانے ہیں۔ دورانِ مطالعہ میں کبھی کبھی یہ غور کرنا پڑتا ہے کہ مضمون نگار فلاں ادیب کے بارے میں ذاتی تاثرات سے مغلوب ہو کر یہ لکھ گیا ہے یا یہ امرِ واقعہ ہے کہیں کہیں اختلاف رائے سے بھی مجھے رُکنا پڑتا ہے۔

غالباً آپ کا یہ منشا بھی نہیں کہ افسانے کی طرح اس نمبر کو لوگ بغیر غور کئے پڑھ کر ختم کر دیں۔ بہرحال کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے پڑھ رہا ہوں۔ مجموعی حیثیت سے رسالہ بہت پسند آ رہا ہے۔ کہیں کہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مضامین لکھنے والے حالات و واقعات کو ادبی مؤرخ یا نقاد یا سوانح نگار کے لحاظ سے نہیں لکھ سکے۔ ادیب کو ممدوح سمجھ کر نثر میں قصیدہ لکھ گئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لکھنے والے اس نمبر میں نظر آئے جو درپردہ اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ بار بار اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاش آپ اعلان کر دیتے کہ اگر موقع ملا تو ایسے مضمون نگاروں کو بھی نقوش میں کبھی جگہ دی جائے گی۔ ان پر بھی مستقل مضمون کوئی لکھ دے گا تو شاید ایسے مضمون نگار بے چین ہو کر درمیان میں اپنی تعریف نہ کرتے یا کم کرتے۔ اسی طرح کچھ ایسے بھی مضمون نگار اس شمارہ میں ہیں جو اپنی طرزِ تحریر کو نمایاں کرنے کی دُھن میں زیرِ بحث ادیب کے حالات ذہن نشین نہیں ہونے دیتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ یہ فکر ہے کہ چاہے اصل ادیب کے حالات و واقعات سامنے نہ آسکیں لوگ میری طرزِ تحریر کے قائل ہو جائیں۔ برخلاف اس کے جن لوگوں نے سیدھے سادے انداز میں ادیبوں کے حالات قلمبند کر دیئے ہیں وہ اس منشا کو پورا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں جس کے لئے یہ نمبر نکالا گیا ہے۔

دعاگو: اعجاز

معین الدین احمد ندوی:

مکرمی! السلام علیکم - نقوش کا شخصیات نمبر موصول ہوا۔ اس کو دیکھنے سے پہلے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کامیاب ہوگا۔ آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا۔ طبقات و تراجم مسلمانوں کا خاص فن ہے جس کے ذریعہ انہوں نے مختلف اصنافِ علوم کے ہزاروں

اصحابِ کمال کے حالات محفوظ کر دیئے۔ مگر اردو میں اس کی بڑی کمی تھی اس لئے آپ نے یہ نمبر نکال کر ایک بڑی کمی پوری کی اور نہایت مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے یہ نمبر آئندہ مؤرخین کے لئے بڑا کارآمد ہوگا۔ البتہ اس میں بعض ناموں کا اندراج کھٹکتا ہے۔ بہرحال یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک نمبر میں اردو کے تمام اصحابِ قلم کا احاطہ ممکن نہ تھا امید ہے کہ اس میں جو اہم و ضروری شخصیتیں چھوٹ گئی ہیں ان کے حالات دوسرے نمبر میں آ جائیں گے۔ اس طرح دونوں نمبر مل کر اردو کے سنجیدہ تصنیفی دور سے لے کر اس زمانہ تک کے اصحابِ قلم کا جامع تذکرہ مرتب ہو جائے گا۔ والسلام

معین الدین احمد ندوی

ایس۔ اے رحمٰن (چیف جسٹس)

مکرمی! السلام علیکم۔ "نقوش" کا شخصیات نمبر ملا۔ نقوش کی روشن جبیں کشائی کے مترادف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے انتخابِ شخصیات سے اختلاف ہو لیکن جو خیال اس نمبر کا محرک ہوا ہے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اتنی ادبی شخصیات کے ذاتی حالات و کوائف کا یکجا کر دینا میری نظر میں اردو ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ آپ نے بہتوں کو دوام بخشنے کی ترکیب سے نقوش کو بھی جریدۂ عالم پہ ثبت کر دیا ہے۔

طالبِ خیریت

مخلص: ایس۔ اے رحمٰن

خواجہ احمد فاروقی:

محبِ مکرم! شخصیات نمبر ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ یہ آپ نے بڑا کام کیا جو بغیر فرہاد کے سے عزم و استقلال کے ممکن نہ تھا۔ یہ خشک مضامین کا مجموعہ نہیں۔ اس میں وہ لطف ہے جو افسانہ میں ہوتا ہے اور وہ بھی

افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت

ریاضؔ کی زبان میں ؎

باہم شبِ وصال اٹھائے ہیں کیا کیا مزے ۔۔۔ وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

یہ مواد اردو کے مؤرخ کے لئے بہت مفید ہوگا۔ بڑا اچھا ہو کہ آپ نثر کی اس داستان کو ضمیمہ میں مکمل کر دیں۔ ابھی بہت سی اہم شخصیتیں رہ گئیں ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، قاضی عبدالغفار ——— نیازؔ جیسے رندِ خراباتی پر آپ نے ایک زاہدِ مناجاتی سے مضمون کیوں لکھوایا؟ تصویریں بھی بہت کم ہیں۔

آپ کا:

خواجہ احمد فاروقی

غلام عباس:

برادرم طفیل صاحب! السلام علیکم۔ نقوش کو دیکھ کر خوشی ہوئی مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صحت مند و توانا کے بجائے موٹاپے کا مریض معلوم ہوتا ہے۔

میراجی، فیضؔ، تاثیرؔ، نیازؔ فتح پوری سے متعلق مضامین اور خاص طور پر حامد جلال کا اسکیچ "منٹو ماموں" حد درجہ دلآویز اور کامیاب ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے ابھی اور کچھ نہیں پڑھا۔ پرچے میں عسکری، راشدؔ، عزیز احمد، احمد علی، اشکؔ وغیرہم کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے جسے کوئی ضمیمے بھی پورا نہیں کر سکتے اور یہ پرچہ بیش بہا مواد مگر بے راہ روی کی عمدہ مثال ہے۔ والسلام

خاکسار،

غلام عباس

آغا محمد اشرف:

مکرمی طفیل صاحب! السلام علیکم۔ شخصیات نمبر کی کامیابی پر تشکر و مبارکباد قبول کیجئے۔ آج تک اردو زبان میں اس شکل سے کسی رسالے نے خاص نمبر نہیں نکالا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے یہ نمبر اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

خاکسار:

(آغا) محمد اشرف

شاد عارفی:

محترمی طفیل صاحب! السلام علیکم۔ شخصیات نمبر کے متعلق جتنا کچھ بھی کہا جا سکتا ہے وہ اس کی خوبیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ایک عامیانہ سی بات تو یہ ہے کہ ہر بات کی خدا کی قسم لاجواب ہی۔ مگر اس طرح وہ نہ کہہ سکا جو مجھے کہنا تھا۔ اس لئے کہ میں غالب مرحوم سے مشورہ کئے بغیر جو کچھ کہتا ہوں وہ مجھے خود نہیں بھاتا۔ جب معاملہ یہاں پہنچ جاتا ہے تو غیب سے مضامین خیال میں آنے لگتے ہیں اور میں انہیں یوں قلمبند کرنے لگتا ہوں جیسے کہ ان کا تعلق میری ذات سے ہو۔ یہ غالب مرحوم نے ہی تو کہا تھا ؎

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز   دعا میں خضر کو دیتا ہوں، عمر خضر دراز

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ فضول بات پر بھی عمر ضائع کی جا سکتی ہے۔ اب اگر میں نقوش کو خضر مان لوں اور اسے درازیٔ عمر کی دعائیں دوں تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ جو کچھ نقوش کو پہلے سے حاصل ہے اس پر طبع آزمائی کر کے میں نے کوئی مفید اور نئی بات نہیں کی۔ ارتقا اگر واقعی کوئی چیز ہے تو اسے نقوش کے ہر نمبر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کئی بچے ہمارے سامنے جوان ہوتے ہیں مگر اس قدر آہستہ اتنی دھیمی چال سے کہ ان کی بالیدگی اور نمو پر خط نہیں کھینچا جا سکتا۔ لیکن نقوش کا حال اس شریر اور عقلمند نوجوان سے ملتا جلتا ہے جو پتنگ لوٹنے کے شوق میں کئی کئی سیڑھیاں اولانگ کر چھت پر چڑھ رہا ہو۔ کسی بڑے پرانے اور عیاش شاعر کے اس شعر سے بھی نقوش کے حرکات و سکنات پر حنیف رامے، جیسی مصوری کی جا سکتی ہے کہ ؎

وہ چال چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا خیال کس کو قدم کی جا کا

اس کے بعد بھی خطرہ رہ جاتا ہے کہ کہیں یہ "جوبن پھٹ نہ پڑے" ادب برائے ادب والے بہر سے اس فقرے پر کہیں مجھے نہ کوسنے لگیں کیونکہ یہ جنسی بھسکے تو اسی تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی جوبن پھٹ پڑے تو وہ اسے اندھیرے ہی میں لوٹنے لگیں۔ اس لئے آپ کو میرا سنجیدہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے نقوش کے گردن میں تعویذ ڈال دیں تاکہ وہ مفتنے اٹھتے جوبن کے "نگہبان" ہو جائیں۔

نیازمند:

شاد عارفی

حجاب امتیاز علی:

محترمی طفیل صاحب تسلیم! آپ کو اس نوعیت کا نمبر مرتب کرنے کی خوب سوجھی۔ اس خوش ذوقی اور اپنی محنت و کاوش کے لئے آپ قابلِ صد ستائش ہیں۔ بہت دلچسپ اور دیدہ زیب نمبر ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ شاید یہ نمبر اور بھی دلکش اور پر معنی ہو جاتا اگر بعض شخصیتوں پر کئی کئی مضمون نگاروں سے طبع آزمائی کی فرمائش کی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی نظر اور اپنا اپنا خیال ہوتا۔ پھر قارئین کو ایک ہی شخصیت میں قوس وقزح کی کئی رنگینیاں نظر آجاتیں اور یہ بھی واضح ہو سکتا کہ جدید سوانح نگاری کیونکر تخلیقی انداز اختیار کرتی جاتی ہے۔

میں نقوش کا شخصیات نمبر دیر تک پڑھتی اور محظوظ ہوتی رہی کہ اچانک میری نظر سے ایک مضمون کی چند ایسی سطور گذریں جنہیں پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ۱۹۵۵ء میں اس قسم کی ناشائستہ بات کسی تعلیم یافتہ شخص کے قلم سے نکل کر نقوش جیسے ترقی پسند اور معیاری رسالے میں شائع ہو سکتی ہے؟ وہ یہ کہ صفحہ ۱۳۲۲ کی ساتویں سطر میں ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "شاید اسی وجہ سے عورتوں کو ناقص العقل کہا گیا ہے"۔ نادان مضمون نگار نے یہ جملہ کس قدر بے نیازی اور جرأت سے لکھا ہے جیسے ان کی عمر عزیز مرد و عورت کی ذہنیت پر ریسرچ کرتے گذر گئی ہے۔

حجاب امتیاز علی

فکر تونسوی

پیارے طفیل! تمہارا شخصیات نمبر مل گیا۔ دیکھتے ہی ڈربی آیا اور پیار بھی۔ نہ جانے تم اردو ادب میں طوفان برپا کرنے پر کیوں مائل ہوتے جا رہے ہو۔ یہاں جس نے بھی یہ نمبر دیکھا للچائی ہوئی نظریں ڈالیں۔ یہ نظریں تمہاری اس پروڈکشن کی عظمت کا گویا خاموش اعتراف کر رہی تھیں۔

کہو اب کیا ارادے ہیں؟

فکر تونسوی

ابنِ انشا:

برادرم طفیل صاحب! اسلام۔ شخصیات نمبر کے متعلق میں نے مخدومی مولوی عبدالحق سے پوچھا تھا کہ آپ کے زمانے میں یا اب سے پہلے اس زبان میں ایسی چیزیں شائع ہوتی تھیں؟ انہوں نے اس پر آپ کی محنت اور سلیقے کی داد دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بے حد بڑا کام ہے۔ میں نے نقوش پر موافق اور مخالف ریویو دیکھے ہیں۔ انتخابات کے متعلق اختلاف رائے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ آپ نے جن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے ان میں سے بعض کے نام واقعی کھٹکتے ہیں خواہ وہ قاضی عبدالغفار ہوں یا مجاز۔ مدعی ہوں یا سبقت نہیں ان میں سے سب کی نہیں تو بعضوں کی تلافی آپ دوسرے نمبر میں کر دیں گے ——— لیکن جن لوگوں کو زبردستی آپ نے شخصیت بنا دیا ہے ان کو نکالنے کے لئے بھی آپ کوئی الگ نمبر چھاپیں گے؟ قرۃ العین نے بہت اچھا لکھا ہے کہ شخصیت تو یا مولانا مودودی کی ہے یا بیگم رعنا لیاقت علی خان کی، لیکن وہ مذاق کی بات ہے۔ آپ کو اس معاملے میں تھوڑی سی سختی برتنی چاہئے تھی۔ بہر حال میں ایڈیٹر اور اس کے ماحول کی مجبوریاں جانتا ہوں۔ انسان کے ہر کام میں اتنی سی مجبوری یا خرابی تو رہتی ہی ہے۔ بہر صورت یہ بہت بڑا کام تھا اور آپ ہی کے کرنے کا ——— واقعی حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

ابنِ انشا

فارغ بخاری:

طفیل بھیا! شخصیات نمبر بڑا وقیع ہے اور آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بعض مضامین تو بے پناہ ہیں لیکن مجھے حامد جلال اور ابلیس فیض کے خاکے بہت پسند آئے۔ اس نمبر کا دوسرا حصّہ شائع کرنے کا جو آپ نے ارادہ ظاہر کیا ہے اس سے بہت سی بدگمانیاں رفع ہو گئی ہیں اور اس نمبر پر جو تھوڑے بہت اعتراضات وارد ہو سکتے تھے ان کی اب گنجائش نہیں رہ جاتی کیونکہ توقع ہے اس نمبر میں جو کمی رہ گئی ہے دوسرے نمبر میں آپ اسے پورا کرنے کی طرف خاص طور سے توجہ دیں گے۔ مثلاً ایک بڑی کمی تو یہی ہے کہ سرحد کی ادبی شخصیات کے ذکر سے یہ نمبر محروم رہ گیا ہے۔

مخلص:

فارغ بخاری

جیلانی بانو:

مکرمی!

"نقوش" کا شخصیات نمبر ملا، شکریہ!

آپ کے حوصلوں کی داد دینا تو چھوٹا منہ بڑی بات لگتی ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا ــــ یہ نمبر اتنا مکمل ہے کہ اس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ البتہ چند نام نظر نہیں آتے جو ایک طرح سے کافی اہم ہیں لیکن حصہ دوم میں یہ کمی بھی پوری ہو ہی جائے گی۔ شخصیات میں جو دلچسپی ہے وہ اس نمبر کو اور دلچسپ بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نمبر اتنا بڑا ادبی سرمایہ ہے جو ہمیشہ نقادوں کے پیش نظر رہے گا۔ ادھر چند برسوں میں نقوش نے اردو ادب میں وہ کام کیا ہے جس نے اسے "نقش جاوداں" بنا دیا ہے۔ ترتیب اور خوبصورتی بھی بے مثال ہے لیکن ٹائٹل اتنا اچھا نہیں جتنا مکمل "غزل نمبر" کا تھا۔

جیلانی بانو

مختار صدیقی:

شخصیات نمبر شائع کر کے "نقوش" نے ہر حلقہ میں بحث کی راہیں کھول دی ہیں۔ افسانہ، غزل وغیرہ پر مواد اور ضخامت کے اعتبار سے منفرد نمبر شائع کرنے میں "نقوش" پہلے ہی سے اردو رسائل میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اب کے نقوش نے اس صدی بلکہ گذشتہ صدی کے ربع آخر کی علمی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں ذاتی حالات اور ان کے شخصی خاکوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام اپنی جگہ بڑا اہم، بے حد دلچسپ اور مفید ہے۔ اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آ سکتی ہیں نقوش کا یہ شمارہ بالواسطہ طور پر ان کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

"شخصیات" کا موضوع فی نفسہ بے حد نازک اور کٹھن موضوع ہے۔ ویسے تو ہر شخص کی شخصیت میں دلچسپی کے رنگا رنگ پہلو مخفی ہوتے ہیں اور ان پہلوؤں میں فکر و تامل کے سامان تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم بڑی بڑی علمی اور ادبی شخصیتوں کے تحریری کارناموں کا مطالعہ ہی یہ جاننے کی خواہش پیدا کر دیتا ہے کہ یہ لوگ جو شعر و ادب یا علمی تحقیق میں اتنے بلند مرتبہ ہیں بحیثیت انسان کے کیا کچھ ہوں گے اور کیسے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی سطح سے ان "بلند" یا کم سے کم مختلف لوگوں کی شخصیت کو الفاظ میں اُجاگر کرنا اور پھر ان شخصیتوں کا ہمہ گیر اور بھرپور جائزہ لینا بے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لئے گہری نظر، بے لاگ رائے، موضوع کے ساتھ گہری واقفیت اور پھر ہمدردی کے علاوہ انسان شناسی کا گہرا سلیقہ درکار ہے۔ شخصی خاکہ لکھنے کے لئے اس شخصیت کے دل و دماغ سے گہری واقفیت ہی کافی نہیں بلکہ وہ دیدہ وری بھی چاہئے جو انسانوں کو صاحب نظر کہلواتی ہے۔ شخصیت نگاری یہی نہیں کہ زیر نظر شخصیت کے ذاتی سوانح، اس کی علمی اور ادبی اہمیت، کارناموں اور زندگی میں اس کے عام رکھ رکھاؤ یا عام چلن کا تذکرہ کر دیا جائے۔ علمی اور ادبی شخصیتیں نفسیاتی اعتبار سے بے حد پیچیدہ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان میں عام انسانوں کی کمزوریوں اور خوبیوں کے پردوں کے پیچھے بہت کچھ پنہاں ہوتا ہے۔ ان کی مخصوص ذہنی تحریکات، دماغی ہیجانات، واقعات اور مقامات کا ردِ عمل، ان کی زندگی کے مشاہدات اور تجربات غرض ان کا ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہوتا ہے جس کی آئینہ داری لازمی ہے ــــ ظاہر ہے کہ ظاہر و باطن کے اس متوازن تذکرے کو ہی ایک اچھا شخصی خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نقوش کا شخصیات نمبر اس لحاظ سے ضرور قابلِ قدر ہے کہ ہمارے ادب میں شخصیت نگاری پر بہت کم مواد موجود ہے۔ شخصیتوں کے قلمی چہروں، ان کے طبعی خصائص اور ان کے کردار پر ہمارے قدیم تذکروں میں تو الا ماشاء اللہ ہی کچھ چیزیں ملیں گی۔ البتہ اس سلسلے میں آب حیات نے بڑی کمی پوری کی ہے۔ ویسے خالصتاً شخصیت نگاری پر اردو میں چند ہی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر" رشید احمد صدیقی کا شاہکار "گنج ہائے گراں مایہ" اور بعض متفرق مضامین اور شوکت تھانوی کا شستہ محل

"مردم دیدہ" "اجڑا دیار" "باغ حسن حسرت" اور "گنجِ فرشتے" از سعادت حسن منٹو خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مغربی ادب میں شخصیت نگاری پر کافی اعلیٰ پیمانہ کی تصانیف ملتی ہیں اور ان میں لٹن سٹریچی، پیرسیپل، اے۔ جی گارڈنر، برنا ساوا، آندرے موروا جیسے بین الاقوامی شہرت کے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس فن کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔

ہمارے ادب کے کامیاب شخصیت نگاروں میں سے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی بھی نقوش کے اس نمبر میں شخصیت نگار اور موضوعِ سخن دونوں حیثیتوں سے موجود ہیں۔ ویسے بڑے بڑے نامور لوگوں پر بڑے بڑے نامور اہلِ علم اور صاحبِ قلم لوگوں نے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ چند ایسے بھی شخصیت نگار ہیں جو ادب میں جانے پہچانے نہیں اور وہ اپنے "موضوعِ سخن" کے بانورشتہ دار ہیں مثلاً بیگم اخلاق حسین جنہوں نے اپنے بزرگ والد چودھری محمد علی ردولوی پر مضمون لکھا ہے یا اپنے موضوعِ سخن کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتے ہیں مثلاً ابوالخیر مودودی صاحب جنہوں نے نیاز فتح پوری جیسی دلچسپ اور متنازعہ قسم کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔

کل ۶۷ کے لگ بھگ شخصیتیں ہیں جو اس "شیش محل" میں ہیں یہ وہ جھلکیاں ان کے علاوہ ہیں جو شوکت تھانوی کے قابلِ قدر مضمون "لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں" شاہد احمد دہلوی کے مضمون "دلی کی چند ادبی شخصیتیں" اور پروفیسر عابد علی عابد کے مضمون "لاہور کی چند ادبی شخصیتیں" اور "دکن کی چند ادبی شخصیتیں" (از محترمہ قطب النساء ہاشمی) میں جلوہ گر ہیں۔ شخصیتوں کے اس شمارہ میں سرِفہرست مولانا محمد حسین آزاد ہیں اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، استاد داغ، امیر مینائی، رتن ناتھ سرشار، پنڈت چکبست، سرور جہاں آبادی، دیا نارائن نگم، نواب نصیر حسین خیال، رضا علی وحشت، اکبر الہ آبادی، عبدالرزاق صاحب "البرامکہ" اور ایسے کئی نامور لوگوں کو نہ جانے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہ تو بزرگوں کا حال تھا۔ اس صدی کے اوائل اور وسط کے بعض اہم لوگوں مثلاً خوشی محمد ناظر اور جسٹس شاہ دین ہمایوں کا بھی نام نظر نہیں آتا۔ معاصر ناموروں میں کئی لوگوں کے علاوہ ن۔م۔ راشد اور اپندر ناتھ اشک وغیرہ کا نام بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

ان شخصی مرقعوں میں غالباً سب سے کمزور وہ مرقعے ہیں جو پرانے دوستوں نے اپنے نامور ادیب دوستوں کی شخصیت کے کھینچے ہیں۔ ایک استثنا مسعود قریشی کا مطالعہ ہے ممتاز مفتی کے متعلق جو بڑا بھرپور، بے حد گہرا اور نہایت چابکدستی سے مفتی کے کردار کے بنیادی تضاد، ان کی جدت طرازی اور ساری خوبیوں اور ان کی کمزوریوں پر حاوی ہے۔ مگر اس بے تکلف شناسائی اور قدیم یگانگت کا نمایاں سب سے افسوسناک مظاہرہ محمد خالد صاحب کا مضمون "شفیق الرحمٰن" ہے جس میں شفیق الرحمٰن سے اپنی پہن کی دوستی کے تذکرے ہیں۔ ان کی فوجی زندگی کا ذکر ہے۔ ان کی ڈاکٹری اور کھیلوں سے شغف کی طرف اشارے ہیں اور ان باتوں کا تذکرہ ہے جو بارہا لوگوں نے محمد خالد کو کبھی شرارتاً بتائی ہوں گی جس کا تحریر میں لانے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان "سربستہ رازوں" کو فاش کر کے خالد صاحب خود اپنے نام کی تشہیر چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان باتوں سے شفیق الرحمان کی شخصیت کا کوئی اہم پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ (اگر یہ باتیں سچ مان لی جائیں) یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک کھلنڈرے اور البیلے نوجوان نے ہر نوجوان کی طرح کچھ "دل پھینک" ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ آخر میں خالد صاحب نے شفیق الرحمٰن کو اپنے فن اور موضوعِ فن کے بارے میں مشورے بھی دیئے ہیں اور کچھ امیدیں بھی ان کے مستقبل سے وابستہ کی ہیں۔ شخصیت نگاری سے اس کا جو واسطہ ہے وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر شخصیت نگاری یہی ہے تو پھر پندنامہ فریدالدین عطار اور حدیقۂ حکیم سنائی اور اخلاقِ جلالی بھی شخصیت نگاری کے شاہکار ہیں۔

لیکن اس شمارے میں شخصیت نگاری کے عمدہ نمونے بھی موجود ہیں اور ان کو پڑھ کر ان جلیل القدر ادبی اور علمی شخصیتوں کے خصائص و کردار اور ان کے ظاہر و باطن کی نہایت خوبصورت تصویر سامنے آ جاتی ہے جن کے ادبی اور علمی کارناموں تک ہی عام قارئین بلکہ اکثر بڑے بڑے لوگوں کی رسائی رہی ہے۔ اس کی مثالیں کچھ تو وہ نہایت مختصر جھلکیاں ہیں جو لاہور، لکھنؤ، دلی اور حیدرآباد دکن کی نامور شخصیتوں پر سید عابد علی عابد

شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی اور محترمہ قطب النساء ہاشمی نے بیان کی ہیں۔ ان میں سب سے خوبصورت اور کامیاب شوکت تھانوی کا مضمون "لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں" ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شیرانی پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون ایک گوشہ نشین مگر عہد آفریں شخصیت کی نہایت کامیاب عکاسی ہے۔ مرزا رسوا پر پروفیسر علی عباس حسینی کا مضمون، ڈاکٹر مولوی عبدالحق پر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ذاکر حسین پر ڈاکٹر سید عابد حسین کا مضمون اور شاہد احمد دہلوی کا لکھا ہوا خاکہ عظیم بیگ چغتائی، عنایت اللہ مرحوم کے تاثرات سر سید احمد کے متعلق بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر "نقوش" کا یہ نمبر اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر ہمارے ادب میں یہ پہلی کوشش ہے۔ اس میں ہمواری اور توازن کی جو کمی ہے اسے نقش ثانی میں بڑی حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔

مختار صدیقی

اختتامیہ

(۱) شخصیات نمبر اردو رسائل کی تاریخ میں جاودانی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) شخصیات نمبر بیش بہا مواد مگر بے راہ روی کی عمدہ مثال ہے۔

(۳) شخصیات نمبر کی قدر آنے والا دور کرے گا۔

(٤) شخصیات نمبر اُردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

(۵) شخصیات نمبر جانبداری کی بہترین مثال ہے۔

(٦) شخصیات نمبر کی قدر نہ کرنا پرلے درجہ کی سنگدلی ہے۔

(۷) نقوش ابو الرسائل ہے ———

وغیرہ وغیرہ!


بچّوں کو ہر روز گندگی کے
جراثیم سے بیماری کا خطرہ
رہتا ہے۔
لائف بوائے سے ان جراثیم کو
ان کے جسم سے دھو کر ہر روز
ان کی حفاظت کیجیے۔
لائف بوائے کا "محافظ
جھاگ" ان کی تندرستی کی
حفاظت کرتا ہے۔
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP

سرکنڈوں کے پیچھے

سعادت حسن منٹو

کی زندگی میں یہ آخری کتاب چھپی تھی

اس میں

کچھ افسانے غیر مطبوعہ اور کچھ مطبوعہ ہیں

یہ کتاب منٹو کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان دنوں
منٹو کا فن اپنی عظمت کی آخری سرحدوں تک پہنچ چکا تھا

آنچل	احمد ندیم قاسمی	-/۳	غزالہ	شوکت تھانوی	-/۶
تاملاتِ نیاز	نیاز فتحپوری	۲/۸	قاضی جی (دو حصے)	"	-/۷
رخسانہ	حبیب اشعر	-/۲	سسرال	"	۲/۴
جانِ عالم	شرر لکھنوی	۲/۴	جوڑ توڑ	"	-/۴
عزیزہ کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸	سودیشی ریل	"	-/۳
قول و قرار	عدم	۲/۸	مضامین شوکت		-/۳
اصحاب کہف	نیاز فتحپوری	۱/۱۲	سانچ کو آنچ		۳/۸

منٹو کے خطوط یہ خطوط وہ ہیں۔ جو منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے۔
ان خطوط سے منٹو کی پوری زندگی مرتب کی جا سکتی ہے

ادارۂ فروغِ اردو ۔ لاہور

... مطبعہ و ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔